شمارہ (۸)
تحریکِ ادب
اردو دنیا کے دو انمول رتن
مدیر
جاوید انور

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

Maulana Azad National Urdu University

(A Central University established by an Act of Parliament in 1998)

(Accredited with Grade 'A' by NAAC)

Gachibowli, Hyderabad - 500 032, EPABX : 040-23008402-04 Fax 040-23008311

Toll Free No. 1800-425-2958 (For Students of Distance Education only)

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

Admission Notification (2010-11) اعلان برائے داخلہ ۲۰۱۱-۲۰۱۰

تعلیمی سال ۲۰۱۱-۲۰۱۰ کے لیے درج ذیل فاصلاتی طریقہ تعلیم کے کورسیز میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں:

سرٹی فیکیٹ کورس (چھ ماہی)	ڈپلوما کورس (ایک سالہ)	انڈر گریجویٹ کورس (تین سالہ)	پوسٹ گریجویٹ کورس (دو سالہ)
1. اہلیت اردو بذریعہ انگریزی PIU/English	1. ٹیچ انگلش Teach English	1. بی۔اے۔ B.A.	1. ایم۔اے۔اردو M.A. (Urdu)
2. اہلیت اردو بذریعہ ہندی PIU/Hindi	2. جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشن DJMC	2. بی۔کام B.Com	2. ایم۔اے۔تاریخ M.A. (History)
3. فنکشنل انگلش Functional English	3. پی۔جی۔ڈپلوما ان میوزیالوجی	3. بی۔ایس سی (بی زیڈ سی، ایم پی سی) B.Sc (B.Z.C. & M.P.C.)	3. ایم۔اے۔انگلش M.A. (English)
4. غذا اور تغذیہ CF&N	4. پی۔جی۔ڈپلوما ان ٹورازم مینجمنٹ	4. بی۔ایڈ B. Ed (2 years) (دو سالہ، برائے برسر خدمت اساتذہ) (for in-service teachers)	

پراسپکٹس مع درخواست فارم نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد اور ریجنل سنٹرس دہلی، پٹنہ، بھوپال، بنگلور، دربھنگہ، کولکتہ، ممبئی، سری نگر اور رانچی، سب ریجنل سنٹر حیدرآباد، جموں، لکھنؤ، نوح، سنبھل، امراوتی اور یونیورسٹی کے تمام اسٹڈی سنٹروں پر دستیاب رہیں گے۔ یہ فارمس یونیورسٹی ویب سائٹ (www.manuu.ac.in) سے بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ایسے امیدوار جو انٹرمیڈیٹ (10+2) یا اس کے مماثل قابلیت نہیں رکھتے انہیں اہلیتی امتحان لکھنا ہوگا۔

اہلیتی امتحان میں شرکت کے لیے فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ	11-10-2010
اہلیتی امتحان کا انعقاد	26-12-2010
یو۔جی۔پی۔جی۔ڈپلوما اور سرٹی فیکیٹ کورس میں راست داخلے کے لیے فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ	31-12-2010
اہلیتی امتحان میں کامیاب ہونے والے طالب علموں کے لیے داخلہ فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ	31-01-2011

پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر -/200 روپے یا بذریعہ ڈاک -/250 روپے کے بینک ڈرافٹ کے عوض حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اہلیتی امتحان کی فیس کے لیے -/200 روپے کا علاحدہ بینک ڈرافٹ بنانا ہوگا۔ بینک ڈرافٹ کسی بھی قومیائے ہوئے بینک سے بنوائیں۔ آندھرا پردیش کے طالب علم بینک ڈرافت Maulana Azad National Urdu University Hyderabad کے نام بنوائیں۔ اسی طرح دوری ریاستوں کے طالب علم اپنے بینک ڈرافٹ متعلقہ ریجنل سنٹر کے نام سے بنوائیں۔ بینک ڈرافٹ بنانے کی تفصیلات پراسپکٹس سے حاصل کر سکتے ہیں۔ بی۔ایڈ (B.Ed) انٹرنس ٹسٹ کے لیے فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ ۱۰ ستمبر ۲۰۱۰ء ہے۔ بی۔ایڈ انٹرنس ٹسٹ ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو مقرر ہے۔ بی۔ایڈ پروگرام کے لیے پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر -/500 روپے یا بذریعہ ڈاک -/550 روپے کے بینک ڈرافٹ کے عوض حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ بینک ڈرافٹ Maulana Azad National Urdu University Hyderabad کے نام کسی بھی قومیائے ہوئے بینک سے بنوائیں۔ نقد رقم کسی بھی صورت میں قبول نہیں کی جائے گی۔

رجسٹرار انچارج

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ اکبر

کتابی سلسلہ (۸)

تحریک ادب

سرپرست

ولی عالم شاہین، میکش امروہوی

نگراں

یعقوب تصور

مجلس مشاورت

ابوطالب نقوی انیم، کبیر اجمل، خالد جمال

معاونین

سید رضا عباس رضوی "مجھن"، مقصود احمد تبسم، انور آفاقی

ڈاکٹر زبیر فاروق، منوررانا، امجد اقبال امجد، محسن اختر محسن

عبدالحمید آل امیری امیر، بی.ایس.جین جوہر، خواجہ جاوید اختر

ونے کپور غافل، نعیم اختر جرأت، ڈاکٹر بختیار نواز، نازاں جمشید پوری

قانونی مشیر

ایم.اے.قدیر

(سینئر وکیل ہائی کورٹ، الہ آباد)

مدیر

جاوید انور

رفقائے تحریک ادب

مظفر ایرج (ہندوستان)
دیپک بدکی (ہندوستان)
سردار پنچھی (ہندوستان)
خورشید اکبر (ہندوستان)
محمد اقبال بنارسی (بابو بھائی) (ہندوستان)
غفران امجد (ہندوستان)
خواجہ جاوید اختر (ہندوستان)
قائد حسین کوثر (ہندوستان)
خورشید اکرم سوز (ہندوستان)
شفیق سلیمی (پاکستان)
طاہر نقوی (پاکستان)
طارق بٹ (پاکستان)
سوہن راہی (یو.کے.)
فہیم اختر (یو.کے.)
امجد مرزا امجد (یو.کے.)
پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی (امریکا)

رضاء الجبار (امریکا)
حسن چشتی (امریکا)
منموہن عالم (امریکا)
حامد امروہوی (امریکا)
ذرہ حیدر آبادی (امریکا)
معین کرمانی (کینیڈا)
ڈاکٹر بلند اقبال (کینیڈا)
اسحاق ساجد (جرمنی)
سرور ظہیر (جرمنی)
عاکف غنی (فرانس)
فیصل نواز چودھری (ناروے)
افتخار راغب (قطر)
صبیحہ صبا (متحدہ عرب امارات)
افروز عالم (کویت)
صادق کرمانی (سعودی عرب)
مہتاب قدر (سعودی عرب)

سال اشاعت: ۲۰۱۰ء
سلسلہ نمبر : ۸
سرنامہ خطاط : انور جمال
سرورق وکمپوزنگ: عظمیٰ اسکرین، وارانسی +91 0542 2451300 uzmascreen_vns@yahoo.com
اس شمارے کی قیمت: پچاس روپے
زرسالانہ : دوسو روپے
تاعمر خریداری: دس ہزار روپے

چیک یا ڈرافٹ
Jawed Ahmad
S/B A/c. 568 Indian Overseas Bank Branch Manduadeeh Bazar,
Varanasi-221103
کے نام ارسال کریں۔

انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زرِ رفاقت اس نمبر پر اور پتے پر ارسال کریں۔
Indian Overseas Bank, Glenhill School Ext. Counter, Manduadeeh Bazar,
Varanasi-221103 (U.P.) India
Jawed Ahmad IFSC IOBA 0001968 A/c 19680100000568
Indian Overseas Bank, Glenhill School Ext. Counter, Manduadeeh Bazar,
Varanasi-221103 (U.P.) India

ازراہِ کرم زرِ رفاقت کرنسی کی صورت میں لفافے میں رکھ کر ہرگز ہرگز ارسال نہ فرمائیں، پیسے راستے میں ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ تخلیق کے ساتھ اپنا فون نمبر یا ای-میل اور اگر ممکن ہو تو دونوں ہی درج کرنے کی زحمت فرمائیں۔ عنایت ہوگی۔

مراسلت کا پتہ
Jawed Anwar
Urdu Ashiana
167, Afaq Khan ka Ahata, Manduadeeh Bazar
Varanasi-221103 (U.P.) India
Mobile: 0091-993-595-7330 e-mail: jaweanwar@gmail.com

جاوید انور مدیر تحریکِ ادب نے مہاویر پریس، وارانسی سے چھپوا کر اردو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے شائع کیا۔

غیر ممالک میں تحریک ادب

ممالک	فی شمارہ	چار شمارے
کویت	۲.۵/دینار	۱۰/دینار
متحدہ عرب امارات	۲۵/درہم	۱۰۰/درہم
سعودی عرب	۲۵/ریال	۱۰۰/ریال
قطر	۲۵/ریال	۱۰۰/ریال
امریکا	۱۰/ڈالر	۴۰/ڈالر
کینیڈا	۱۳/ڈالر	۵۰/ڈالر
انگلینڈ	۶.۵/پونڈ	۲۵/پونڈ
پاکستان	۳۵۰/روپے	۱۴۰۰/روپے
ناروے	۱۰/امریکی ڈالر	۴۰/امریکی ڈالر
فرانس	۱۰/امریکی ڈالر	۴۰/امریکی ڈالر
آسٹریلیا	۱۰/امریکی ڈالر	۴۰/امریکی ڈالر
دیگر ممالک	۱۰/امریکی ڈالر یا اس کے برابر رقم	۴۰/امریکی ڈالر یا اس کے برابر رقم

نوٹ: بیرونی ممالک کے خریدار زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ یا چیک سے بھیجتے وقت بینک کمیشن کی مناسب شرح بھی زرِ سالانہ میں شامل کرلیں۔

ترتیب

مہاجروں یہی تاریخ ہے مکانوں کی
بنانے والا ہمیشہ برامدے میں رہا

ترقی کے لیے ہم نے رہائش گاہ بدلی تھی
مگر آتے ہوئے ہجرت کا شوشہ چھوڑ آئے ہیں

ہمیں مرنے سے پہلے سب کو یہ تاکید کرنی ہے
کسی کو مت بتا دینا کہ کیا کیا چھوڑ آئے ہیں

نہ کچھ کھانے کو جی چاہے نہ کچھ پینے کو جی چاہے
ہم اپنے ہم پیالہ ہم نوالہ چھوڑ آئے ہیں

(منور رانا)

ڈاکٹر صابر مرزا
سری نگر

حمد

حسیں منظر یہ دلکش سی ادائیں کون دیتا ہے
سر آفاق یہ رنگیں فضائیں کون دیتا ہے
یہ دھوپوں کی تپش، صحرا پہ گرمی کون لکھتا ہے
جلا کر جسم یہ ٹھنڈی ہوائیں کون دیتا ہے
پڑھاتا کون ہے الفاظ و معنی سب عبارت کے
اندھیروں میں بصارت بھر نگاہیں کون دیتا ہے
یہ مخلص کون ہے اخلاص بھر ہے کس کا یارانہ؟
محبت، دوستی، چاہت وفائیں کون دیتا ہے
بتا ہے کون جو تجدید کرتا ہے زمیں تیری!!
تیرے پیڑوں کو ہر موسم قبائیں کون دیتا ہے
لگاتا کون ہے ہر دل کی پھر گونجوں کے اندازے
خموشی کو ہر اک دل کی صدائیں کون دیتا ہے
ہے ایسا کون جو سیراب کرتا ہے زمیں ساری
فلک پہ جھولتی کالی گھٹائیں کون دیتا ہے
سناتا ہے وہ لوری کون جھولوں میں ہنڈولوں میں
ارے آدم! تیرے بچوں کو مائیں کون دیتا ہے
ڈبو کر لشکر فرعون، کلیم اللہ کی امت کو!!
سمندر میں زمیں جیسی یہ راہیں کون دیتا ہے
میں لکھتا ہوں تو پھر مرا قلم رکتا نہیں بالکل
مجھے معلوم ہے اے ماں! دعائیں کون دیتا ہے
اگاتا ہے بھلا پھر کون روشن تر کئی سورج
شب ظلمت میں اے صابر شعائیں کون دیتا ہے

حامد امروہوی
امریکا

پھر جانب طیبہ مرا ہوگا نہ سفر کیا
کچھ کام نہ آئے گا مرا دیدہ تر کیا
وہ شافع محشر ہیں تو پھر حشر کا ڈر کیا
سرکار ﷺ نہ رکھیں گے غلاموں پہ نظر کیا
آ جائیے بیمار کی در پہ ہیں نگاہیں
ہے شام سے یہ حال تو دیکھے گا سحر کیا
چلتے نہیں بازار میں سکے کبھی کھوٹے
اعمال ہیں دامن میں ہمارے بھی مگر کیا
اے طالب دیدار ذرا یہ تو بتا دے
جب سامنے وہ آئیں گے اٹھے گی نظر کیا
راضی رہو راضی رہو ہر حال میں راضی
آداب محبت میں اگر اور مگر کیا
چہرے پہ طمانت ہے تو ہونٹوں پہ تبسم
جاتے ہوئے دنیا سے مجھے خوف و خطر کیا
جن ذروں کو نسبت ہے در پاک سے یارو
ان ذروں سے بہتر ہیں بھلا لعل و گوہر کیا
توصیف کریں یا نہ کریں آپ نبی ﷺ کی
پر سوچ لیں انجام ادھر کیا ہے ادھر کیا
کس منہ سے بھلا جائے گا حامد تو مدینے
اعمال کی تیرے نہیں آقا ﷺ کو خبر کیا

مقصود احمد تبسم

دبئی

گنبد خضریٰ

بسے ہیں جب سے ان آنکھوں میں جلوے سبز گنبد کے
تصور میں لیے ہر روز بوسے سبز گنبد کے

رُخِ میزاب رحمت وائے طیبہ کی جانب ہے
چلو کعبے سے پوچھیں کیا ہیں رتبے سبز گنبد کے

جو پودے عشق احمد ﷺ کے لگائے ہم نے سینوں میں
مرے مولا رہیں سر سبز صدقے سبز گنبد کے

طواف کعبۂ عشاق سے روکا اگر مجھ کو
میرے اندر کا پنچھی لے گا پھیرے سبز گنبد کے

تم اپنے گلشن ایمان کو سر سبز پاؤ گے
تخیل میں سجا لو سبز جلوے سبز گنبد کے

وہ خود بے مثل ہیں بے مثل ہی مجھ کو نوازا ہے
دئے خیرات میں روغن کے ٹکڑے سبز گنبد کے

مکین گنبد خضریٰ سے اس کو فیض ملتا ہے
عقیدت سے جو لکھتا ہے قصیدے سبز گنبد کے

مدینے کی حسیں یادیں بتیں یادوں کا سرمایہ
ہیں اب پیش نظر دن رات جلوے سبز گنبد کے

جدھر دیکھا جمال گنبد خضریٰ نظر آیا
مرے حسن نظر میں رنگ ابھرے سبز گنبد کے

شعاعوں کا سنہری باب گنبد کے کلس میں ہے
میری بھی لوح دل چمکا دے صدقے سبز گنبد کے

اسی گنبد کے نیچے میرے آقا ﷺ جلوہ فرما ہیں
خدا ہی جانتا ہے جو ہیں رتبے سبز گنبد کے

گناہوں کی سیاہی آنکھ سے ڈھلنے لگی اس دم
نکھرتے میں نے جب انوار دیکھے سبز گنبد کے

مدینے کے نظارے لوٹتا ہوں بیٹھ کر گھر میں
ملے جب سے مجھے روغن کے ٹکڑے سبز گنبد کے

کسی کی پیاس بجھتی تھی کسی کی اور بڑھتی تھی
بقدر ظرف جلوے بٹ رہے تھے سبز گنبد کے

جھپکتے تھے نہ پل بھر کے لیے بھی اپنی آنکھوں کو
کچھ ایسے بھی عقیدت مند دیکھے سبز گنبد کے

انھیں مت چھیڑنا یارو بس ان کا دیکھنا دیکھو
بلائیں لو ان آنکھوں کی جو صدقے سبز گنبد کے

نہ کرنا پشت روضے کی طرف پاس ادب رکھو
چلو پہلو بجہت دیدار کرتے سبز گنبد کے

شفیع روز محشر ﷺ کا یہیں دفتر یہیں گھر ہے
متاع دنیا و عقبیٰ ہے نیچے سبز گنبد کے

ملے اذن حضوری میرے جبریل تخیل کو
ذرا در کھولیے سرکار ﷺ اپنے سبز گنبد کے

مکین قبۂ خضریٰ مجھے مقصود مل جائے
مری ہستی پہ گر ہو جائیں سائے سبز گنبد کے

ابوالبیان حماد

نعت پاک

سلام آتا ہے ان کا مجھے پیام کے بعد
مرا پیام پہنچتا ہے جب سلام کے بعد
طلوع صبح سے پہلے، خیال رخ آیا
ہوا تصور گیسو غروب شام کے بعد
وہ سجدہ گاہ ملائک، وہ جلوہ گاہ جلال
وہ مسجد نبوی ﷺ، مسجد حرام کے بعد
صبا! کبھی جو مدینے سے ہو گزر تیرا
سنا پیام عقیدت انہیں سلام کے بعد
جو آئی ان کی شریعت تو سب رواج مٹے
نہیں ضرورت انجم، مہ تمام کے بعد
خدا گواہ نہیں موجب سعادت و امن
کوئی نظام بھی اسلام کے نظام کے بعد
مقام مرد مسلماں، ہے جنت الفردوس
کوئی مقام نہیں اور اس مقام کے بعد
مجھے بلائیں گے دربار خاص میں بھی ضرور
بروز حشر وہ فیضان لطف عام کے بعد
حضور! آپ ﷺ کا پیغام ہر جگہ پہنچا
عراق و فارس و مصر و حجاز و شام کے بعد
ان ہی کا نام ہے جو بے اختیار آتا ہے
خدا کے نام سے پہلے، خدا کے نام کے بعد
فدا نہ کیوں ہو محمد ﷺ کے نام پر حماد
ان ہی کا نام ہے پیارا، خدا کے نام کے بعد

ثمر مانجوی جمشید پوری
جمشید پور

نعت

عشق ایمان کا منکر نہیں ہونے دے گا
دل مسلم کو وہ کافر نہیں ہونے دے گا
مرا دعویٰ ہے محبت سے جو پڑھتا ہے درود
اس کو رسوا کبھی قادر نہیں ہونے دے گا
اپنے ایمان کی طاقت پہ بھروسہ ہے مجھے
در بدر طیب و طاہر نہیں ہونے دے گا
دامن شافع محشر ہے مرے ہاتھوں میں
مجھ کو دوزخ میں وہ حاضر نہیں ہونے دے گا
خواب دیکھا ہے دکھائے گا وہ شہر طیبہ
مجھ کو دیدار سے قاصر نہیں ہونے دے گا
جذبۂ حسرت دیدار مدینہ ہے اگر
وہ کبھی دید سے قاصر نہیں ہونے دے گا
ہاشمی خون رواں جس کی رگوں میں ہے ثمر
بھوکا مرجائے گا ظاہر نہیں ہونے دے گا

عدل

محمد شاہد صدیقی شاہد (کناڈا)

عدل کے قائم ہونے سے تو قوموں کو جلا ملتی ہے، معاشرہ امن کا گہوارہ بنتا ہے اور ظلم و زیادتی سے معاشرے میں فساد اور تباہی پیدا ہوتی ہے اس لیے خالق کائنات نے اپنے نظام کو قائم رکھنے کے لیے انسان کو ہر موقع پر عدل کا حکم دیا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

ترجمہ: ''بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قریبی رشتے داروں کو دینے کا اور منع کرتا ہے بے حیائی اور گناہوں کی باتوں سے تمہیں وعظ کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔''

بے شک، اللہ تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ تم امانت والوں کو ان کی امانتیں ادا کرو، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو، اللہ تمہیں کیسی اچھی نصیحت فرماتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا ہو یکھنے والا ہے۔

(سورۃ النساء آیت نمبر ۵۸)

غیر مسلم سے حسن سلوک

اسلامی تاریخ کے سنہرے اور مثالی دور میں دیکھا کہ ایک ضعیف العمر غیر مسلم شہری جھولی پھیلائے بھیک مانگ رہا ہے۔ مسلم ریاست کے حکمراں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس شخص کے قریب سے گزرتے تو افسوس اور دکھ کا اظہار کیا اور اس سے کہا ''ہم نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، جب تم جوان تھے اور روزی کماتے تھے تو تم سے ٹیکس وصول کرتے تھے اور اب جب تم کمانے کے لائق نہیں رہے، تو تمہیں تمہاری حالت پر چھوڑ دیا، ایسا نہیں ہو سکتا، اس کے بعد آپ نے بیت المال سے اس غیر مسلم شخص کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ اسلامی تاریخ کے سنہری دور کی یہ تاریخی دستاویز مسلم معاشرے میں غیر مسلم باشندوں سے حسن سلوک اور ان کے حقوق کی ایک روشن مثال ہے۔

ایزل پر رکھی شبد نظمیں

پروفیسر گوپی چند نارنگ (نئی دہلی)

شاعری ایک بت ہزار شیوہ ہے۔ جس طرح حسن والوں کی کئی ادائیں ہیں اور ہر ادا امن دل کو کھینچتی ہے کہ جا ایں جا است، اسی طرح شاعری بھی بھیدوں سے بھرا بستہ ہے۔ تنقید ہر چند کہ شاعری کو اجالتی ہے اور سخن فہمی کا مطلب ہی ایسی قرأت ہے جو تخلیق کے عمل میں شریک ہو کر اس کی توسیع کر سکے، پھر بھی سارے رازوں کو کھولنا، بھلے ہی تنقید اس کی دعویدار ہو، کسی بھی نوع کی تنقید کے بس کا نہیں۔ جو نقاد البتہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اپنے مٹی کے پیروں کی طرف نہیں دیکھتے۔ شاعری اگر سنتے یا پڑھتے ہوئے دل پر اثر کرتی ہے، نقش چھوڑتی ہے، کسی تجربے کی بازگشت کرتی ہے، یا باطن میں کوئی لہر پیدا کر کے کسی یاد کو جگاتی ہے یا کشف کا کوئی دریچہ کھولتی ہے، تو گویا وہ جمالیاتی حسن کی کسی نہ کسی ادا سے کام لیتی ہے جسے تنقید کی زبان میں جمالیاتی عوامل یا وسائل کا نام دیں گے۔ وسائل فی نفسہ ہیئتی وسائل ہیں لیکن وہ جمالیاتی کرشمہ بنتے ہیں معنی آفرینی یا اثر آفرینی کی چنگاری سے مل کر۔ بات کرنے کو یہ میکانکی سا معلوم ہوتا ہے لیکن تخلیقی عمل ایک Integrated کل ہے جس میں تار سے پود اور تانے سے پیٹا جدا نہیں ہوتا بلکہ متن پر اسرار طور پر ایک وحدانی تجربے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

ہر شاعر کے وسائل اس کے اپنے وسائل ہوتے ہیں یعنی جملہ جمالیاتی وسائل میں سے وہ کچھ ہی پر قادر ہوتا ہے جو اس کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں۔ بڑے شاعر بڑے وسائل سے کام لیتے ہیں جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں لیکن اگر کسی کی آواز یا لہجہ اس کے اپنے وسائل سے خواہ وہ محدود ہوں، پہچانا جا سکتا ہے، وہ معنی قائم کرتا ہے اور دل پر نقش اور رنگ جو فی نفسہ حد درجہ مبہم اور کشادہ ہیں اور ہر دیکھنے والا اپنا تاثر اخذ کرنے میں، اور اپنی تعبیر میں آزاد ہے۔ شاعری میں بھی زبان گو ابہام سے خالی نہیں کیونکہ معنی قائم ہی تفریقیت سے ہوتے ہیں یعنی معنی جتنے حاضر ہیں اتنے غیاب میں بھی ہیں، تاہم زبان کی پہلی سطح لغوی اور روایتی ہے جہاں رواجاً معنی قائم ہیں، اس لیے بمقابلہ آرٹ اور مصوری زبان میں تعبیر کا عمل مختلف بھی ہے اور ملفوظی و ثقافتی پیراڈیم کے اندر بھی۔ لیکن جس شاعری میں امیج سازی کو بطور ایک حاوی وسیلے کے برتا گیا ہو وہ شاعری آرٹ کا بدل قرار پائے گی اور ایسا آرٹ شاعری کا بدل قرار پائے گا، یعنی نظم تصویر بناتی ہے اور تصویر میں شاعری کا عمل نظر آتا ہے۔ جینت پرمار کی تخصیص یہ ہے کہ وہ اردو کے ایسے اکلوتے شاعر ہیں جن کے شعری عمل میں آرٹ کا تخلیقی عمل رواں دواں ہے۔ دوسرے بھی ہوں گے لیکن کم از کم کسی کا تخلیقی عمل اتنا باہم دگر مربوط اور پر تاثیر نہیں۔ آیئے ان کی نظم 'نظم کہاں رکھی ہے میں نے' پر نظر ڈالیں، دیکھیں کہ وہ نظم میں کیا کھوجتے ہیں:

میز کے خانوں میں

ٹیبل پر
ریک پہ، الماری میں
اور بک شیلف پہ
کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔
نئی پرانی کتابوں کے
اوراق جنوں میں
کھدر کے کرتے کی
پھٹی پھٹی جیبوں میں
اونٹ کے چمڑے کے بستہ میں
نظم کہاں رکھی ہے میں نے؟

پوچھتا ہوں پھر:
نرو دا سے، ایکی جائی سے، رلکے سے
ابھی ابھی تو رکھی تھی
نظم کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہی مل جاتے ہیں
قلم، دوات اور کورے کاغذ
لیکن نظم
بیاضِ دل سے غائب ہے!

(نظم کہاں رکھی ہے میں نے)

اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم کہنے کے لیے شاعر کا طریقۂ واردات کیا ہے۔ نظم بنانے یا ڈھونڈنے سے نہیں بنتی جب تک باطن کا لاشعوری جھرنا بہہ نہ رہا ہو۔ نظم دوسرے شاعروں کے اثرات سے بھی نہیں بنتی۔ یہ پرانی کتابوں، بستے میں رکھے کاغذوں، میز کے خانوں سے بھی نہیں بنتی۔ ابھی رکھی تھی ابھی غائب ہے۔ گویا لمحۂ تخلیق بالارادہ نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ عمل عمداً وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ ذیل کی نظم سے بات اور صاف ہو جائے گی۔

ابھی ابھی تھے
اس کے ستن
نیلی برا کے ریشمی کینوس پر روشن
نابھی کی تاریک گلی میں
سبز گھاس پر
چڑھتی خواہش کی چیونٹی

جنوں کے نقش پا

پستاں تک جاتے ہوئے

پھسل پڑے گہری کھائی میں!

ہونٹوں کے صوفے پر بیٹھی

ہوس تتلیاں

چاند سے لپٹی لہو کی موجیں

پیلا سورج سکھا رہا تھا

ناریل کے اونچے پیڑوں پر

گیلے کپڑے

برگ مژگاں سے اترا

اک سرخ ستارا

غرق ہوا پھر

اندھکار کے پانی میں

چوم رہی تھی گرم پنڈلیاں

ریت پہ لیٹی ننگی شام

رانوں کی رنگین مچھلیاں

فرار ہونے کو بے تاب!

اڑے اڑے سے میرے خواب!!

(سرریل خواب)

آرٹ میں تخلیقی عمل کے لاشعوری رشتے آسانی سے Surrel لاشعوری جزوں سے مل جاتے ہیں۔ نظم امیج در امیج بڑھتی ہے اور پیکر سازی کے متحرک اور روشن عمل سے پھر خود ایک تصویر بن جاتی ہے۔ تصویر میں لاشعوری جنسی خواب کی نقش گری ہے۔ عورت کے ستن، نیلی برا کا ریشمی کینوس، نابھی کی تاریک گلی، سبز گھاس پر چڑھتی خواہش کی چیونٹی، ہر مصرع ایک امیج ہے جو ذہن پر نقش ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ جنون کے نقش پا پھسل پڑے گہری کھائی میں/اور پھر/چاند سے لپٹی لہو کی بوندیں/یا/پیلا سورج سکھا رہا ہے/ناریل کے اونچے پیڑوں پر/گیلے کپڑے/...../چوم رہی تھیں گرم پنڈلیاں/ریت پر لیٹی ننگی شام۔ سرریل خواب کی کیفیت جینت پرمار کی خصوصیت ہے جہاں لفظ پڑھتے پڑھتے معدوم ہو جاتے ہیں اور ایک روشن تصویر رنگوں کی اثر پذیری کے ساتھ ذہن کے پردے پر جھلملانے لگتی ہے۔

ذیل کی نظم 'تیرا نام' دیکھئے۔ موضوع غیر مرئی ہے لیکن امیج سازی کی اثر پذیری سے ایسا لگتا ہے کہ پھول کی پتی پتی نظر میں ہے اور نام خوشبو بن کر ہمارے سامنے چاروں اور پھیل رہا ہے۔

پھول کی پتی پتی پر

اپنی انگلیوں سے
لکھتا ہوں میں تیرا نام!
پھول تو جھڑ جاتا ہے
لیکن تیرا نام
خوشبو بن کر
پھیل رہا ہے چاروں اور!

(تیرا نام)

اس مجموعے میں پنسل سیریز کی تین نظمیں ہیں۔ تینوں الگ الگ ہیں۔ پنسل نقش بناتی ہے جو آرٹ کے ہاتھ میں تخلیق کا سرچشمہ ہے جیسے شاعر کے ہاتھ میں شبد۔ شبد پنسل کی چھلی ہوئی نوک بن کر نقش بناتا ہوا کس طرح تصویر بنتا چلا جاتا ہے۔ اس نظم میں دیکھئے:

بنچ پہ بیٹھی
بلیو جینس والی لڑکی
پنسل چھلتی ہے
اور اس میں سے
پھوٹتا ہے اک کالا پھول
پنسل رکھتی ہے.....
کالے کالے اکھشر
کورے کاغذ پر
جیسے کالی تتلیاں!

پنسل لکھتی ہے.....
سفید اکھشر
آسمان کے کینوس پر
جیسے چاند ستارے!!

پنسل لکھتی ہے.....
پنکھ سنہری
کائنات کی بانہوں پر
جیسے لڑکی کے سپنے!!

(پنسل۔۱)

بلیو جینس والی لڑکی جو بنچ پر بیٹھی پنسل چھیلتی ہے اور اس میں پھوٹتا ہے کالا پھول۔ یہ کالا پھول کس چیز کا رمز ہے۔ جس میں ایک کے بعد ایک حرکی نقش ابھرتا ہے یعنی کورے کاغذ پر کالے اکھشر رجیسے کالی تتلیاں ریا آسمان کے کینوس پر سفید اکھشر رجیسے چاند ستارے راور آخر میں اس امیج سازی کی تکمیل کرتے ہوئے یہ اکھشر لکھتے ہیں کائنات کے بانہوں پر ربنگھ سنہری رجیسے لڑکی کے سپنے۔ یوں تصویر اندر تصویر کا سائیکل مکمل ہو جاتا ہے اور کالے پھول سے نکلی تصویریں اپنے روشن رنگوں کے ساتھ ذہن کے پردے پر چمکنے لگتی ہیں۔

ایسی بہت سی نظمیں ہیں جو صریحاً منظریہ ہیں۔ مثلاً 'دار جلنگ میں صبح'، 'Toy Train'، 'گینگٹاک جاتے ہوئے'، 'منی کرن' یا 'شام کی پینٹنگ (۱)'، 'شام کی پینٹنگ (۲)'۔ لیکن جینت پرمار کی شاعری فقط منظریہ نہیں۔ ان مختصر تصویری نظموں میں اچھا خاصا معنویاتی تنوع ہے۔ جنس لاشعور کی جڑوں میں ہے لیکن طرح طرح کے درد بھی جو سائیکی کے نہاں خانوں میں پڑے ہوئے ہیں، جینت کی شبد نظموں میں ابھرتے ہیں۔ ہر چند کہ شاعر تخلیقی 'خلا' کا ذکر کرتا ہے یعنی ایسے لمحے بھی آتے ہیں جن میں خود سے بھی ڈر لگتا ہے جیسے رتجگائی شب میں رآئینے میں اپنا سر راپنے ہی کاندھے پر رکھ کرر پہروں رو لیتا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں کہ جینت پرمار کی تصویری نظمیں باطن کی دنیا سے باہر جھانکتی نہ ہوں۔ ان میں انسانی اور سماجی رشتے بھی ہیں۔ خیرات تو گھر سے شروع ہونی چاہیے۔ جینت پرمار احمد آباد کے خونی مناظر سے گزرے ہیں۔ دیکھئے ایک آرٹسٹ کے یہاں خارجی واردات روحانی تجربہ کا حصہ بن کر کس طرح جمالیاتی کیفیت میں ڈھلتی ہے۔ نظم کا نام ہے 'شہر':

پل بھر پہلے
لہو کی اک ندی میں گرا تھا
ہتھیلیوں کے بل مشکل سے
ابھی ابھی اٹھا.....
ماتھے اور کنپٹیوں سے
اب بھی خون ٹپکتا ہے
ہاتھ لٹکتا ہے جھولی میں
ایک ٹانگ گولی سے زخمی
مشکل سے
بغل میں بیساکھی کے سہارے
اپنی کمر سیدھی کرتا ہے
اور کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے

(شہر)

ایک اور نظم 'مارچ دوئم' میں شاعر نے عنوان میں سنہ نہیں رکھا۔ ولی کی یادگار قبر کے مسمار کیے جانے پر آرٹسٹ کا دل کس طرح کالے لفظوں سے شہر کی چمکتی پیشانی پر کالا ٹیکا لگاتا ہے، دیکھئے:

مارچ دوئم

چمکتی جبیں پہ تری

کالا ٹیکا لگا

ولی تونے ہی

اس زمیں کے کسی ایک کونے میں

بویا تھا معصوم دل

بڑے فخر سے مجھ سے کہتا تھا وہ:

''میں گجراتی چھوں''

مگر تیرے ہی شہر نے

تری قبر کی ایک اک اینٹ

توڑ کر

پھینک دی

مرے شہر نے بھی

عقیدت کے پھولوں کو مرجھا دیا

مری جان جاں!

تو ہے لتھڑا ہوا خون میں!

میں ہوں لتھڑا ہوا خون میں!!

مارچ دوئم

چمکتی جبیں پہ تری

کالا ٹیکا لگا

(مارچ دوئم)

جبینت پرمار نے احمد آباد کے لیے کالی غزلیں بھی لکھی ہیں۔غزلوں کے اشعار کس درجہ تصویری ہیں، اور درد کی تقلیب کس طور ہوتی ہے یا آنسو کس طرح لفظ میں ڈھلتا ہے، ان شعروں میں دیکھئے:

ذرا ٹھہر اس کو کاندھا دے دوں	یہ لاش تو میرے شہر کی ہے
پھول سبز رشتوں کا	آگ میں سلگتا تھا
میں کے صدا دیتا	کون سننے والا تھا
سچ ہے میرے اندر کا	آدمی درندہ تھا
گھر جلا کے وہ خوش تھا	شہر میرا اپنا تھا

اب غزلوں کا ذکر آیا ہے تو بتا دیا جائے کہ شاعر نے نظموں کے بیچ میں جگہ جگہ غزلوں کے بھی چھوٹے

چھوٹے گلدستے سجائے ہیں۔ ان میں بھی کہیں اجلے کہیں دھندلے رنگوں، اشیا اور تصویروں کی وہی کیفیت ہے جو نظموں میں ملتی ہے۔ بس پیمانہ چھوٹا ہے لیکن تاثیر اتنی ہی تیکھی ہے۔ ان اشعار میں رنگوں کو بھی دل میں اترنے دینا چاہیے:

روکھا سوکھا پیلا پھول	ٹہنی اکا دکا پھول
گلیاں دفتر کمرا چوک	اندر باہر بکھرا پھول
دھوپ صدا روشن آنگن	کھڑکی کھڑکی اترا پھول
بدن بدن مٹی مٹی	کچی خوشبو جھوٹا پھول
رستہ تکتا دروازہ	شام سلگتا دل کا پھول
جگمگاتا ہے ایک اک ذرہ	دل ویراں سے کون گزرا تھا
ہفت رنگوں سے بھر دیا تم نے	دل کا کاغذ تو کتنا سادہ تھا
مرے اللہ تجھے نہ پہچانا	روشنی اوڑھ کے تو نکلا تھا
کبھی کسی پر وقت نہ ایسا آن پڑے مرے اللہ	ہرا بھرا موسم ہو پھر بھی شاخ گلاب سے خالی
اک دن ایسا بھی آئے گا ہم کو ہے معلوم	آنکھیں بے حس ہو جائیں گی ہاتھ کتاب سے خالی

اکثر اشعار حرکیاتی مرقع ہیں اور کیفیت سے آباد ذہن کے پردے پر تصویر چھوڑ جاتے ہیں۔ حروف یا رشتے سبز، نیلے، پیلے، بھورے، سفید، کالے تو ہیں ہی، مہتاب، کتاب، پھول، سراب، گلاب، نیند کے دریا، خوابوں کے جزیرے تو امیج در امیج تانکتے ہیں یا کہیں کہیں زبان کا کچا پن استعمال عام سے ہٹا ہوا یا ہلکے سے کسی اجنبی لفظ کا تصرف وتبدل، غزل کے عام ذائقے کو بدل دیتا ہے، دیکھیے یہاں جمع کے صیغے اور ردیف کو پرانی اردو کا ٹچ دینے سے ایک انوکھی کیفیت کا تجربہ ہوتا ہے:

کون آیا مرے خواباں وچ	مہکے پھول سراباں وچ
اور اندھیرے میں چمکے	سبز حروف کتاباں وچ
بہہ گئے نیند کے دریا میں	کیا تھے جزیرے خواباں وچ
کھڑکی کھول کے دیکھ ذرا	سویا چاند گلاباں وچ

ایک اور پہلو یہ کہ اس مجموعے میں شخصی نظموں کا وفور ہے۔ ایسا نرودا، پاز اور کئی دوسرے شعرا کے یہاں بھی ہے۔ بنگالی، ہندی، گجراتی میں تو یہ اور بھی عام ہے۔ یوں تو جینت نے کئی نظموں کو اپنے ہمعصروں کے نام سے بھی موسوم کیا ہے مگر یہ اتنا اہم نہیں جتنا وہ نظمیں، جو بعض یگانہ روزگار ہستیوں کے نام سے لکھی ہیں۔ ان میں وان گاگ (سورج مکھی، دکھ کی کالی چڑیا، مکی کا کھیت اور کوے)، رام کمار کی تصویریں، پہلی اداس کی نظم (امرتا شیر گل)، گوگین، سوامی ناتھن، ڈالی سلوے ڈور، ماریا تسویتائیوا (روسی شاعرہ)، آئی چن، اوکتاویو پاز، میراجی، استاد فیاض خاں خاص ہیں۔ پاز مدتوں ہندوستان میں میکسکو کا سفیر رہا، اس کے تخلیقی ذہن پر ہندوستان کے فکر وفلسفے کا گہرا اثر تھا، کئی نظموں میں پاز نے اس کا اعتراف کیا ہے اور متعدد نظمیں ہندوستان کے مقامات پر اور شخصیات پر لکھی ہیں۔ جینت کا یہ خراج

عقیدت ملاحظہ ہو:

میں نے پاز کو دیکھا ہے
امیر خسرو کے مقبرے پر
شام کے پہلے سائے میں
سر اور شبد کے گنبد نیچے
نظام الدین اولیا فقیر
امیر خسرو کے درمیاں
نظم کی محرابوں کے نیچے سویا ہوا
میں نے پاز کو دیکھا ہے!

(میں نے پاز کو دیکھا ہے)

میراجی کی یہ تصویر بھی دیکھتے بنتی ہے:

سر پہ پگڑی
کان میں کنڈل
گلے میں مالا
اور تعویذ
گھومتا ہے چھوں ولیش
شبد نگر میں
دروازے پر
دستک دیتا
اک درویش

(میراجی کی تصویر)

پینٹنگ اور شاعری تو برحق ہے لیکن جینت کی سائیکی کی گیلی مٹی سی سنگیت کی شبد نظمیں بھی پھوٹی ہیں، فیاض خاں کے مزار پر کٹے پھٹے ادھ جلے سروں کا یہ منظر بھی دیکھئے کہ پڑھتے ہوئے ذہن پر کیا کچھ رقم کرتا ہے:

فیاض خاں کا
سنگ مرمر کا کتبہ
ٹوٹے مزار کے ڈھیر پہ جھک کر
ڈھونڈ رہا ہے
سارے گا ما پا دھانی....
سجدہ گزار عیر وگل کو

مالکونس کی بھیگی لے کو
کھرج میں رقصاں رنگوں کو
دودِ سیاہ میں شعلوں کو
مدھم سُر کی باراتوں کو
اجڑی قبر کی مٹی میں!
لیکن قبر میں
سوائے دکھ کے،
کٹے پھٹے ادھ جلے سروں کے
ہاتھ نہیں آیا کچھ بھی!

(فیاض خاں کا مزار)

اب تک کی گفتگو سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر چند اس شاعری کا thrust تصویری اور امیج سازی کا ہے جہاں بلیوں جینس والی لڑکی کی نابھی سے پھوٹتا ہے کالا پھول یا سیاہی کی کوکھ سے اگتے ہیں شبد یا قلم سنتور کی دھن بن کر کھیلتا ہے ہولی بدن کے رنگوں سے یا بچے کی نازک انگلیاں بدن پر لکھتی ہیں رنگین خواب، یا پیپل باندھتا ہے اپنے پاؤں میں گھنگھرو یا مور پنکھ سے کھینچتا ہے آسمان کے کینوس پر چاند کا ٹیکا اور سورج کا جھڑتا ہے تپ یا سیاہی لیتی ہے شبدوں کی نابھی میں سانس، پر اتنی بات صاف ہے کہ یہ شاعری لاکھ حسی نقش گری کی شاعری سہی جو ذہن کے پردے پر رنگ کے چھینٹے دیتی تصویریں بناتی ہے، لیکن فقط اتنا ہی نہیں، ان نظموں میں سماجی استحصال کی وہ پیڑا بھی ہے جسے عرف عام میں 'دلت' کہا جاتا ہے لیکن جینت پرمار کی یہ نظمیں اپنی آرٹ خوبیوں کی وجہ سے ایسی عام شاعری سے یکسر الگ ہیں۔

یہاں یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ نقاد کا کام شاعری کا پہلا اور دوسرا سبق لکھنا نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے بہت سے معاصرین نے باوجود فیض کے جوش کی برہنہ گفتاری کی تائید نہ کر سکنے کے اس سامنے کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا کہ بیشک شاعری پارٹی ایجنڈے یا سیاسی نشانے سادھنے کا عمل نہیں، لیکن شاعری اگر معنی آفرینی اور نادرہ کاری ہے تو تہذیبی، سماجی اور انسانی درد کے رشتوں سے خالی بھی نہیں ہوسکتی۔ اور تو اور کشف ذات و دروں بینی کا عمل بھی تہذیب کی ساختوں کے اندر اور ان میں گندھا ہوا ہوتا ہے۔ نتیجتاً فقط فارم ہی فن نہیں، ادبی قدر تو انسانی درد کی آگ میں تپنے اور فارم میں گندھنے ہی سے بنتی ہے۔ حالیہ فکر کا یہی تازیانہ بہت بڑا تازیانہ ہے کہ ادب نام ہے ثقافتی تشکیل کا اور کوئی ثقافتی تشکیل سماجی دردمندی سے تہی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ شاعری ہو یا آرٹ یہ ہرگز معصوم (نیوٹرل) یا غیر جانب دار نہیں ہوسکتا۔ البتہ اوڑھی ہوئی یا لادی ہوئی آئیڈیولوجی کا بھی یہاں کام نہیں۔ آئیڈیولوجی ادب کے اندر لکھی ہوئی ہے، یعنی ادب انسان اور تہذیبی رشتوں اور سماجی انصاف کی اپنی اقدار خود وضع کرتا ہے اور ادب میں ہر شے نہاں خانۂ دل سے آتی ہے۔ جینت کے یہاں نہاں خانۂ دل کی آنچ تصویری حرکیت کے ساتھ ساتھ برابر محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے سماجی بے انصافی کے زہر کو چکھا ہے اور شبدوں کے رنگوں سے اسے امرت میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ دلت رشتوں کی وجہ سے مقتدر رسوم ورواج کا چاقو کس طرح ہڈی سے گزر جاتا ہے، یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اردو یوں بھی اقلیت کی تہذیبی آواز ہے، مگر جینت پرمار تو اقلیت کے اندر اقلیت ہے۔ یہ Subaltern کے اندر Subaltern یعنی صحیح معنوں میں حاشیائی روح کی آواز ہے۔ درد کی کلونس میں دھنسی یہ سسکی بھی پت جھڑ کی آواز اور سورج، تتلی، سرخ گلاب کے ساتھ ساتھ ابھرتی ہے۔ رنگوں کی جھلا جھل میں 'ماں' کے معنیاتی احساس کی نظمیں ایک شاک کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ ایسی نظموں کو کوئی دوبارہ تبارہ پڑھے اور متن میں اتر کر دیکھے تو جگہ جگہ تاریخی درد کے کٹے پھٹے چیتھڑے اور دیہہ کے درد کے تاگوں سے بنے معنیاتی سلسلے نظر آئیں گے:

سورج اگنے سے پہلے
جلا رہی تھی چولہا
دھواں سانس میں جاتے ہی
کھانس پڑا تھا چندا
چرپائی سے جاگ پڑا میں
کٹیا میں گھستے ہی دیکھا
چولہے میں لکڑی کی جگہ
ماں جلتی تھی

(ماں)

نرک کنڈ کی باس
مرے سکول تلک آتی تھی
دھوپ کی چھتری کے نیچے
ننگے پاؤں اترتی تھی
نرک کنڈ میں!
جانوروں کے چمڑے کو
نمک اور پانی میں بھگو کر
اپنے مریل پاؤں سے کرتی تھی صاف
بدلے میں
گوشت کے ٹکڑے لے آتی تھی
مرے لیے!!
آج بھی جب میں
آفس جانے سے پہلے
اپنے جوتے کو
چیری پالش کرتا ہوں تب

اس کی چمک میں
ماں کا چہرا دکھتا ہے
نرک کنڈ کی باس
میرے آفس تک آتی ہے

(نرک کنڈ کی باس)

پرانے وقت میں
لکھا جاتا تھا
پتوں پر
بھوج پتر پر
تاڑ پتر پر
پیڑ کے سینے پر
پتھر پر
پشو کے چمڑے پر
چاروں وید بھی
لکھے گئے تھے
بھوج پتر پر
لیکن ظلم کی
کالی رچنائیں
لکھی گئی تھی
میرے بدن پر
آج بھی....!

(کاغذ ۱)

یہ درد اور سماجی ظلم و بے انصافی کی لمبی رات کا تخلیقی بیان ہے جو احتجاج کی حدوں کو چھوتا ہے۔ جینت کو فنکار کے منصب کا احساس ہے۔ تخلیقی عمل باطنی عمل ہے جہاں پر سچائی داخلی وجدانی عمل سے گزر کر اثر و تاثیر کا حق ادا کرتی ہے۔ شاعری کی زبان اخبار کی زبان نہیں اور اس بات کو آرٹسٹ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ سو جینت عزم باندھتے اور آواز بھی اٹھاتے ہیں تو تخلیقی عمل کا حصہ بن کر۔ 'ہزاروں ہاتھ' میں وہ ناانصافیوں کی تاریخ کو جگاتے ہوئے مستقبل کو آواز دیتے ہیں جبکہ 'دلت کوی کی وصیت' میں مجبوری اور بے بسی کا احساس ہے لیکن اس سلسلے کی شاہکار نظم میری نظر میں 'صبح کی ہواؤ' ہے جسے اردو کی موثر ترین دلت نظم کہا جا سکتا ہے جہاں صدیوں سے دکھ کا بوجھ ڈھوتی انسانی روح 'لہورنگ سورج کے' وجود کا حصہ بن جاتی ہے:

صبح کی ہواؤ

مری روح کے پاس رک جاؤ

مجھے دولہو رنگ سورج

جس پہ بادل کا سایہ نہ ہو

جو نہ ڈوبے کبھی

افق کے گھنے جنگلوں میں

جس کو انگلی پہ رکھ کر

کرشن کے چکر کی طرح

پھینکو گا ان پر

جنھوں نے میری جیبھ کو کاٹ کر

کھلایا تھا کتوں کو

مری پھول سی

ننھی بچی کا سر کاٹ کر

نذرِ آتش کیا

مری بہن کی چھاتیوں سے

بہائی ندی خون کی

مرے باپ کو زندہ دفنا دیا

دن دہاڑے مری ماں کو ننگا کیا

مری آگ اب ٹھنڈی ہو گی نہیں

مجھے دولہو رنگ سورج

صبح کی ہواؤ

مری روح کے پاس رک جاؤ

(صبح کی ہواؤ)

جینت پرمار کی نظموں پر لکھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میری ایک کمزوری ہے کہ تنقید جو تخلیقی عمل کو کھولتی ہے اور جس سے حظ و انبساط حاصل ہو، ایک طرح کی ذہنی عیاشی ہے کیونکہ اس سے باطن کی طلب کا رشتہ ہے، یہ فراغت و فرصت کا عمل ہے یا یک گونہ شوقِ فضول، جس کے لیے یکسوئی بھی چاہیے اور وقت بھی۔ ان دنوں یہ دونوں عنقا ہیں۔ ایک مدت سے یہ مسودہ رکھا ہوا تھا، شاید جینت مایوس بھی ہو گئے ہوں گے اور انھوں نے تقاضا کرنا بھی چھوڑ دیا۔ ادھر جرمنی میں لیزگ گوئٹے کا شہر ہے اور میرے مثالی فلسفی سوسئیر کا بھی۔ ہر چند کہ موسم یخ تھا، پر یونیورسٹی کے کئی صدیوں پرانی در و دیوار اور محراب و آثار زندگی کی حرارت سے آباد تھے اور کیفے اور پب زندگی سے معمور، جب جب

وقت ملا، نظموں کو دیکھا، پڑھا تو پہلے بھی تھا، لیکن مجموعی پڑھت الگ ہے۔ رفتہ رفتہ اثر و تاثیر کا رس پیدا ہونے لگا۔ تنقید تو ویسے بھی حتمی چیز نہیں، چنانچہ اس اقرار میں قباحت نہیں کہ سخن فہمی بغیر طرفداری کے ممکن نہیں ورنہ غالب کو بھی کیوں معذرت کرنا پڑتی۔ بہر حال جینت پرمار کا ساز و سامان محفل شعر میں اوروں سے الگ ہے، یعنی ایزل، برش، نگار خانہ رنگ اور اسٹروک جنھیں ذہن کی آنکھ برت سکے، ساتھ ساتھ پگھلتے شبدوں کا کشکول۔ اس درویش صفت، کم گو، گوشہ گیر و پر تاثیر شاعر کو دل میں جگہ دینا ہم سب پر واجب ہے۔

ضابطۂ شعر

نقشبند قمر نقوی بھوپالی (امریکا)

شعر کی تخلیق ایک خاص ضابطے کی پابند ہے، اس لئے کہ تخلیقی عمل کا وسیلہ زبان ہے... اردو..... اور اس زبان میں لکھنے کے لئے نثر و نظم دونوں ہی اصناف کے قواعد و ضوابط متعین ہو چکے ہیں، یہ جدا بات ہے کہ وہ قواعد و ضوابط عربی سے مستعار لئے گئے یا فارسی اور ہندی سے، لیکن انھیں اردو میں شرف قبول حاصل ہے، اور اب انھیں اردو کی اصناف سخن کا قانون ہی کہا جا سکتا ہے۔ اب ان کو کسی دوسری زبان سے منسلک کرنا یا اس زبان کے تابع سمجھنا غلطی ہے۔ وہ اردو ادب کا ایک جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ ان میں وہ ضروری تبدیلیاں بھی ہو چکیں جو اردو کے لئے لازم تھیں۔ ضروری ہے کہ تخلیق ادب..... خصوصاً شعر..... کے دوران ان مقررہ اصولوں اور قواعد و رعایات کو ملحوظ رکھا جائے، جو صدیوں پر محیط وقت کی منزلیں طے کر کے ارتقا کے اس مقام پر پہنچا ہے جہاں اس کو ایک ''معیار'' کہا جاتا ہے، اصول و ضوابط وہ ہوتے ہیں جو بے شمار دانشوروں کے تخلیقی عمل کے دوران مرتب ہوتے ہیں اور ان پر ادیبوں، شعرا اور دانشوروں کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ جو لفظ، عبارت، طریقۂ کار، سلیقۂ شعری، طرز سخن، قاعدہ و اصول اساتذہ نے اختیار کیا اس کو بالعموم تسلیم کر لیا گیا، اس طریقۂ کار کے نتیجے میں ہی شعر و سخن کے قواعد و ضوابط وجود میں آئے۔

ان کو تبدیل کیا جا سکتا ہے، ان میں اضافے یا کمی کی جا سکتی ہے، ان کو موجودہ زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر ضروریات سے مطابقت دی جا سکتی ہے۔ لیکن ترک نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ یہی شاعری کی روح ہے۔ اگر قواعد شاعری کو شعر و سخن کی محفل سے خارج کر دیا جائے تو پھر شاعری وہی پھیکی، بے لذت شاعرہ ہو گی جو فی زمانہ نثری جملوں سے مرکب عبارت ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے، ہندوستان میں وہ دور جس میں اردو ادب، نثر اور نظم، دونوں حالت ارتقا میں تھیں، وہ سلاطین کا زمانہ تھا، اس دور میں مسلمانوں کی دینی زبان ''عربی'' تھی، لیکن سلطنتی زبان یا درباری زبان فارسی تھی۔ ایک طرف مسلمان اپنی مذہبی ضروریات کے تحت عربی سیکھتا، دوسری طرف معاشی، سیاسی اور ثقافتی ضروریات کے تحت فارسی، یہی حال ہندو کا تھا، ان کی زبان سنسکرت تو کبھی عوام کی زبان نہیں رہی، وہ جو کچھ بولتے تھے وہ اردو کی ہی ابتدائی شکل تھی، انھوں نے بھی اس دور میں یہی طریقہ اختیار کیا، ہندی تو ان کی زبان تھی ہی، لیکن حکومتی اداروں میں ملازمت اور سرکاری عہدے حاصل کرنے کے لئے فارسی جاننا ضروری ہوا، چنانچہ ہندو بھی فارسی سیکھنے اور لکھنے لگے۔

اس طرح عربی، فارسی اور ہندی کی خلط ملط نے اردو کو تقویت دی اور اس زبان کے قواعد وضع ہوتے گئے۔ اردو شاعری ان ہی تین زبانوں سے متاثر ہوئی، جہاں تک سنسکرت کا تعلق، یا ہندی کا، اس میں اس وقت اتنی جان نہیں تھی۔ ہندوستان میں جو پراکرت زبانیں بولی جاتی تھیں، ان کی ادبی یا شعری تخلیقات کا وہ معیار نہیں تھا جو

دانشوروں کی تخلیقی صلاحیتوں کا ساتھ دے سکتا، لیکن عربی اور فارسی اپنی ترقی یافتہ اور مکمل شکل میں ان کے سامنے تھیں۔ ان دونوں زبانوں کا ادب نہایت پیش رفتہ اور ہر ایک کی ادبی صلاحیت اور ضرورت کی تسکین کے لئے موجود تھا، خصوصاً فارسی شاعری کی استعاراتی اور علامتی تخلیقات کے بہترین نمونے ان کے پیش نظر اور زیر مطالعہ تھے اور اس زبان کی فن شعر میں اس قدر باقاعدگی اور انضباط تھا کہ اردو شعرانے اسی معیار کو اپنانا شروع کر دیا۔ تاہم، ایسا نہیں کہ انھوں نے مقامی یعنی ہندی تاثرات قبول نہ کیے ہوں۔

فارسی عروض کی تتبع میں، اردو میں ردیف وقوافی کا طریقہ قبول کیا گیا، کیونکہ مرکبات لفظی اور ان کا عنصر خوش آوازی، قرات اور بیان میں نشاط اور دلکشی پیدا کرتا ہے۔ ہر زبان کا ادب ایک مرحلے تک پہنچ کر اپنے لئے قواعد وضوابط مرتب کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فن عروض اسی ضرورت کے تحت وضع کیا گیا۔ اس فن کے ذریعے، شاعری کو منضبط کیا گیا، اور اس کے حسن و جمال کے زیب و زینت کے لئے ''نظم'' کے ہر شعبے کو ضبط و ترتیب کے تحت لانے کا کام انجام دیا گیا، اشعار کے لئے بحور مقرر کی گئیں، جو فارسی میں پہلے ہی سے رائج تھیں، انھیں اردو میں اسی طرح قبول کر لینے سے خود اردو کا ہی فائدہ ہوا۔

بحور کے ساتھ ردیف وقوافی کا طریقہ بعینہٖ فارسی کی طرح ہی اختیار کر لیا گیا پھر ان کی جزئیات سے بحث کی گئی، صنائع وبدائع مقرر کیے گئے، غرضیکہ شعر وسخن کے ہر شعبے کے لئے ایک ضابطہ متعین کر دیا گیا۔ شعر کی ساری معلوم اصناف میں طبع آزمائی اور تخلیق اسی نہج اور ضابطے کے تحت انجام پذیر ہوتی رہی ہے۔ کوئی شاعر اس دائرے سے باہر اس لئے نہیں نکلتا کہ اس تجاوز کا نتیجہ شعر کی تباہ کاری پر ختم ہوتا ہے اور وہ تخیلاتی اوج، حسن معانی، اور وصف بیان قائم نہیں رہتا جو اس دائرے میں رہ کر وجود میں آتا ہے۔

ظاہر ہے اردو کو ان قواعد وضوابط کی ترویج اور تسلیم کئے ان مدارج ارتقائی سے نہیں گذرنا پڑا جن سے کئی دوسری زبانیں گذری ہیں، اس لئے کہ اردو کو عربی اور فارسی کے ''عروضی'' ذخیروں کا بیش قیمت خزانہ بصورت قواعد وضوابط بنا بنایا میسر آ گیا۔ اس فن کے تحت شعر میں وزن اور قافیہ لازم قرار دئے گئے۔ حکیم نجم الغنی نے لکھا ہے:

> ''جو سخن وزن حقیقی اور قافیہ رکھتا ہو، خواہ اس کی ترکیب برہانیات سے ہو یا جدلیات سیا خطابیات سے، یا مغالطات سے، یا تخیلات سے، یا ہذیانیات سے، وہ شعر ہے اور تخیل ذات شعر میں معتبر نہیں، اسی لئے شعر کی تعریف کلام موزوں مقفے کے ساتھ کر تے ہیں۔''

کہا جاتا ہے، ''عروض'' ایک عجمی شخص نے ایجاد کیا، اس کا نام خلیل بن احمد بیان کیا گیا ہے، خلیل بصرہ کا رہنے والا تھا، اس نے جس دور میں یہ فن مکمل کیا اس وقت وہ مکہ معظمہ میں تھا اور حصول سعادت کے طور پر اس نے اس فن کا نام ''عروض'' مقرر کیا، ''عروض'' کعبۃ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ خلیل... تقریباً ۱۰۳ھ میں پیدا ہوا، اور ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔ خلیل کا شاعر ہونا ثابت نہیں، البتہ مغنی ہونا معلوم ہے۔

فن عروض کو بہت تیزی سے شرف قبول حاصل ہوا، عرب کے سارے شعرا نے اس کو شعر کے اوزان کی درستی کا نہایت کامیاب ذریعہ تسلیم کرتے ہوئے، اپنے کلام کے اشعار کو عروض کی بحور کے تابع کر لیا، خلیل بن احمد نے

بنیادی طور پر عروض میں اشعار کے اوزان مرتب کرنے کے لئے پندرہ بحور تشکیل دی تھیں۔ لیکن بعد میں ان میں اضافے کئے گئے، اور مزید چار بحریں شامل کردی گئیں۔ اس طرح کل بحور اکیس ہیں۔

امیر خسروؒ کے دور میں ایک شخص بنام "عاشق صادق" نے تین مزید بحور کا اضافہ کیا۔ عرب کے قدیم شعراء اور فارس کے قدما کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے اشعار ان ہی بحور میں سے ایک نہ ایک پر پورے اترتے ہیں۔

انسان صرف خیالات اور محسوسات کا ہی خوگر نہیں، اس کو اللہ تعالی سبحانہ نے دماغ عطا کیا... یعنی ذہن، جس میں تولید خیال کا وصف اس کی ساخت کا ایک جز ولاینفک بنادیا۔ ذہن خواہ انسانی ہو یا حیوانی، اس میں خیالات کی تولید کا سلسلہ اول روز پیدائش سے ہی جاری ہو جاتا ہے اور آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی ذہن کو کام میں لانے لگتا ہے... بھوک لگے تو روتا ہے، کوئی اس سے پیار کی بات کرے تو غور سے دیکھتا ہے، کبھی مسکرا دیتا ہے، عمر ذرا زیادہ ہو تو اس ردعمل میں ترقی ہونے لگتی ہے، یہ سب ذہن کے استعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس مورد میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے، انسانی ذہن صرف توجیہات اور تجزیات کا ہی خوگر نہیں، بے شبہ اس کے خیالات اس کو مختلف موضوعات کے بارے میں سوچنے، ان سے حسب استطاعت نتائج اخذ کرنے اور نظریات قائم کرنے کی طرف متوجہ کرتے ہیں لیکن اس ضمن میں جو عنصر زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس کو "جذبات" کا نام دیا جا سکتا ہے خیالات خصوصاً جذبات کے تابع ہوتے ہیں۔ جذبات ان ذہنی کیفیات کے تابع ہوتے ہیں جو خیالات سے جداگانہ ایک حیثیت رکھتے ہیں، جذبہ پہلے احساس کے میدان میں سر اٹھاتا ہے، پھر ذہن اس کو خیال کا خلعت پہنا دیتا ہے۔ گویا اولیت جذبے کو حاصل ہے، جذبے اور احساس میں گہرا تعلق ہے۔ اکثر جذبہ، احساس کے کسی نتیجے کا ردعمل ہو سکتا ہے۔ پھول کی خوشبو نظر نہیں آتی، حسی طور پر محسوس نہیں کی جا سکتی ہے۔ ہوا کا تموج خوشبو کو فضا میں منتشر کرتا ہے، اس انتشار کی موج انسانی قوت شامہ میں پہنچتی ہے اور ردعمل کے طور پر اس کی نکہت کا احساس ہوتا ہے، اس احساس کے ردعمل سے طبیعت میں فرحت پیدا ہوتی ہے، سکون ملتا ہے، مسرت معلوم ہوتی ہے۔

یہ فرحت، انبساط، سکون، اور مسرت گویا جذبات ہوتے ہیں۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ احساس کو فوقیت حاصل ہے، جذبات اس کے تابع ہیں۔ اس ضمن میں نظر کا بھی تذکرہ کیا جا سکتا ہے، جس طرح قوت شامہ نے پھول کی خوشبو کا احساس کیا، اسی طرح قوت باصرہ نے پھول کے دلکش رنگ دیکھے اور ان کو احساس میں شامل کر دیا۔ اس طرح اس نے گویا خارجی طور پر دو صفات یا عناصر کا احساس کیا، ایک پھول کی خوشبو، دوسری پھول کے متنوع رنگ۔

احساس کا یہ ردعمل ایک حسی شکل اختیار کر لیتا ہے جو خیال کی صورت میں وجود میں آتی ہے۔ اس خیال میں خوشبو کی نکہت، اور رنگوں کی کی فرحت دونوں کی آمیزش سے ایک جدید احساس پیدا ہوتا ہے، جس کو انبساط کہا جا سکتا ہے۔ مختلف افراد اس انبساط سے اپنے ذوق اور اہلیت کے مطابق نتائج اخذ کرتے ہیں، ایک شخص خوشبو کا معترف ہوتا ہے، ایک اور شخص محض رنگوں سے محظوظ ہوتا ہے، لیکن ان دونوں میں قدر مشترک وہ احساس ہے جو ان دو مختلف اوصاف کے ردعمل کے طور پر ان کے ذہنوں میں پیدا ہوا۔ ردعمل کی شدت بھی مختلف افراد میں علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے، کوئی شخص ایک منظر سے محظوظ ہوتا ہے، دوسرا شخص اسی منظر سے صرف نظر کرتا ہے۔ جس شخص کا ردعمل زیادہ شدید ہوتا ہے، اس کا سبب وہ شدت احساس ہے جو اس میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ فعال ہوتی ہے۔

انسان خارجی اثرات تو قبول کرتا ہی ہے، لیکن اس کے داخلی احساسات بھی اس پر مسلسل اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ ان داخلی احساسات کو ہی ''جذبات'' کا نام دیا جاتا ہے۔ خارجی احساسات اپنی ہیئت اصلی کے پیش نظر داخلی احساسات کو مہمیز دینے کا کام کرتے ہیں۔ اس لئے کہ داخلی احساس متعدد جذبات کی تشکیل کرتا رہتا ہے۔

جذبات کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے، اور ان کا خارجی اثر بھی مسلمہ ہے۔ مثلاً غیظ ایک جذبہ ہے، جو کسی ناخوشگوار احساس کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن غیظ کا مشاہدہ ممکن ہے، اس لئے کہ اس کا خارجی اثر واضح ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ خود داخلی احساس کی پیداوار ہوتا ہے۔ اسی طرح نفرت یا محبت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے، محسوس کرنے کی اہلیت مختلف افراد میں مختلف درجات کی ہوتی ہے، کوئی زود حس ہوتا ہے، کوئی تاخیر سے محسوس کرتا ہے، ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی میں حس ہی نہ ہو، ایسا شخص بے حس اور مظاہر قدرت یا خارجی اثرات سے متاثر ہونے کی اہلیت سے محروم ہوتا ہے۔

جس شخص میں احساس کی اہلیت عام لوگوں کی اہلیت سے قوی تر ہوتی ہے، وہ اپنے جذبات کے بارے میں اظہار خیال کے مختلف درجات سے متصف ہوتا ہے، کوئی اپنے جذبات کو خیال کا خلعت پہنا کر اس خیال کو مناسب انداز سے ظاہر کر سکتا ہے، افعال سے یا الفاظ سے، ''اچھا'' کہہ سکتا ہے یا ''برا''، لیکن اسی کے مقابل دوسرا شخص اس ''خیال'' کی بہتر توضیح کر سکتا ہے، اس خیال کی جزئیات سے بحث کرتا ہے، تجزیہ کرتا ہے اور اس کے عواقب سے بحث کر لیتا ہے۔ اس سے بھی برتر درجے پر پہنچ کر احساسات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جذبات کو ایک شخص کسی مناسب طریقے سے ظاہر کر لیتا ہے، مصور اس کی تصویر بنا دیتا ہے، ادیب اس کو دلکش نثر کا خلعت پہنا دیتا ہے، شاعر اس کو نظم کی شکل میں حیرت انگیز طور پر جاذب توجہ بنا دیتا ہے۔

کسی ایک ذریعۂ اظہار جذبات کو دوسرے سے برتر ثابت کرنا بہت دشوار ہے ہر نقش اظہار اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے اور اپنے طور پر وہ معانی یا مفاہیم ارسال کرتا ہے، جو اس کے خالق کا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن... نظم ان سب سے اعلیٰ تر اور زیادہ موثر ہوتی ہے۔

شعر... احساسات کے نتیجے میں پیدا ہونے اور لاشعور کی موجوں سے طوفان بن کر بیساختہ نمودار ہو جانے والے اس اظہار جذبات کو کہتے ہیں جو الفاظ کی شکل میں ایک خاص موزونیت، جدت بیان، ندرت الفاظ اور حقیقت اظہار کا انداز لئے، ایسے حقائق و مفاہیم ارسال کرتا ہے، جس کے سننے یا پڑھنے سے ذہن میں اس کے مفہوم کی ایک دلکش تصویر تشکیل پا کر احساس کو اس کے تاثر سے ہم آہنگ کر دے۔ اور طبیعت میں انبساط یا حزن پیدا کر سکے۔ یعنی پڑھنے یا سننے والے کو متاثر کر سکے! یا... کسی جذبے کی ترجمانی کرے۔ ماضی یا حال کے مسائل کا ایک نہایت دلکش انداز سے بیان کر سکے۔

انگریزی کے مقتدر ادیب ڈاکٹر جانسن سے یہ سوال کیا گیا تو اس کا جواب تھا:

''یہ کہنا زیادہ آسان ہے کہ کیا چیز شاعری نہیں ہے؟!''

کارلائل نے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کیا:

''شعر مترنم خیال کا نام ہے''

انگریزی کے مشہور ادیب ادگر ایلن پو نے کہا:

''شاعری حسن کی مترنم تخلیق ہے۔''

اسی طرح مشہور شاعر اور نقاد، میتھو آرنلڈ نے کہا ہے:

''شاعری زندگی کی تنقید کا نام ہے، اس کا موضوع سارے انسانی اعمال اور خیالات ہیں، نہ صرف۔ وہ خیالات جن کا وجود عمل سے پہلے ضروری ہے، جس کی مدد سے اعمال کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ خاص طور پر وہ خیالات جو نسل انسانی کے ذہنی تجربات اور روحانی بلند حوصلگی کا ذخیرہ ہیں۔''

شاعر اپنے کلام، یا اشعار کے وسیلے سے اپنے احساسات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خیالات کو مناسب اور پر زور الفاظ اور طرز بیان کے ذریعے زندگی پر منطبق کرتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے:

''جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے مطابق بے کچھ نہ کچھ روئیدگی کے بغیر نہیں رہ سکتی، اس طرح کوئی زبان اپنے اہل زبان کی حیثیت بموجب نظم سے خالی نہیں رہ سکتی، ہر روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت ظاہر کرتی ہے۔ زبانوں کے سلسلے میں ہر ایک نظم اپنی زبان اور اہل زبان کی شائستگی اور تہذیب علمی کے ساتھ لطافت طبع کے درجے دکھاتی ہے۔''

انھوں ے شعر کی تعریف میں کہا:

''نظم جوش طبع تھا، اس لئے پہلے نکل پڑا۔''

یعنی ''شعر'' جوش طبع کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ زیادہ درست ہوگا کہ ''شعر'' جذبات کی لفظی عکاسی کا نام ہے۔

شعر... شاعر کے معیار خیال، اخلاقی قوت، حوصلہ، ذاتی کردار، تہذیب تجربات واحساسات کی شدت، شعور کا صحیح فعل، قوت فکر، یعنی اس کو مشاہدات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کا قرینہ، ذوق جمال...

اکثر لوگوں میں جمالیاتی حس زیادہ قوی ہوتی ہے، شاعر کی یہ حس عام لوگوں کی نسبت قوی تر ہوتی ہے، یہ وہ تمام عناصر ہیں جن کی ترکیب سے شاعر کے ذہن میں شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔ شاعر شعر تخلیق کرتا ہے.....

اسکے ذہن میں خیال پیدا ہوتا ہے، اور اس کی ذاتی صفات کی روشنی میں ایک خصوصی ہیت اختیار کر لیتا ہے۔

''شاعر کے دل میں ایسے احساسات پیدا ہوتے ہیں جن کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، شاعر اس احساس سے مجبور ہو کر اسے لفظوں میں منتقل کر دیتا ہے۔''

گویا... الفاظ کو کسی معنی کے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے۔

ادب کی پرکھ اور قاری

ڈاکٹر نریش (پنچ کولہ)

عام طور پر ہم کسی تخلیق کی تعریف اس وقت کرتے ہیں۔ جب ہم اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس صورت میں ہمارا لطف ہی ادب کی پہچان کا معیار بن جاتا ہے اور جس تخلیق سے ہمیں لطف نہیں ملتا، ہم اسے ''خشک'' یا ''بے مزا'' کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ ادب کی صحیح پرکھ کے لیے یہ ضروری ہے کہ ادب کا مطالعہ بغیر کسی ذہنی یا نظریاتی بندش کے کیا جائے۔ ادیب سے جس بہترین کی توقع کی جاتی ہے، اس کی تمام تر ذمہ داری ادیب ہی پر ڈال دینا ادب اور ادیب دونوں کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے۔ اگر ادیب اپنے تخلیقی عمل کے دوران یہ سوچ لے کر قاری اس کی تخلیق پر عش عش کر اٹھے، تو شاید وہ طلسمی یا جاسوسی ادب سے آگے ہی نہ بڑھ پائے۔ اس صورت میں اس کا مقصد قاری کے انہماک، اس کی خرمی اور اس کی فوری لطف اندوزی تک محدود ہو جائے گا۔ لیکن ہم ادیب سے نہ تو طلسم کا تقاضا کرتے ہیں اور نہ سستی خوشی کا۔ ہم اس سے امید کرتے ہیں کہ وہ ہماری ذات کی تہوں کو، اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت کھول کر ہمارے سامنے رکھ دے گا۔ اکثر تو ہم اس سے اپنے قلبی مرض کی تشخیص ہی نہیں، اس کے علاج کی خواہش بھی کرتے ہیں۔ لیکن جس اہم نکتے کو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ ہے ادب کو قبول کرنے کی ہماری اپنی صلاحیت۔ لطف حاصل نہ ہونے ہی سے کسی تخلیق کو بے مزا قرار دینے میں ہم یہ نہیں سوچتے کہ لطف کا معیار یا نظریہ بھی تو غیر معروضی ہے۔ ایک شخص کو نعتیہ کلام بے حد پسند ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کہ کسی دوسرے شخص کو مذہب کے نام ہی سے چڑ ہو۔ اسی طرح کسی تخلیق کی تعریف کرنا بھی ٹیڑھی کھیر ہے۔ قاری کے ''مزا آ گیا'' یا ''مجھے پسند ہے'' یا ''بہت دلچسپ ہے'' جیسے ذاتی تاثرات کا اعلان ہی کافی نہیں ہے۔ اسے یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ کوئی تخلیق اسے پسند ہے یا ناپسند ہے تو اس کی بنیاد کیا ہے۔ قاری اگر اپنی پسند یا ناپسند کا، بلکہ اپنی ترجیح کا جواز نہیں پیش کر سکتا تو یہ سمجھئے کہ وہ صرف تخلیق کو پڑھتا ہے، اس سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہونے کا یا قدر پہچاننے کا حقدار وہ نہیں ہے۔

ادب کی پرکھ کے لیے سب سے اول چیز ہے ادبی رجحان کا پیدا ہونا۔ قبول کرنا یا رد کرنا انسانی فطرت ہے لیکن جب تک ہم میں کسی چیز کو قبول کرنے کا رجحان پیدا نہیں ہوتا تب تک ہمارے اندر اس چیز کے لیے کشش بھی پیدا نہیں ہوتی۔ گوشت نہ کھانے والا آدمی یہ نہیں بتا سکتا کہ کس جانور یا کس پرندے کا گوشت کھانے میں بے حد لذیذ ہے چونکہ گوشت خوری سے متعلق اس کی اپنی رائے ہی نفرت پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر قاری یا سامع میں ادبی رجحان کا بیج ہی نہیں بویا گیا ہے تو وہ ادب کو قبول کرنے سے قاصر ہوگا۔ ہم اس بات کو کسی مستند دلیل کے طور پر لے کر آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس لیے کہ ادب ہماری زندگی اور ہمارے سماج کا آئینہ ہے۔ بنیادی طور پر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی ہی ادب میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ غرضیکہ ہم یہ مان کر آگے چلیں گے کہ ہر ذی ہوش انسان میں ادب کو قبول کرنے کی قوت موجود ہوتی ہے۔ اس کی اس قوت کو رجحان میں بدلا جا سکتا ہے۔ رجحان مشق سے تعبیر ہوتا ہے اور مشق

ارادے کی مرہون منت ہوتی ہے۔ ادبی رجحان یا ادب میں دلچسپی پیدا ہونے کے بعد ادب کی پرکھ کے راستے پر پہلا قدم بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس پہلے قدم کو ہم ''قبولیت'' کا نام دے سکتے ہیں۔ ہمارا ادبی رجحان ہمارے لیے ادب کو قبول کرنے کا راستہ ہموار کرتا ہے۔ البتہ یہاں بھی اگر ہم کسی ذہنی یا نظریاتی بندش کے باعث تخلیق کے مجموعی وجود کو نظر انداز کر کے اس کے بعض حصوں کا احاطہ کریں گے تو ہم ادب کے اچھے قاری نہیں ہوں گے۔ تخلیق کو اس کی مجموعی حیثیت ہی میں قبول کرنا ہوتا ہے۔ بصورت دیگر ہم اسے پڑھتے تو ہیں، اسے قبول نہیں کرتے ہیں۔ جیسے ناول پڑھنے والے کسی قاری میں ادبی رجحان تو ہو سکتا ہے لیکن جب وہ چند صفحات بغیر پڑھے ہی الٹ کر آگے بڑھ جاتا ہے کہ یہ صفحات اس کی طبیعت کے مطابق نہیں ہیں، تو وہ ناول کو اس کی مجموعی حیثیت میں قبول کرنے سے کترا رہا ہوتا ہے۔ غرض یہ۔ ادبی رجحان کے ساتھ ساتھ قاری میں ادب کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے، جس کے لیے اس کے مزاج میں تحمل کے وصف کا ہونا ضروری ہے۔

ادب کو قبول کرنے کی صلاحیت ہمیں ادبی بیداری عطا کرتی ہے۔ قاری کا ذہن جب بیدار ہو جاتا ہے تب اس کے لیے ذاتی پسند یا ناپسند کی اہمیت نسبتاً کم ہو جاتی ہے اور وہ تخلیق کو اس کے خالق کے ذہنی عمل کے پس منظر میں [illegible]نے لگتا ہے۔ ادب کو قبول کرنے کے اس عمل میں قاری کا تحت الشعور ادیب کے تحت الشعور سے ایک جذباتی رشتہ قائم کر لیتا ہے اور اس مقام پر پہنچ کر وہ تخلیق کا مطالعہ کرتے وقت اس کے عہد، حالات، جذبات اور تاثرات کی روشنی میں رہتا ہے۔ یہاں قاری سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ قبول کرنے یا رد کرنے کے لیے اپنے ذہنی عمل کو بیان کرنے کے قابل ہو اور یہ وضاحت کر سکے کہ کوئی تخلیق اسے کیوں پسند آئی ہے یا کیوں پسند نہیں آئی ہے۔ اگر ادب کا وصف عملی قاری کو لطف اندوز کرنا ہے تو تنقید ادب کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ ادب کی تفسیر پیش کرے۔ ان بنیادی نکات کو واضح کرے جو تخلیقی عمل میں ادیب کے لیے محرک رہے ہیں۔ اس صورت میں قاری اور ادیب دونوں آدھا آدھا راستہ چل کر ایک منزل پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ وضاحت یا تفسیر کا یہ عمل تنقید کی پہلی منزل ہے۔ ادبی رجحان کے باعث ادب کے تئیں بیدار ہو کر جب قاری کسی ادب پارے کو قبول کرتا ہے، تب وہ اس کے بنیادی نکات کو بیان کرنے کی پوزیشن میں آتا ہے۔ یہاں پر بھی تخلیق کے محاسن و عیوب کا بیان التوا میں رہتا ہے، ادیب کے جذبات کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی ہی اول رہتی ہے۔ گویا یہاں پر یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ ادیب نے کیا کہا ہے، جو کچھ کہا ہے وہ اپنے آپ میں کتنا وزن دار ہے اور جن الفاظ میں کہا گیا ہے ان کی طاقت اور رسائی کتنی ہے، کہی گئی بات کے لیے الفاظ و معانی کا تسلسل کہاں تک قائم رکھا گیا ہے اور کیا اس کی زبان اور اس کا انداز بیان ادیب کے جذبات و تاثرات کو بہ تمام و کمال قاری تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں۔ ادبی طور پر بیدار قاری ان سوالوں کے جواب سے ادیب اور دیگر قارئین کے درمیان ایک تعلق پیدا کرتا ہے اور ادب کو آسان طریقے سے قارئین تک پہنچاتا ہے۔

ان تین منزلوں سے گذر کر ہم ادب کی پرکھ تک پہنچتے ہیں۔ ادب رجحان سے پیدا شدہ ادبی بیداری کے طفیل جب ہم تخلیق کے ذریعے سے ادیب کے دل کی گہرائیاں چھو کر اس کی تخلیق کی مکمل تشریح کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں تب ہم ادب کے متعلق ایک جامع رائے قائم کر کے اس کی تنقید کر سکتے ہیں۔ پرکھنے کی اس عمل میں ہمارے پیش نظر تخلیق کا ظاہر بھی ہوتا ہے، باطن بھی۔ ظاہر و باطن کی ہم آہنگی ہی تنقید کی جان ہوتی ہے۔ یہاں پر تخلیق کے

عیوب ومحاسن بیان کیے جاسکتے ہیں۔ تخلیق کے ذریعے قاری تک ادیب کی رسائی بھی یہاں پر پرکھی جاسکتی ہے۔ پرکھ کا یہ عمل یہاں پر بھی تب تک ادھورا رہتا ہے جب تک ہم ادب کو اس کے عہد کی روشنی میں دیکھ کر، اس دور کی دیگر تخلیقات میں اس کا مقام ومرتبہ متعین نہیں کرتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قاری کا مطالعہ تخلیق کے عہد کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی سے وابستہ ہوکر اس زمانے کے نظریات، تحریکات، ردعمل اور ادیب کے دل و ذہن پر ہونے والے ان کے فطری اثرات کو مدنظر رکھے۔ ان تمام اجزا کی روشنی میں تخلیق کی قدر و قیمت بتا کر اس کی ہم عصر تخلیقات میں اس کے مقام کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

ادب کی پرکھ کے فن میں کمال حاصل کرنا اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا مشکل کام اعلیٰ ادب کی تخلیق کا ہے۔ کسی بھی ادب پارے کے متعلق یہ کہنا کہ ہم نے اس کے تمام پہلوؤں کو سمجھ لیا ہے یا اس کے ظاہر و باطنی معنی ہم پر کھل گئے ہیں مبالغہ آرائی ہوگا۔ ہاں اپنی صلاحیت کے مطابق اور اپنے بہترین علم و دانست میں اس کے زیادہ سے زیادہ احاطے کا دعویٰ نامناسب نہیں ہوتا۔ ادب کی پرکھ میں زیادہ سے زیادہ اہلیت حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود قاری کو حیات و کائنات کا وسیع تجربہ حاصل ہو اور انسانی اعمال سے متعلق اس کا مشاہدہ عمیق ہو۔ ادب چونکہ حیات و کائنات کی ہی عکاسی کرتا ہے اس لیے جب تک ہم انسانی فطرت اور اس کے فطری اعمال کے مطالعہ سے محروم ہوں گے، ہم ادب میں نہاں اس کے عہد کی دھڑکنیں سننے سے بھی معذور ہوں گے۔ ادب کی پرکھ کے لیے دوسری اہم ضرورت ہوتی ہے باریک بیں نظر کی۔ ہماری نظر کو یہ ہنر ہمارے مشاہدے اور ہماری فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ ادب کا مسلسل مطالعہ اور اس پر غور وفکر ہی ہمیں وہ نظر عطا کرتی ہے جس سے ہم مختلف پہلوؤں سے پہچان کر ادب کی پرکھ کر سکیں۔ میں نے یہاں پر جان بوجھ کر مطالعہ کے ساتھ فکر کو جوڑا ہے۔ بلکہ میں فکر پر زیادہ زور دینا چاہتا ہوں۔ ادب کا مسلسل فکر ومطالعہ ہمیں اس کے ظاہری و باطنی معانی سمجھنے کی سمجھ دیتا ہے اور اس فنی ریاض سے ہمیں کسی تخلیق کے بارے میں بہترین رائے قائم کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ ایسے قاری کے سامنے ادب تہہ در تہہ کھلنے لگتا ہے اور اس کے لیے کچھ بھی عنقا نہیں رہتا۔ یہاں بھی اگر ہماری صلاحیت کمزور ہے یا اگر ہم ادیب یا اس کے ادب کے بارے میں ذہنی بندشوں کا شکار ہیں تو ہم پرکھنے کے فن کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتے۔ غرضیکہ کسی بھی ادبی تخلیق کی تنقید کے لیے قاری کو اپنی ذات سے اونچا اٹھنا ہوتا ہے اور اپنی ذاتی ہمدردی یا نفرت پر غالب آنا ہوتا ہے۔

ادب کی پرکھ کے اس مطالعہ میں میں نے دانستہ طور پر ان اصولوں کا ذکر نہیں کیا ہے جن کو تنقید کے مستند اصولوں کے طور پر قبول کیا جاچکا ہے۔ بنے تلے اصولوں کو بنیاد بنا کر اگر بہتر طریقے سے ادب کو پرکھا جانا ممکن ہوتا تو تنقید کو شاید فن کا نام ہی نہ دیا جاتا۔ تب تو تنقید کا عمل مقناطیس جیسا ہوتا کہ جو چیز اس سے چپکتی ہے اسے لوہا مان لیا جائے اور جو اس سے نہیں چپکتی اسے رد کردیا جائے۔ اپنے اس مضمون میں میرے پیش نظر فن تنقید کی کتابیں نہیں، ایک عام قاری رہا ہے۔ یہ عام قاری صاحب نظر بنے، نکتہ دان و نکتہ رس بنے، اس کے طریقوں پر میں نے غور کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ادب کا ہر سنجیدہ قاری ادب کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر وہ قاری جو ذہنی بندشوں اور نظریاتی مجبوریوں کا شکار نہیں ہے، ادب کے مفہوم کو اس کے مکمل حسن وکمال کے ساتھ حاصل کرسکتا ہے، اسے دوسرے کے لیے بیان کرسکتا ہے جبکہ پیشہ ور ناقد صرف تنقیدی اصولوں کے چوکھٹے ہی میں ادب کی فنگ کا مطالعہ کرسکتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اور امتزاجی عمل

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگل پور)

ڈاکٹر وزیر آغا نے ساختیات، پس ساختیات، ساخت شکنی اور نئی تاریخیت کے سلسلے میں کھلے ذہن سے بحثیں کی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ مغرب میں بیسویں صدی سے قبل ایک ایسی ساخت کا تصور رائج تھا جو Logocentrism پر استوار اور نظام شمسی سے مشابہ تھی۔ قدیم مذاہب سے لے کر نیوٹن کی طبیعات تک اس مسافت ہی کو قبول کیا گیا تھا جس میں 'مرکز' مسافت کے اندر ہوتے ہوئے بھی مسافت سے باہر تھا۔ اس مرکز کی حیثیت، موجودگی (Presence) متکلم لفظ (Spoken Word) (بصورت حکم)، تصور (Concept) یا ماورائی مدلول (Transcedental Signified) کی تھی۔ ساخت اور اس کے مرکز کا رشتہ خالق اور مخلوق کا سا تھا۔ گویا ایک طرح کا دوئی کا تصور رائج تھا۔ بیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی بہت سے سائنسی اور علمی شعبوں میں ایسی پیش جہت کو فلسفے کی زبان میں Decentring کے لفظ سے موسوم کیا گیا۔ اس نے سسٹم، کوڈ یا اصل الاصول کے حوالے سے 'مرکز' کو مسافت کے اندر پایا۔ ہر ایک الگ اکائی کے طور پر تصور کرنے کے بجائے ساخت پر محیط قرار دیا۔ آئن سٹائن نے اس دوئی کو غلط قرار دیتے ہوئے Space-The Continuom کا نظریہ پیش کیا۔ دوسری طرف کوانٹم طبیعات نے جب ذرے (Atom) کے اندر جھانکا تو اسے معلوم ہوا کہ کائنات کا یہ بنیادی جزو یعنی Building Block کوئی ٹھوس وجود نہیں رکھتا بلکہ رشتوں کی ایک گرہ ہے۔ گویا کائنات کسی ٹھوس بنیاد پر نہیں بلکہ رشتوں کے ایک ایسے "پیٹرن" پر استوار ہے جو لامرکزیت کا حامل ہے۔ سوشیولوجی میں اہم ترین آواز درکی تھی جس نے افراد اور طبقات کی تفریق اور تقسیم کے عقب میں موجود اس Social Milieu کو نشان زد کیا جو اصلاً سماجی قوانین اور روایات کا ایک سسٹم تھا۔ اس طرح فرائڈ اور اس کے بعد ژونگ نے شعوری سطح کی ساری تفریق اور تقسیم کے بطن میں اس لاشعور کو دریافت کیا جو انسانی تجربات کی کھائیوں (رشتوں) پر مشتمل تھا اور ایک سسٹم کا درجہ رکھتا تھا۔ لسانیات کے میدان میں سوسیر نے کہا کہ گفتار (Parole) کا تمام تر مدوجزر اس زبان (Langue) کے تابع ہے جو گفتار کی بنت میں بطور گرائمر یا اصل الاصول موجود ہوتی ہے۔ عمرانیات پس لیوی سٹراس نے اسطورہ کے سلسلے میں یہ انکشاف کیا کہ جملہ بھانت بھانت کی اساطیر کی بنت میں ایک مہا اسطورہ، موجود ہے جس کے بنیادی سسٹم کے مطابق ہی مختلف اساطیر خلق ہوئی ہیں۔ موجودیت والوں نے کہا کہ جوہر (Essence) جسے سارتر نے Being in Itself کا نام دیا ہے، ایک ایسا مکان یعنی Space ہے جو پوری طرح لبریز اور مکمل ہے۔ یہ جوہر اتنا وسیع، غالب اور بے کنار ہے کہ کوئی شئے اس سے باہر نہیں رہ سکتی۔ ادب کے میدان میں ایلیٹ نے روایت کا ذکر چھیڑا جو ایک مجموعی طرح نہیں تھی بلکہ حال کے اندر ایک زندہ شئے یا سسٹم کی صورت کارفرما تھی۔ روسی ہیئت پسندوں نے ہیئت اور متن کی دوئی کو مسترد کرتے ہوئے "لسانی

وجود" ہی کو اصل حقیقت سمجھا اور "نئی تنقید" نے تخلیق کو مصنف کے تابع قرار دینے کے بجائے اسے ایک مقصود بالذات خود مختار اکائی جانا۔ ساختیات نے تصنیف کے اندر کی Codes اور Conventions کا ایک سسٹم دریافت کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ قاری کا کام اس سسٹم کے پرتوں کو یکے بعد دیگرے کھولنا اور لطف اندوز ہونا قرار پایا۔ اس طرح علم و ادب کے سارے شعبے خالق و مخلوق کے ایک نئے رشتے کو سطح پر لا رہے تھے۔

مغرب میں ساخت کا جو تصور بیسویں صدی میں رائج ہوا اس نے Presence کے بجائے Metaphysics of Presence کو، خالق کے بجائے اس کی تخلیقیت کو نیز صورتوں کے عذر، (مایا) کے تار و پود میں موجود سسٹم کو اہمیت بخشی۔ اور ڈریڈا کی ڈی کنسٹرکشن نے اس سسٹم کو منہدم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نظریہ ایسا تھا جس نے مغرب کے فکری نظام کی بنیادوں تک ہلا کر رکھ دیا۔ چنانچہ اس نظریے کو باطل قرار دینے کے لیے مغرب کے بیشتر مکاتب ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ ان میں اسطوراتی نقاد بھی تھے، فرائڈ کے پیروکار بھی، ساختیاتی نقاد اور نئی تنقید کے مبلغین بھی، شکاگو مکتبہ فکر کے ہمنوا اور سسٹن فورڈ کے اخلاقی نقطۂ نظر والے بھی جبکہ دوسری طرف ڈریڈا کو پال ڈی مین، ہلس ملر، جارج ہارٹ مین اور جوزف رڈل ایسے پیروکار مل گئے۔ ڈی کنسٹرکشن کے مطابق 'مرکز' کا وجود ایک مفروضہ ہے۔ مرکز نہ تو ساخت کے اندر ہے اور نہ باہر" اگر مرکز نہیں ہے تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ خالق 'مصنف'، آرکی ٹائپ، علم کا فیلڈ اور Cogito بھی موجود نہیں ہیں۔ ڈی کنسٹرکشن کے مطابق مرکز اور سمت، اصول اور سسٹم سے لاتعلق "موجودگی" ایک گہراؤ ہے جسے Abground یا Abyss کہا گیا اور اسے ہی ساخت شکنی کا نظریہ اصل حقیقت کہنے پر بضد ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اس سارے منظر نامے پر مجموعی نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"پچھلے ایک سو برس میں مغربی تنقید چار مراحل سے گزری ہے۔ پہلا مرحلہ تاریخی سوانح تنقید کا تھا جس میں مرکز، کو تمام تر اہمیت تفویض کی گئی اور اسی حوالے سے مصنف (لکھاری) خالق اور Presence کو تخلیق کاری کا محرک قرار دیا گیا۔

دوسرا مرحلہ اتی تنقید کا تھا جس میں مصنف کی نفی کر دی گئی اور تصنیف (لکھت) کی موجودگی کو ایک خود کار اور خود کفیل اکائی کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ تیسرا مرحلہ ساختیاتی تنقید، کا تھا جس میں حوالہ اس سسٹم و کوڈ، گرامر یا شعریات (Poetics) کا تھا جو تصنیف کی ساخت میں موجود تھی۔ چوتھا مرحلہ، ساخت شکنی، کا تھا جس میں حوالہ اس گنجلک (Labyrinth) کا تھا جو اصلاً ایک گہراؤ یا Abyss تھا۔ ایک ایسا گہراؤ کہ جس کا نہ تو کوئی، مرکز، یا خالق (مصنف) تھا اور نہ جس کے عقب یا بطن میں کوئی سسٹم موجود تھا۔" (ماہنامہ "صریر" کراچی۔ جون جولائی ۱۹۹۳ء)

وزیر آغا کی لچکدار رائے لائق توجہ ہے کیونکہ انہوں نے 'نو تاریخیت' پر بھی بحث کی ہے۔ بقول ریاض صدیقی "نو تاریخیت جدید مغربی تنقید کا اس وقت غالب رجحان ہے۔ اور جو صورت حال تنقید کے حوالے سے ہمارے یہاں ہے نو تاریخیت کے مطالعے کی متقاضی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے نو تاریخیت کا تعارف اختصار کے ساتھ کیا ہے اور بتایا ہے:

تاریخی و سوانحی تنقید نے ترازو کا پلڑا تاریخ کی طرف جھکا دیا تھا۔ روسی فارملزم اور نئی تنقید نے اسے عدم

تسلسل کی طرف جھکا دیا۔ اب نئی تاریخیت نے دونوں پلڑوں کو برابر کرنے کی کوشش کی ہے۔

نئی تاریخیت کا موقف یہ ہے کہ سماجی اور تاریخی تناظر میں ادب کا مطالعہ جاری رہ سکتا ہے۔ ادب محض ہوا میں تخلیق نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایک تاریخی حوالہ بھی ہے۔ نئی تاریخیت نے تسلسل کے تصور کو نہیں مانا ہے اور ساتھ Author-God اور اسی حوالے سے مرکز کو بھی مسترد کیا ہے۔ اس اعتبار سے نئی تاریخیت کو ساخت شکنی کی توسیع بھی کہا جا سکتا ہے۔

جست تاریخی مواد کے اندر سے لگتی ہے۔ اگر یہ تاریخی مواد (روایت، تسلسل) موجود ہی نہ ہو تو جست کیسے لگے گی۔ ان آرا میں نو تاریخیت کے وسیع تر معنوی و نظریاتی شعور کی روح سمٹ آئی ہے اور اس بات پر دلیل ہے کہ مصنف نے موضوع پر قریبی اور تازہ مواد کا بھی مطالعہ کیا ہے۔'' (ماہنامہ 'اوراق' لاہور۔ فروری مارچ ۱۹۹۵ء)

وزیر آغا کی سوچ کے قدم آگے بڑھ چکے ہیں اور انہوں نے اکیسویں صدی کو لبیک کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے طریقہ کار سے اردو تنقید کو وسیع بنیاد سے آشنا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انسان نے 'حقیقت اولیٰ کو جاننے کے لیے تا حال تین قدم اٹھائے ہیں۔ پہلا قدم وہ تھا جب قدیم انسان نے 'حقیقت' کو ایک مرکز آشنا ساخت (Center-Orjented-Structure) کی صورت میں محسوس کیا۔ اس کا یہ احساس اس عام سے مشاہدہ کی دین تھا کہ ہر شئے کے جملہ اجزاء ایک مرکز سے بندھے ہوتے ہیں۔ یہ مرکز آشنا ساخت کچھ یوں تھی:

مگر اس سے بھی آگے ایک ایسی ساخت کا بھی ادراک ہوا جس میں جزو اور کل کی تفریق نہیں تھی۔ اس ساخت کے ہر جزو میں پورا کل سمایا ہوا تھا۔ یہ ساخت 'رشتوں کا ایک جال' تھی:
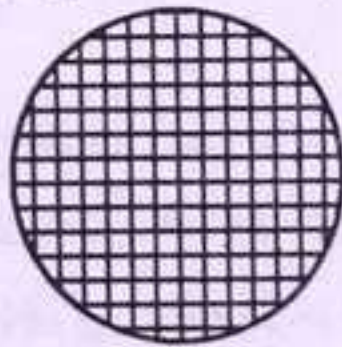
اور مغربی انسان نے حقیقت اولیٰ کو جاننے کے لیے تیسرا قدم بھی اٹھایا کہ جزو اور کل کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دینا بھی ایک طرح کی ثنویت کو قبول کرنا ہے۔ گویا ساخت رشتوں کی ایک مرتب اور مدون صورت کا نام نہیں بلکہ ایک ''گنجلک'' ہے جو کسی قاعدہ قانون کے تابع نہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کوڈ سسٹم، گرائمر، قاعدہ، قانون اور صنعت سے ماورا ہے جو اس طرح ہے:

وزیر آغا نے یہ بھی محسوس کیا کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب ساختیاتی مباحث کا چلن عام ہوا تو بنیادی جہت (محویت کے تصور کو برقرار رکھنے کے بجائے) ایک امتزاجی رویے کو سامنے لانے کی علمبردار نظر آنے لگی۔ اس طرح ساختیاتی نظام تنقید میں "لکھت" شعریات اور قاری نے مل کر ایک اکائی کی تشکیل دی جو ایک امتزاجی عمل ہے۔

مجموعی طور پر وزیر آغا یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ اکیسویں صدی اپنے عام تخصیص رویوں کے باوجود ایک امتزاجی عمل کی مظہر ہوگی اور یہی اس کا اہم ترین تقاضہ قرار پائے گا۔

انحراف کا اعتراف

شان الرحمٰن (پٹنہ)

یعقوب تصور اردو کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کا ہر کلام قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اپنے وطن سے دور رہ کر بھی وہ زندگی کے مختلف مسائل اور اس کے پیچ وخم کو اردو شاعری میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کی تخلیقات اکثر قارئین کے اندرون داخل ہو جاتی ہیں۔ صرف دل کے دروازے پہ دستک نہیں دیتیں۔ ان کا مجموعہ ''انحراف'' میرے ہاتھوں میں ہے۔ جس کے بارے میں عالمی شہرت یافتہ دو ناقدوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور جناب وہاب اشرفی۔ جن کی تحریریں فن کے پیچ وخم کو اس طرح کھولتی ہیں کہ وہ چیز ہمیں صاف طور پر نظر آنے لگتی ہے۔ یعقوب تصور کا یہ مجموعہ ''انحراف'' خود ہی اپنے عنوان کے تحت ایک معنویت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ فن قطعہ کی جو تعریف ہوتی ہے اور اس کے جو اصول وضوابط ہوتے ہیں اس سے یہ مجموعہ الگ ہے۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور جناب وہاب اشرفی کی بیش قیمت تحریروں کے علاوہ یعقوب تصور نے اپنا بھی اظہار خیال کیا ہے اس سے صورت حال بہت صاف ہو جاتی ہے۔ جناب فاروقی نے اور جناب وہاب اشرفی نے اس مجموعہ کی شاعری کو جو بظاہر قطعات لگتے ہیں منی نظم یا رباعیوں سے بھی قریب تر بتایا ہے۔ ان عالموں کے سامنے میری کیا بساط ہے لیکن مجھے جو کچھ محسوس ہو رہا ہے اس کا اظہار کر رہا ہوں۔ مثلاً

دائرہ در دائرہ منظر بہ منظر کھول دے　　یا خدا فہم و ذکا ادراک کے در کھول دے
باب شہر علم کی دہلیز پر دامن کشا　　ایستادہ ہے گدا اس کا مقدر کھول دے

شاعر کے اس کلام کو پڑھنے کے بعد ذہن کی ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے اور دل اس کی اس دعا پر لرزش کرنے لگتا ہے۔ اللہ رب العزت کی ذات ہی میں تو وہ صفت ہے کہ اس کی بارگاہ تک ہماری صدا پہنچ کر قبولیت کا درجہ حاصل کر لے تو بندے کے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ یعقوب تصور کے اس شعری انداز میں نہ تو کوئی بوجھل پن ہے، نہ وہ رنگ وروغن جو بات کو سیدھے طور پر ہمارے دل کے آنگن میں اترنے نہیں دیتی بلکہ یہ وہ سادہ انداز ہے جو نہایت فطری ہے اور ہمارے اندر اظہار کی مکمل تصویر کو سامنے رکھ دیتا ہے۔ یا۔

جس قدر مانگے کوئی اس سے سوا دیتا ہے　　کوئی دیتا نہیں اس طرح خدا دیتا ہے
ایسا رزاق چرندوں کی شکم سیری کو　　تیز جھونکوں سے درختوں کو ہلا دیتا ہے

یہ شاعری بھی اللہ رب العزت کی عظمت اور اس کی ذاتی صفات کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتی ہے کہ ہم اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتے۔

اب ان کے نعتیہ قطعات دیکھیے۔

ہزاروں نعمتیں بخشی ہیں یہ انعام بھی لکھ دے
غلامانِ محمد مصطفیٰ ﷺ میں نام بھی لکھ دے
محمد ﷺ اور اہل بیت کا ہے چاہنے والا
مرے ماتھے پہ اے رضواں تو یہ پیغام بھی لکھ دے

یا۔

کہاں سے میں چلا تھا اور کہاں تک آ گیا ہوں
زمین سے اٹھ کے اوج آسمان تک آ گیا ہوں
مرے چاروں طرف ہے نور کی بارش مسلسل
محمد مصطفیٰ ﷺ کے آستاں تک آ گیا ہوں

اللہ رب العزت تک اپنی صدا پہنچانے کے بعد اللہ کے رسول سے عقیدت کا یہ اظہار وہ دولت ہے جسے ہر اہل ایمان اگر سمیٹ کر رکھے تو یہ دنیا اس کے تابع ہو سکتی ہے کہیں بھی بھاری بھر کم الفاظ نہیں۔ کہیں بھی وہ پیچ نہیں جو ہمیں ذہن پر بار دینے پر مجبور کرے لیکن ان راہوں میں گم ہونے والے مسافر نے جس طرح خود ہمارے اندر جذبۂ عقیدت بھر دیا ہے وہ ایک بیش بہا دولت ہے۔ ان کا یہ قطعہ دیکھیے۔

یوں اندھیرے ہوئے ہیں جزو حیات
ہر بشر روشنی سے ڈرتا ہے
اب خدا سے نہ کوئی کھائے خوف
آدمی آدمی سے ڈرتا ہے

یا یہ قطعہ دیکھیے۔

جیسے ہی باہر گیا گھبرا کے گھر میں آ گیا
خوف کا طوفان یہ کیسا نگر میں آ گیا
سمجھو اس کو مل گئی اک اور دن کی زندگی
جو پرندہ شام سے پہلے شجر میں آ گیا

ان دونوں قطعات میں وہ عصری حسیت اور حقیقت نگاری ہے جو نہ صرف یعقوب تصور کی شاعری کو بے حد اثر انگیز بناتی ہے بلکہ اس میں وہ آفاقیت ہے جس سے آج ساری دنیا لرزاں ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ دانش وروں نے اپنے علم و ادراک کا وہ صحیح جائزہ نہیں لیا اور اپنے اعمال سے باخبر رہے یا اپنی دانش وری میں گم۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ آج دنیا کو دانش وروں کی نہیں بلکہ دانش مند دانشوروں کی ضرورت ہے ورنہ دانش وری کا تکبر تو دنیا کو کہاں سے کہاں تک لے آیا ہے، اس سے سب واقف ہیں۔ غیر محفوظیت کا یہ احساس آج دنیا میں یکساں طور پر محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس لیے میں نے پہلے ذکر کیا کہ یعقوب تصور کی شاعری میں آفاقیت کا وہ پٹ ہے جو کسی شاعری کو بڑی شاعری کا درجہ عطا کرتا ہے۔

اب ذرا اس قطعہ کو دیکھیں۔

جفائیں یاد آتی ہیں ادائیں یاد آتی ہیں
بھلا دینا جسے چاہیں بہت آساں نہیں ہوتا
روابط منقطع کر کے تعلق ٹوٹتا کب ہے
یہ ایسا درد ہے جس کا کوئی درماں نہیں ہوتا

آگے بڑھیے۔

خطائیں در گذر کرنا بھلا ہے مانتا ہوں
عداوت کو عداوت ہی مگر گردانتا ہوں
کنارہ کر لیا ہے اس لیے لوگوں سے میں نے
کہ اب اس شہر میں ہر شخص کو پہچانتا ہوں

کامیاب تخلیق کا کمال یہ ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد آپ کو کانٹے کی چبھن کا احساس ہو۔ یعقوب تصور کی شاعری ایسی ہی شاعری ہے جس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور اس کے مختلف زاویوں کا وہ اظہار ہے جو نہ صرف ان

کی شاعری کو پڑھنے کے لیے آپ کو مجبور کرتا ہے بلکہ آپ کے اندر وہ احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ اس شاعری میں فن کے وہ تمام لوازمات شامل ہیں جو کسی شاعری کے بہترین ہونے کی علامت ہیں۔ میں نے ان کی تمام شاعری کا جائزہ نہیں لیا ہے بلکہ جستہ جستہ جو چیزیں ذہن میں آتی گئیں اور ہاتھوں کی گرفت میں بھی مضبوطی سے پکڑ میں آگئیں ان ہی کی روشنی میں اس کتاب کے بارے میں اپنا اظہار خیال کیا ہے، میں بہت کم ترین شخص ہوں اور میری کوئی بہت عالمانہ حیثیت نہیں پھر بھی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اپنے احساسات کو روک نہیں پایا اور شمس الرحمٰن فاروقی کی طرح میں بھی اس سے اتفاق رکھتا ہوں کہ یہ مجموعہ بہت کامیاب ہوگا۔ یہ ''انحراف'' یعقوب تصور کے اس مجموعے کو نہ صرف گہری معنویت عطا کرتا ہے بلکہ اپنے قارئین کو ذہین بنانے کی کوشش بھی۔

'خوب ہیں تیرے.....'

رئیس الدین رئیس (علی گڑھ)

خوب ہیں میرے شعر مگر   چپ کے لیے تھا بہتر میں

''آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے 'چپ' اختیار نہیں کی، ورنہ میں اپنے تصور کو سننے اور 'دیکھنے' سے محروم رہ جاتا۔''

جناب اقبال خسرو صاحب (مدیر 'دبستان' کڈپہ، آندھرا پردیش) کا شکریہ کہ انہوں نے ہربنس سنگھ تصور کے اشعار کے عاشقوں کی دل کی بات ان تک پہنچا دی۔ تصور صاحب کے 'خوب اشعار' سے حظ اٹھانے سے قبل آیئے ان کے تعارف سے مل لیں، جو انہوں نے 'دیوان غالب' سے فال نکال کر قلم بند کیا ہے:

''فنون لطیفہ سے 'عرض نشاط' کے پردے میں 'اک گونہ بے خودی' کی آرزو رکھنے والا میں ایک عام سا انسان ہوں، اور کم کہنے والا، کم چھپنے والا اور کم کم دکھائی دینے والا ایک شاعر کم نما۔

زندگی سے خوش ہوں، مطمئن ہوں اور تیار بیٹھا ہوں۔''

اس 'شاعر کم نما' کے بارے میں محترم جناب ستیہ پال آنند صاحب کا کہنا ہے کہ:

''ہربنس سنگھ تصور ملتے ملاتے نہیں۔ خط و کتابت سے دور بھاگتے ہیں۔ ایک گوشہ گیری ہی ایسا مشغلہ ہے، جسے نصف صدی سے وہ اپنائے ہوئے ہیں۔ شاعری نہ ان کا پیشہ ہے، نہ کل وقتی مشغلہ۔ وہ یا تو اپنے روز و شب کے تخلیقی کرب سے مجبور ہو کر نظمیں یا غزلیں لکھتے ہیں، یا اسی کرب کی لذت اور فرحت سامانی انہیں چند لمحوں کے لیے ہوش اور خردمندی سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ اس لیے ان سے سات سمندر پار بیٹھے ہوئے جب ایک دن مجھے 'صدا صد منظر' کا ایک نسخہ پہنچا تو میں.....''

کہ آ رہی دمادم صدائے کن فیکون۔

منظر دے بینائی دے   کاف اور نون دکھائی دے

کاف اور نون کے کہنے پر بھی   جو ہوتا ہے ہوتا کم ہے

از صد سخن پیرم یک حرف مرا یاد است۔

میں دکتور تصور ہوں   مجھے حروف اڑھائی دے

شب ہوئی، پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا۔

کوئی تو ایسا بھی منظر دے　　　جو اظہار کو اندھا کر دے

سردار ہربنس سنگھ تصور کی شاعری ایک ایسے گھر آنگن کی تصویر پیش کرتی ہے جس میں بولنے والے پیڑ اور پرندے کم ہیں لیکن سرگوشیاں کرنے والے گل بوٹے کیاری کیاری سنائی اور دکھائی دیتے ہیں۔ سرگوشیوں کے یہ سارے سر اور رنگ ہنس دھونی کی امانت ہیں۔ گھاس کی پتیوں پر دل بنے بیٹھے شبنم کے قطرے گہر ہونے کے کمال سے بے نیاز ہیں۔ منظر منظر فرصت اور فراغت اور تصور جاناں۔

فرصت کے رات دن اور اپنے 'کم کم' درشن کی وجہ سے وہ 'لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے' والے منظروں کو شاید زیادہ قریب نہیں دیکھ پائے (دریاؤں سے دور تصور صحرا صحرا پیاس لیے/اپنے بھاگ کے زہر سے ڈر کر مارا مارا پھرتا ہوں) لیکن 'ادب' انہیں بہت عزیز ہے اور وہ ادب کے اس مقام پر ہیں جس کے متعلق خدائے سخن کا کہنا ہے: عشق بن یہ ادب نہیں آتا۔

دھوپ کو سائے سائے رکھنا　　　بچپن کے دن یاد آتے ہیں

تصور ایک دور رس نگاہ رکھنے والے صاحب بصیرت شاعر ہیں، جن کی متوازن شاعری روایت اور جدت کی معتوب روش سے الگ ایک ایسی دلکش فکر انگیز اور بامعنی سخن سازی ہے جس میں شاعر کا ذاتی درد و کرب اور رو بہ زوال کائنات کا المیہ نیز اس کے مسائل بھی کچھ کارفرما نظر آتے ہیں۔ تصور کی زبان نہایت سادہ و سلیس لہجہ سبک و شیریں اور اسلوب جدت اور ندرت سے عبارت ہے۔ انہوں نے چھوٹی بحروں کو بڑا کر دیا ہے۔ چھوٹی بحروں میں کیونکہ لفظی کفایت شعاری Economy of Words سے کام لیا گیا ہے اس لیے یہ غزلیں علامتی اور استعاراتی مزاج رکھتی ہیں اور ان کے لفظی در و بست کے جھروکوں میں جھانکنے پر ہمیں فکر و خیال کے دیدہ و نا آفریدہ نت نئے جہان آباد نظر آتے ہیں، ساتھ ہی رمز و ایما اور اشاروں و کنایوں میں غیر معمولی تخلیقی قوت و کارکردگی کا احساس حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

باعتبار موضوع تصور کسی طرح کی مفلوک الحالی کے شکار نہیں نظر آتے، بلکہ وہ ایک ہمہ رنگ و ہمہ گیر کثیر الجہات اور متضاد و متنوع موضوعات کے شاعر ہیں۔ رومانیت، عصری حسیت، مذہبیت، اخلاقیت، تصوف، پاکیزہ خیالی، موت کا احساس جیسے قوس و قزحی رنگ ان کی شاعری کے آسمان سے جھلکتے اور زمین کو رنگین منظروں کا آئینہ دکھاتے نظر آتے ہیں۔ تصور اپنی ذات کے عمق میں غواصی کے عمل سے گزر کر حیات اور کائنات کے محرکات و مسائل کا عرفان حاصل کرتے ہیں۔ خارجی دنیا کی زوال زدہ قدروں اور معاشرتی زبوں حالی کے منفی حالات ان کی نگاہ حقیقت شناس سے اوجھل نہیں ہیں۔ وہ لفظی گھن گرج کے بجائے ایسے حقائق کو اشارتی اور دھیمے لہجے میں بیان کرتے ہیں۔ چند شعر درج ذیل ہیں:

بندے خاص خدا کے تھے　　　توڑ گئے جو کعبۂ دل

جتنے سیل بلا کے تھے　　　مجھ بے گھر کے پاس رہے

دنیا کی کوئی بھی قوم کیوں نہ ہو اگر اس کا تعلق دینی، تہذیبی اور اخلاقی قدروں سے منقطع ہوگا تو وہ قوم کبھی مہذب قوم نہ کہلا سکے گی۔ تصور نے اپنے گروں کی تعلیمات کو کلیجے سے لگا کر رکھا ہے، اور اخلاص و اخلاق اور حق و

ایمان کو اپنی شخصیت کا اٹوٹ انگ بنالیا ہے:

بعد میں اپنی رام کہانی — پہلے درد پرائے رکھنا

تو بھی کسی دن اے گل نرگس اپنے من کی آنکھیں کھول — اپنے سے کم تر پھولوں میں اپنے سے بہتر بھی دیکھ

محبت خدا ہے اور خدا محبت۔ ظہور کائنات کی بنیاد بھی محبت ہے۔ محبت ایک ازلی اور سدا بہار جذبہ ہے جو کم وبیش ہر دل میں پرورش پاتا ہے۔ محبت شاعری میں روح پھونک دیتی ہے اور شعر دل میں اتر جاتے ہیں۔ تصور نے بھی عشقیہ واردات اور حسن وجمال کی پیکر تراشی کے فن کو اپنی شاعری میں شعار کیا ہے۔ مانا کہ ان کا عشق، عشق مجازی ہے، مگر مائل بہ حسن تو یہ بھی ہوتا ہے۔ جب کوئی شاعر حسن کی تعریف کرتا ہے تو وہ تعریف اللہ کی تعریف ہوتی ہے، جسے حمد کا درجہ اس لیے حاصل ہے کہ حسن خواہ عورت کا ہو، پھول کا ہو یا چاند کا، وہ اللہ ہی کا تو پرتو ہے۔ تصور کے حسن وعشق کی خوشبو سے مہکے ہوئے اس قبیل کے اشعار میں سے ان کے 'مشتے نمونہ از خروارے' چند اشعار درج ذیل ہیں:

تیرے دھیان میں خوش ہیں بہت — ساتوں رنگ اداس مرے

تو آئے تو مجھ کو بھی — عید کا چاند دکھائی دے

آپ سے ملنا تھا مقسوم — عشق تو ایک بہانہ تھا

عشق نے چوم لیا وہ پتھر — جس پہ لکھا تھا نام تمہارا

تصور کی شاعری نظریہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مابعد الطبیعاتی متصوفانہ خوشبو سے بھی معطر ہے۔ ان کی فکر اولیا واصفیا کے صوفیانہ خیالات سے بڑی حد تک ہم آہنگ نظر آتی ہے:

ایک ہی سر کا زیر و بم ہے — سرگوشی سے بانگ جرس تک

آؤ کسی کے دھیان میں کھو کر — اپنے آپ کو ڈھونڈا جائے

آگ اور نور سے میں بھی اٹھوں — خاک سے جاگ لباس مرے

انہیں ہر لحظہ نئے پن کی تلاش وجستجو دامن گیر رہتی ہے۔ وہ ایسے نئے پن کے متلاشی ہیں جو انہیں حیرت میں ڈال دے اور جوش مسرت سے دیوانہ بنا دے۔ فرماتے ہیں:

میں سورج کو چھونا چاہوں — اس چاہت کو موم کے پر دے

تصور جو عرفان حقیقت کے جویا ہیں موت کی اٹل سچائی کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں:

یہ نہ خبر تھی دروازے پر — آخری ہوگی پہلی دستک

میرے اندر بھی بیٹھا ہے — اک پنچھی اڑ جانے والا

غرضیکہ تصور کا شعری مجموعہ 'صدا صد منظر' ایک معتبر اور گرانقدر تصنیف ہے۔ یہ مجموعہ بقول سلیمان اطہر جاوید 'بہت خوب ہے۔ بظاہر مختصر لیکن معنوی اعتبار سے وقیع اور تہہ دار۔'

چہ غم گر ہست اشعار اندک — نگویم تا نباشد نغز غالب

احتساب دل و جاں اور ساجدہ زیدی

ڈاکٹر نعیم السحر صدیقی (الہ آباد)

ساجدہ زیدی کو ایک خاتون شاعرہ یا ادیبہ کہنا شاید صدیوں سے چلی آ رہی فن کی روایت، اظہار کی آزادی اور محسوسات کی تہداری کو محدود کر دینے کے مترادف ہے کیونکہ فنکار محض فنکار ہوتا ہے اور اپنی استطاعت اور معیار کے مطابق زندگی اور کائنات کے متعلق غور و فکر کرتا ہے۔ وہ وہی بیان کرتا ہے جو وہ دیکھتا، سمجھتا اور محسوس کرتا ہے۔ ساجدہ زیدی کی استطاعتیں بھی لامحدود ہیں اور بذریعۂ تقریر و تحریر اپنے دور کو متاثر کر رہی ہیں۔ انھیں واضح طور پر انسانی ذات کی غرض و غایت دریافت ہے، جس کے لیے اپنی شاعری میں وہ روح کی ابتدا اور انتہا کا سراغ لگاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ کوشش اور دریافت انفرادی ہے اور کسی تحریک کی مرہون منت نہیں مثلاً اقبال کا یہ شعر ان پر صادق ہے:

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک　　　　نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

تو ساجدہ زیدی کی شاعری ان قید و بند سے اوپر اٹھ کر آزادانہ طور پر زندگی کا تعاقب کرتی نظر آتی ہے۔ وہ زندگی، محبت، معرفت اور نگاہ ان کے کلام میں ہمیں ملتی ہے جو آفاقی ہے اور خود اکتسابی ہے جسے ہر دور میں تخلیق کار محسوس کرتا رہا ہے جو کسی تحریک یا رجحان کے زیر اثر نہیں۔ ایسا میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ساجدہ زیدی انسانی ذات اور ممکنات کی تلاش میں تنہا ہی سرگرداں نظر آتی ہیں اور یہ تنہائی انہیں بھیڑ کا حصہ نہیں بننے دیتی، ان کی انفرادیت کو قائم رکھتی ہے جیسا کہ بیشتر آزاد نظم نگاروں کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے وجود سے بہت سارے سوال کرتی ہیں اور ان سوالوں کے پس پردہ ان کا جواب بھی مضمر ہے۔ مثلاً:

> ''مادیت کے اس بڑھتے ہوئے ریلے میں انسان روحانی آسودگی کہاں تلاش کرے؟ سستی تفریحات کی Vulgarity میں ذہنی غذا کہاں سے حاصل کرے؟ مجہولیت کے ریلے میں معنویت کی آرزو کہاں جائے؟ جنگ پرستی کے اندھیروں میں روشنی کہاں سے آئے؟ اہل اقدار کی ریشہ دوانیوں، اہل سیاست کی بے حسی، اہل زر کی نا انصافیوں سے نجات کا راستہ کہاں تلاش کرے؟ اس عرصہ گاہ حیات میں حسن، خیر اور صداقت کی آرزو کے بغیر انسانی عمل کی مکافات کہاں ہے؟ کیا ہم.... جن کو مشیت نے تخلیقی حسن و خیر کا منصب بخشا ہے، اس سماج کو اشتہاروں کی بے معنویت اور تجارتی بالادستی کی بے روح یلغار میں کھو جانے دیں....؟''

اپنے مجموعے ''پردہ ہے ساز کا'' کے مقدمے میں وہ اکثر جگہوں پر اپنی شاعری کی تشریح خود کرتی نظر آتی ہیں، شاید ایسا اس لیے ہے کہ ان کی شاعری کو انفرادی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور نسائی شاعری کہہ کر پس

پشت ڈال دیا گیا جس کا اعتراف وہ اپنے مجموعے ''پردہ ہے ساز کا'' کے مقدمے میں اس طرح کرتی ہیں اور بجا طور پر کرتی ہیں کیونکہ سماجی تنگ نظری کے ختم ہونے کے آثار اکیسویں صدی میں بھی نظر نہیں آ رہے ہیں:

''مرد نے روایتاً عورت کو یا جنسی تسکین کے منفعل معروض کی حیثیت سے یا معشوقانہ اداؤں کے آئینہ میں دیکھا ہے..... یا حالیہ برسوں میں تانیثیت، نسائی حسیت اور تانیثی احتجاج وغیرہ کے فارمولے تراشے ہیں، اس کی شاعری کی سرسری تفہیم کے لیے.....عورت کو شاعری کے حوالے سے ایک مکمل، باشعور، ہمہ جہت، تخلیقی وجود کی طرح نہ مردوں (اور مرد نقادوں) نے کبھی دیکھا نہ اس کی کوشش کی ہے، نہ وہ اس کے اہل ہیں.....پھر اس سطح کی شاعری پر وہ کیا لکھیں؟.....کیوں لکھیں.....؟ اور کیسے لکھیں.....؟ اس سے Old-Age مفروضوں پر گہری ضرب پڑتی ہے.....اس مسئلہ کی نفسیاتی جہت بھی ہے ایک..... تانیثی احتجاج کی حد تک تو عورت کا منفعل وجود قائل رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر انفرادیت کا اعتراف مرد کی برتری پر ضرب لگا سکتا ہے.....چیلنج بن سکتا ہے۔''

اس طرح سے صرف مرد تخلیق کار ہی شاہکار تصنیفات پیش کر سکتے ہیں، اس کی تردید ہوتی ہے۔ بدلتے دور میں عورت کو اس کے انفرادی اور طاقت ور وجود کے ساتھ قبول کرنا ہی ہوگا کیونکہ اب تعلیمی معیار ہی کھرے کھوٹے کی پہچان بنے گا۔ خواتین کو جس پلیٹ فارم اور جن مشاہدات سے محروم رکھا گیا وہ اب انھیں میسر ہوں گے۔ صدیوں سے یہی ہوا کہ ان کی صلاحیتوں کو خانہ داری کی ہنر مندیوں کے لیے وقف کر دیا گیا لیکن جہاں کہیں انھیں مواقع ملے ان کی صلاحیتیں بروئے کار آئی ہیں۔ ہمیشہ سے یہی دیکھنے میں آیا کہ مردانہ سماج نے حکومت اور منفعت کے سارے حقوق اپنی ذات سے مخصوص رکھے۔ لیکن تعلیمی معیار نے خواتین کو بیداری اور شائستگی دونوں ہی میں سرفراز کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، جیلانی بانو، صغرا مہدی، زاہدہ حنا کے علاوہ پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شیر، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، ترنم ریاض، نگار عظیم، ثروت خان وغیرہ نے اس کی بڑی مثالیں پیش کی ہیں اور یہ بھی کہ خواتین نے اکثر مذہبی رواداری اور جذباتیت کے تحت اپنے متعلق کی جا رہی ناانصافیوں کو برداشت کر کے مردانہ سماج کی ہمت افزائی کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک خواتین خود اپنے پس ماندہ حالات سے بغاوت نہیں کریں گی، محض ان کے مسائل سے متعلق موضوعات پر کتابیں لکھنے سے اس کے حالات بہتر نہیں ہو سکیں گے، بشرطیکہ یہ کوشش مثبت سمت میں ہو۔ یعنی کہ بہت سی مصلحتوں کے تحت خواتین کو گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے لیکن جہاں جہاں اسے آزادی میسر ہے وہاں اس کی تابناک شخصیت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ واقعی آج اس بات کی ضرورت ہے کہ مرد اور خواتین دونوں ہی اپنے عمل اور ردعمل کا محاسبہ کریں اور نیک نیتی سے اس کا اظہار بھی کریں۔ یہاں ایک بات یہ کہنے کی ہے کہ ساجدہ زیدی نے اپنے مقدمے میں یہ بات کہی ضرور ہے کہ تانیثیت کے تحت ان کی شاعری کو وسیع النظری سے سمجھا نہیں گیا، اور ان کی اہمیت کے اعتراف میں کوتاہی برتی گئی لیکن ان کی شاعری میں مردانہ سماج سے بغاوت کے اشعار نہیں ملتے، بلکہ یہ ایک شائستہ اور متوازن شاعری ہے اور انھیں وہ فنی اور فکری بصیرت حاصل ہے جو ایک تخلیق کار کے لیے لازم ہے۔

''پردہ ہے ساز کا'' مجموعے میں ''ہماری روح کا نغمہ کہاں ہے''، ''وہی اذان حق کا سلسلہ ہے''، ''سفر زیست کا استعارہ ہے''، ''وہ عشق جو ہم کو لاحق تھا''، ''اک سوال خدائے برتر سے''، ''کہو تم کن ہواؤں کے پرندے تھے''، ''زندگی تو سوالوں کی زنجیر ہے''، ''وقت کی رہ گزر پر'' اور بہت سی نظمیں قابل ذکر ہیں جن میں زبان و بیان کا حسن اپنی نیرنگیاں دکھاتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم ''وقت کی رہ گزر پر'' جو خیالات اور جذباتی وابستگی کا ایک طویل تسلسل ہے اس کے چند اشعار یہاں پیش ہیں جو زندگی کی تفہیم کا ایک جزو بن کر سامنے آتے ہیں:

ہجر ایک لفظ لا انتہا ہے

عشق اک جذبۂ بیکراں ہے

وصل محبوب سے ماوراء ہے

غم زندگی جاوداں ہے

غم آرزو جاوداں ہے.....''

اپنی نظم ''فردوس برروئے زمیں'' میں کشمیر کی سرزمین کے درد کو محسوس کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

کون اہل سیاست سے پوچھے

کہ اس ظلم و جور و تشدد سے کب تک

حسیں مرغزاروں کا سبزہ

لہو رنگ روتا رہے گا

بے نواؤں کے جسموں کا سونا

سیاست کے دوزخ کا ایندھن بنے گا

اسی طرح گجرات اور افغانستان کے درد کو محسوس کیا ہے اور ''نسل کشی'' (گجرات کے شہیدوں کے نام)، ''یہ صحرائے عرب ہے'' (حصہ اول اور حصہ دوم) ''مغرب کے خداؤں نے''، ''چھ نظمیں، چھ کردار'' جیسی نظمیں سیاسی مسائل پر لکھی ہیں جو نسل انسانی کے پرسوز حالات سے واقف کراتی ہیں۔ ''نسل کشی'' کے یہ اشعار دیکھئے:

عجب عیار، دہشت گرد، قوت کی خدائی ہے

کہ مجبوروں پہ دنیا تنگ ہے،

دریائے خوں میں ڈوبی ہیں

ان کی تقدیریں!

لہو انسان کا ارزاں ہے

بازارِ سیاست میں

فقط بارود کی قوت کا سکہ چل رہا ہے

نظم ''چھ نظمیں، چھ کردار'' جس میں ''گجرات کی انسانیت سوز نسل کشی سے برباد شدہ چند زخمی روحوں کے نالے'' ہیں انسانی رشتوں کے قتل کی پرسوز عکاسی، جذباتیت اور ردعمل کی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس میں خواتین کے اس

المیہ کی عکاسی ہے جس میں وہ اپنے عزیزوں کی لاش پر نوحہ کناں ہونے کے لیے زندہ چھوڑ دی جاتی ہے۔ اس نظم کے مختلف حصوں میں اس عورت کے جذبات ہیں جو ایک ماں، بہن، بیوی، کنبے کی ایک اہم کڑی اور فرد ہے، جذبات کا مجسمہ ہے۔ جس کی زندگی وحشی حالات کا شکار ہونے والی ہے:

آہ!.....لیکن وہ ہٹلر کے چیلے انھیں کھا گئے
مری زندگی کا اثاثہ.....
سیاہ کار، اندھی سیاست کا لقمہ بنا.....
میری آنکھوں میں آنسو نہیں
جلتی چنگاریوں کا دھواں ہے
مری کوکھ میں رماتمگ میں
راکھ ہے
نگاہوں کے آگے خلاء ہی خلاء ہے
یہی اجڑی بستی مری داستاں ہے.....

لیکن ساجدہ زیدی نے بہ خوبی اور واضح طور پر زندگی کے اس گداز گوشے کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے جسے محبت کہتے ہیں جو زندگی کے درد و داغ و سوز و ساز کی بناہ ہے، جو ایک خوشحال زندگی کا ترانہ ہے اور اس وقت کو بھی جو دریائے پرشور کی طرح بہتا چلا جارہا ہے۔ اس وقت کی بے نیازی اور سفا کی کو تمام پرفکر تخلیق کاروں نے محسوس کیا ہے اور اس کا فنکارانہ اظہار بھی کیا ہے۔ اپنی نظم ''محبت'' میں، جس کے لیے انھوں نے لکھا ہے کہ یہ افکار جلال الدین رومی سے اخذ کیے گئے ہیں لیکن بلاشک وشبہ اس میں ان کی شاعرانہ صلاحیت بھی بروئے کار آئی ہے، لکھتی ہیں:

یہ روحوں کی شناسائی ہے
یہ دو آزادیوں کا میل ہے
یہ اشتراک آرزو ہے.....یا
.....دیار آرزو میں
گھڑی بھر ساتھ چلنے، زندگی بھر ساتھ رہنے
کا تقاضا ہے.....
یا.....شبستان وفا میں
شمع دل کے ساتھ جل جانے کا وعدہ ہے.....

مجموعی طور پر ان کی شاعری انسانی جذبات ومحسوسات، محبت کے درد و داغ، معنوی تہہ داری، عصری مسائل، انسانی کسم پرسی اور رنج ومحن سے روبرو کراتی ہے جس میں نئے زمانے کے مسائل اپنے سوالوں کا کشکول لے کر کھڑے ہیں، زندگی کے وہ پہلو جنھیں آج فیشن کا خوبصورت جامہ پہنا دیا گیا ہے لیکن جن کے پس پردہ ایک عفونت ہے۔ ''سفر زیست کا استعارہ ہے'' ایک قابل ذکر نظم ہے۔ اس کے اشعار اپنے اندر رجائیت کا مثبت پہلو، زندگی کا گہرا

ربط اور معنویت رکھتے ہیں، مثلاً ان میں اظہار بیان کا انوکھا انداز نہ صرف قابل دید بلکہ امکان غور وفکر بھی ہے:

شہ راہ امکان میں
ایک موہوم سی روشنی
جھلملا کر عجب چشمکیں کر رہی ہے....
دیکھ......
اس روشنی کا تجھے کیا اشارہ ہے
شاید.....
سفر زیست کا استعارہ ہے
شاید.....
سفر زیست کا استعارہ ہے......
خوئے سفر
میان وجود و عدم
تلاش حقیقت کا پل ہے

ساجدہ زیدی کی شاعری، جس میں فن کی پاسداری، معنویت کی آرزو اور جنگ پرسی کے اندھیروں میں روشنی کی تلاش ہے، زبان و بیان کی خوبی کے ساتھ صدیوں سے جاری تلاش حقیقت کی ایک اہم کڑی بن گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کے دور میں یہ تلاش مفاد پرستی کی نذر ہو گئی ہے لیکن اعلیٰ درجے کی شاعری ہر دور میں وجود میں آتی رہی ہے اور انسانی زندگی کو روحانی آسودگی اور ذہنی وژن فراہم کرتی رہی ہے، ساجدہ زیدی کی شاعری ان بصیرتوں کی اہل ہے۔ یہ شاعری ان مسائل کے بارے میں سوچنے پر مائل کرتی ہے جن سے نئے زمانے کا عام اور خاص انسان متصادم ہے اور جو متصادم نہیں ہے اس کے لیے روحانی آسودگی کے فقدان کا جو مسئلہ ہے یعنی سب کچھ حاصل کر لینے کے بعد بھی ایک کمی کا احساس اس کی زندگی میں باقی ہے، اس احساس کی بھی ایک فلسفیانہ بصیرت ہمیں ساجدہ زیدی کی شاعری میں ملتی ہے۔ آج افراتفری کے دور میں ایسی مفکرانہ اور گہرائی و گیرائی کی شاعری کم ہی دیکھنے کو مل رہی ہے۔

ان کی شاعری میں کچھ باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں مثلاً روح کے نغمے کی تلاش، تنہائی میں یادوں کا آورد، انسانی قدروں کی تحقیر اور استحصال کا ہیجان، وقت کے بہاؤ میں زندگی کے حسین لمحوں اور یادوں سے بچھڑ جانے کا احساس، فن کی پاسداری کا خیال، زبان و بیان کا حسن وغیرہ۔ یہ ساری باتیں قصداً نہیں ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ہمارے کانوں میں سرگوشی کر رہا ہے کہ ''کیا ایسے بھی کبھی سوچا ہے۔'' یعنی جب وہ خود کا احتساب دل و جاں کرتی ہیں تو کچھ اس طرح سے ان کا کلام بصیرت کی روشنی بکھیرتا ہے:

.....نہ جانے کیا مرا آغاز تھا.....
انجام کیا ہے.....
کیوں مری ہستی

لرزتا قطرۂ بے مایہ ہے
اس بحر موجودات کے بہتے خزانے میں
میں کیوں.....
اک ذرۂ ناچیز کی مانند
سرگرداں ہوں.....دشت کالعدم میں
کیوں مرا مقسوم ہے.....مٹنا فنا ہونا؟

اور اس کے بعد یہ نتیجہ نکالنا شاید انسانی صلاحیتوں پر اعتبار کرنا ہے کہ:

میں شاید.....
انفس و آفاق کے سر نہاں میں
خود بھی شامل ہوں
اسی اسرار کا ایک جز ولاینفک ہوں،
اک ذرہ ہوں
لیکن.....وسعت صحرا کی حامل ہوں

(جستجو ذات کی)

اور یہ حقیقت ہے کہ اس ذرے کے بغیر انفس و آفاق کی تکمیل نہیں ہو سکتی، انسانی ذات کی خلاء کو پر کرنے کے لیے دونوں جہاں کی وسعت درکار ہے، اور اس فقدان کے باعث ہی انسانی روح حیران اور سرگرداں ہے لیکن مادی مسائل نے اس کے قدموں کو بیڑیوں میں جکڑ دیا ہے جس کے باعث انسان تادم زندگی مصلحتوں کا شکار ہے اور جب تک زندگی کے یہ تقاضے اور قید و بند ہیں، حساس دل شاعر اور فنکار شعر و ادب کی تخلیق کے ذریعہ فطرت کے رموز کو آشکار کرنے اور کائنات کی منفی قدروں پر ضرب لگانے کی کوشش کرتا ہی رہے گا اور اسی طرح فن اور اقدار کا تسلسل برقرار رہے گا۔

گھڑی کی سوئیاں دیکھنے والا

رئیس انور (دربھنگہ)

بہار کے کئی ایسے قابل قدر فنکار ہیں، جنہوں نے ایک عرصے تک اپنی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور ادبی دنیا سے داد تحسین حاصل کی لیکن اپنی تخلیقات کو مجموعی صورت میں پیش کرنے پر توجہ نہ دی، جس کی بنا پر ان کی فنکاری کے حسن وقبح پر بھر پور گفتگو نہ ہوسکی۔ افسانہ نگاری کے تعلق سے نسیم محمد جان بھی اسی زمرے میں ہیں۔

نسیم محمد جان اردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ وہ کم وبیش چالیس سال سے لکھ رہے ہیں اور اہم رسالوں میں چھپ بھی رہے ہیں مگر ان کے افسانوں کا انتخاب ''گھڑی کی سوئیاں'' ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ انہوں نے اس زمانے میں اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا جب اردو ادب میں جدیدیت کے نام پر آندھی آئی ہوئی تھی اور بنے بنائے سانچوں پر فرسودگی کی چھاپ لگا کر انوکھے نمونے وضع کیے جارہے تھے پھر یہ فیشن پرستی کا دور بیتا اور اعتدال پسند تخلیق کاروں نے جدیدیت کی اصل جہتیں واضح کیں۔ نسیم محمد جان کی تخصیص یہ ہے کہ وہ جدیدیت کے ابتدائی شناختی عناصر واوصاف لایعنی تجریدیت، انوکھی علامت پسندی، ناقابل فہم اشاریت اور غیر ضروری ابہام سے بچے رہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ نئے رجحان یا نئی تحریک سے دور رہ کر ایک بنے بنائے ہموار راستے کے مسافر ہیں۔ انہوں نے واضح لفظوں میں لکھا ہے:

> ''ادب کا تخلیق کرنا ایک انفرادی فعل ہے۔ ادیب کا کسی باہری دباؤ میں آنا مناسب نہیں ہے۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ نئی تحریک، نئی تکنیک اور نیا رجحان ادب کے میدان کو وسیع کرتا ہے جس سے تخلیق کار کو فائدہ پہنچتا ہے۔'' (صفحہ ۱۰)

نظر کی یہی وسعت اور فکر کی یہی پختگی نسیم محمد جان کے تخلیقی سفر کی رہبر ہے۔ وہ مثبت مزاج کے مالک ہیں اس لیے بڑے اعتماد کے ساتھ انفرادی سوچ کے پھاٹک کھلے رکھتے ہیں اور باہر کی تازہ ہوا سے تقویت حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بنیادی اہمیت نفس قصہ کی ہے۔ اسی کے تقاضے کے تحت ان کا فنکارانہ ذہن کام کرتا ہے اور ایک فطری لائحہ عمل مرتب کرتا ہے۔ جس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے کا کہانی پن برقرار رہتا ہے۔ جید نقاد پروفیسر محمد حسن نے ان کے افسانوں پر رائے زنی کرتے ہوئے ایسی ہی خوبیوں کی بنا پر انہیں اردو ادب میں ''تیسری آواز'' کے نمائندوں میں شمار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''نسیم محمد جان کے افسانہ 'چکر' اور بعض دوسری کہانیوں میں بھی یہ آواز بڑے تیکھے پن اور حسن کارانہ کیفیت کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ کہانی کی خوبصورتی اور لطافت اپنی آپ نظیر ہے۔'' (فلیپ، گھڑی کی سوئیاں)

نسیم محمد جان اپنا مواد آس پاس کے ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ یوں تو ہر فنکار کے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے اور اس کی داخلی شخصیت اتنی حساس اور بیدار ہوتی ہے کہ مواد حاصل کرنے کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔ کوئی مشاہدہ، کوئی تحریر یا کوئی بات اس نازک اور حساس شخصیت سے ٹکرائی کہ ایک نا ختم ہونے والی جھنجھناہٹ پیدا ہوگئی پھر دھیرے دھیرے یہ جھنجھناہٹ آہنگ اور صورت کے مراحل طے کر لیتی ہے۔ کچھ عجیب اور محیر العقول ہیں یہ تخلیق کے غیر محسوس مدارج! ہر فنکار اپنی ذات کے اندر اس آگ کے دریا سے گذرنے پر مجبور ہے اور باطنی تشکیل کے بعد اس کے ظاہری اظہار پر بھی لاچار ہے کہ تکمیل فن کا یہ آخری مرحلہ ہے۔ نسیم محمد جان نے کس سادگی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے:

> "کبھی اخبار کی چھوٹی سی خبر، کبھی کسی کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ، کبھی کوئی مشاہدہ، کبھی کوئی تجربہ کہانی کو جنم دیتا ہے پھر جس طرح ایک بیج سے بڑا درخت بن جاتا ہے ٹھیک اسی طرح اندر ہی اندر کہانی بن جاتی ہے۔" (صفحہ ۱۰)

'گھڑی کی سوئیاں' میں موجود افسانوں اور افسانچوں کے مطالعے سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ان کے مواد میں خاصا تنوع ہے۔ عورت کی ممتا، مادہ اور روح کا ٹکراؤ، قانون کا کھوکھلا پن، سماجی نظام کے نقائص، سیاست کی بالا دستی، شہر کی مصروف زندگی کا اکہرا پن، اسمگلنگ، پولیس کی کارستانیاں، بکاؤ مال کی بہتات، ملازمت کے مرحلوں میں دھاندلی، ملازمت کے ساتھ کھلواڑ، تقسیم ملک کی ستم ظریفیاں، کمیشن خوری، باطل کی بالا دستی نیز ظاہر اور باطن کی آویزش وغیرہ ایسے موضوعات ہیں، جو نسیم محمد جان کے ذہن و شعور کو کئی سطح پر جھنجھوڑتے ہیں۔ لیکن ان کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنے وجود میں پیدا ہونے والے تناؤ کو تخلیقی رنگ و آہنگ دے کر ایسے مثالی فن پاروں میں ڈھال دیتے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری حیات و کائنات کی ناہمواریوں سے نہ صرف آگاہ ہوتا ہے بلکہ ان کی پیش کش کے فنکارانہ پہلوؤں سے محظوظ بھی ہوتا ہے۔

نسیم محمد جان کوئی لیک پکڑ کر چلنے والے افسانہ نگار نہیں ہیں۔ وہ موضوع و مواد کے تقاضوں کے مطابق تکنیک استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بیانیہ بھی ہے، محض مکالمہ بھی ہے، تجرید بھی ہے، ابہام بھی ہے اور علامت بھی مگر سب کچھ حد میں ہے اور گوارا ہے۔ واقعہ نگاری میں ان عناصر سے دلچسپی بھی پیدا ہوئی ہے اور تہہ داری بھی آئی ہے۔ اسی لیے ہر جگہ کہانی پن موجود ہے۔ بسا اوقات چھوٹے چھوٹے جملوں سے طنز آمیز انداز میں تلخ سچائیوں کا انکشاف بھی کیا ہے۔ ایسے تیکھے اور چبھتے ہوئے جملے بین السطور میں ملتے ہیں کہ جب تک ان پر غور نہ کیا جائے ان کی معنویت سے لطف اٹھانا ممکن نہیں۔ کہیں کہیں یہ بے جوڑ اور غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل یہ افسانہ نگار کی تکنیک کا حصہ ہیں۔ ایک ہوشیار اور زیرک فرد جس طرح تاک میں رہتا ہے کہ ذرا موقع ملے اور وہ اپنی بات کہہ دے، اسی طرح نسیم محمد جان اپنے افسانوں میں موضوع سے الگ بھی بہت سی کھری باتوں کو بیچ بیچ میں ٹانکتے جاتے ہیں۔ یہ ان کی بڑی کامیاب ٹیکنک ہے۔ اس سے موضوعاتی فضا کا دائرہ پھیلتا ہے اور رنگ کچھ اور نکھر جاتا ہے۔ ذیل کے جملے دیکھیے:

> "دیر تک سونا۔ یا جاگنے کے وقت سونا اور سونے کے وقت جاگنا، شاید مہذب ہونے کی چند علامتوں میں سے ایک ہے۔" (ص ۵۹)

''نچلے درجے کے مسافروں اور سامانوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔''

(ص ۶۹)

''کوئی اخبار کا رپورٹر اس گاڑی سے سفر نہیں کرتا کیا؟ ہو سکتا ہے سب کے سب کسی ہوٹل میں کھانے پر مدعو ہوں۔'' (ص ۷۰)

(جرمن کے متعلق) ''یہ لوگ کبھی قلی نہیں کرتے، شاید ان کا ہر فرد اپنا بوجھ خود اٹھانے کے حق میں ہے.... ہمارے یہاں تو لوگ مہینہ کے آخر میں قرض لیتے ہیں مگر سفر میں سامان قلی کی مدد سے ہی ٹرین سے اترتا اور چڑھتا ہے۔'' (ص ۸۴)

''رام بابو بیوٹی اسٹور والا کہتا ہے مرکری کی روشنی میں دو نمبر کا مال بھی ایک نمبر میں نکل جاتا ہے۔'' (ص ۱۲۱)

اس مجموعے کے کئی افسانے بہت عمدہ ہیں۔ گھڑی کی سوئیاں، چکر، ریت کی دیوار، کھڑکی کا پردہ، ایک گھنٹے کا آدمی، کمپارٹمنٹ کے باہر، شام کے بعد واپسی، آدم خور، لاش وغیرہ میں موضوع کے ساتھ افسانہ نگار کا تخلیقی برتاؤ قابل دید ہے۔ خاص کر 'گھڑی کی سوئیاں' میں موضوع کی علامتی پیش کش اسے شاہکار بناتی ہے۔ اس افسانے میں گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز اس زندگی کی علامت ہے جو بظاہر ارتقا پذیر اور متغیر معلوم ہوتی ہے مگر گھڑی کی سوئیوں کے نہ بڑھنے کی طرف بار بار متوجہ کر کے کہانی کار نے یہ منکشف کیا ہے کہ یہ زندگی اور سماج کی ترقی اور تبدیلی محض ظاہری ہے۔ اصلاً اس میں ایک نوع کا جمود اور ٹھہراؤ موجود ہے جو مہابھارت کے دور سے آج تک یکساں ہے۔ طاقتور کا ظالم اور کمزور کا مظلوم ہونا، دھوکا اور فریب میں عام لوگوں کا شکار ہونا، اغوا، چوری، سماج کے نام نہاد کرتا دھرتا کا بول بالا، سرکاری نوکروں کا طمطراق وغیرہ سماج کی ایسی کھری سچائیاں ہیں جو ٹک ٹک کرتے زندگی کے بھاگتے لمحوں کے باوجود گھڑی کی سوئیوں کی طرح اپنی جگہ ٹکی ہوئی ہیں۔ ان سے چھٹکارا پانا شاید انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

اس خوبصورت کہانی میں سماج کی ان مکروہ سچائیوں پر بڑی مہارت اور چابکدستی سے دھیمی دھیمی شعاعیں ڈالی گئی ہیں اور بیچ بیچ میں گھڑی کی سوئیوں کے آگے نہ بڑھنے کا طرف دھیان دلا کر تمام واقعاتی شعاعوں کو ایک علامتی سرچشمے سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ وصف تکنیکی اعتبار سے ایک دلچسپ تفہیمی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے اور کہانی کو مسرور کن تاثیر بھی بخشتا ہے۔

افسانہ 'راکھ تلے' میں عورت کی یہ نفسیات پیش کی گئی ہے کہ عورت بوجوہ مرد سے بیزار بھی ہو تو ممتا کے اپنے فطری جذبے کو چھپا نہیں سکتی۔ اسی طرح 'ریت کی دیوار' میں ممتا کا ایک انوکھا روپ پیش کیا ہے کہ اپنی کوکھ سے جنمے بچے کے لیے ایک عورت ہر طرح کا ظلم وستم برداشت کر سکتی ہے۔ اپنا مادی اور جسمانی تعلق بھی داؤں پر لگا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتی۔ عورت کی ممتا کی دوسری تصویر 'ڈائن' میں ملتی ہے۔ جس میں ایک عورت کی حد درجہ شفقت اور ایثار سے سوتیلا بیٹا اپنا بن جاتا ہے۔ 'ایک مہینہ۔ پندرہ منٹ' میں انسان کی بھرپور مادی ترقی سے پیدا ہونے والے بحران اور کھوکھلے پن کے طنز آمیز Flashes دکھائے گئے ہیں جو خانگی معمولات، تہذیب، اخلاق اور مذہب کے حوالوں سے ابھرے ہیں۔ ترقی پذیر زندگی میں ہر عمل دھوکا، فریب اور دوہرے پن سے بھرا ہوا

ہے جس کے پیچھے مادی آسودگی اور منفعت کا شیطان مسکراتا ہے۔ اس کہانی میں چھوٹے چھوٹے واقعاتی ٹکڑوں کو مکالموں کے ذریعے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ایک موضوعی لڑی میں پرو دیا گیا ہے۔ مکالموں سے ابھرنے والا منظر بڑی تیزی سے بدلتا ہے مگر تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی انحطاط کی قدر مشترک ہر جگہ موجود ہے۔

'سمجھوتہ' آج کی دفتری زندگی کی ایک سچی اور سنجیدہ کہانی ہے۔ اس میں موجودہ ہندوستان کا وہ پورا سسٹم نظر آتا ہے جو چپراسی سے شروع ہو کر صاحب پر ختم ہوتا ہے۔ اور درمیان میں کلرک، چھوٹا بابو اور بڑا بابو ہوتے ہیں۔ ہر کام ان کی آپسی Understanding، شراکت اور ساجھے داری سے ہوتا ہے جس میں وہ رقم مرکزی حیثیت رکھتی ہے جسے پوری دیانتداری سے بہ اعتبار عہدہ بانٹا جاتا ہے۔ سسٹم کا کوئی بھی فرد اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اگر الگ ہونے کی کوشش کرے تو بہت جلد اسے سبق سکھا دیا جاتا ہے:

''اپنی نظروں سے گر جانا سماج کی نگاہوں میں ذلیل ہونے سے یقیناً بہتر ہے۔

پیسے کماؤ۔ پیسہ ہی بیسویں صدی کا بھگوان ہے۔ اگر پیسے نہ ہوں گے تو بھگوان کیا کتے بھی نہ پوچھیں گے۔'' (صفحہ ۴۰)

موجودہ تیز رفتار زندگی اور خوشحال سماج میں اس تلخ سچائی سے مفر نہیں۔ اس لیے کہانی میں اس سسٹم سے بیزار اور الگ تھلگ رہنے والا کردار بھی تھک ہار کر ضمیر اور خودداری کا ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ کہانی کار نے مختصر جملوں سے ایک دلکش اشاراتی دنیا آباد کی ہے۔ رشوت خوری کے مضبوط اور متوازی نظام کا پردہ فاش کیا ہے اور درمیان میں مرکزی کردار کی باطنی کشمکش کی جھلکیاں بھی دکھائی ہیں۔

اس سسٹم کا ایک اور رخ کہانی 'گرداب' میں سامنے آیا ہے۔ اس میں کالج کے بابوؤں کی کارستانی پر نظر ڈالی گئی ہے۔ دو ایک کہانیاں ایسی بھی ہیں، جن میں ضمنی طور پر بدعنوانیوں کے پھیلے ہوئے مہلک جراثیموں کا ذکر ہے۔ 'سیلاب' بھی ایک اچھی کہانی ہے۔ اس میں سیلاب سے آنے والی تباہیوں کا مشاہدہ پیش کیا گیا ہے اور اس پس منظر میں گاؤں کے کرتا دھرتا کی انسانیت سوز حرکتوں کا بہت موثر احاطہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سماج کے بنے بنائے سانچے کو توڑنے اور اس کا متبادل ڈھونڈنے کی بات بھی سامنے آتی ہے کیونکہ اس سانچے کو انسان دشمنی، خودغرضی اور مالی منفعت دیمک کی طرح چاٹ چکی ہے۔ کہانی کار کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو مشاہدے کی تفصیل کے بیچ بیچ میں چپکے چپکے ابھارتا ہے۔ جیسے اندھیرے کمرے میں کچھ چنگاریاں، پھوٹیں پھر روشنی کی دو چار لکیریں بن کر قاری کے ذہن و نگاہ میں بس جائیں۔

موجودہ سماج کی جکڑ بندی میں ایک آدمی کس طرح لاچار ہے، اس کی عمدہ عکاسی 'چکر' میں ہوئی ہے۔ آدمی اس دوڑ بھاگ والی زندگی اور دکھاوے کی خوشحالی سے نکل کر مستقبل کی کوئی منزل متعین کرتا ہے اور مصنوعیت کو دامن سے جھٹک کر سچی آسودگی کے خواب دیکھتا ہے تو اسے کبھی ماضی کے سنہرے دور کی جھلک دکھائی جاتی ہے اور کبھی حال میں ایسا الجھا اور چکرا دیا جاتا ہے کہ اس کے اوسان خطا ہو جائیں اور وہ تھک ہار کر موجودہ مشینی سماج کا ایک پرزہ بنے رہنے ہی میں عافیت محسوس کرے۔

نسیم محمد جان گھڑی کی سوئیوں (وقت) پر گہری نظر رکھنے والے کہانی کار ہیں۔ وہ اس کی بدلتی چالوں کے مشاہد بھی ہیں اور محتسب بھی۔ وہ وقت اور ماحول کے تال میل کا اثر اپنے اردگرد کے آدمی میں ڈھونڈ نکالتے ہیں اور اسی کھوج بین کو حیات اور کائنات کے وسیع قرطاس پر بڑی مہارت سے بکھیرتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر کسی تحریک یا ازم سے کبھی وابستہ نہیں ہوئے۔ غیر شعوری طور پر عصری رجحان سے ہلکا پھلکا اثر لینا الگ بات ہے۔ لہٰذا فکر و فن کی کشادہ، خوشگوار اور صاف فضا میں ان کے تجربے کہانی کا روپ دھارتے ہیں۔ متنوع موضوع و مواد کے ساتھ ان کا فنکارانہ برتاؤ، پیش کش کی تکنیک اور زبان و اسلوب اس کے غماز ہیں۔ اسی تخلیقی رویے سے اردو افسانے کی قلمرو میں انہیں ایک اچھا اعتدال پسند کہانی کار قرار دیا جائے گا۔

آزاد قیدی..... آزاد سوچ کی عکاس

ڈاکٹر ریاض توحیدی (سری نگر)

تخلیق کار کی انفرادیت کو قائم کرنے کے سلسلے میں قوت تخیل، وسعت فکر اور منفرد اسلوب بنیادی چیزیں ہوتی ہیں۔ ان لوازمہ کے تناظر میں "آزاد قیدی" کے سحر طراز افسانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعہ کے خالق فیصل نواز چودھری (اوسلو، ناروے) تخیل کی بلندی، فکر کی وسعت اور دلنشین اسلوب کے امتزاج کی بدولت عصری عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی اور نفسیاتی مسائل کے مآل اندیش مفسر ہیں بقول پروفیسر سید مسعود ہاشمی (پاکستان):

"فیصل نواز چودھری پاکستان اور ناروے کے سماجی تہذیبی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل کی عکاسی پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔"

نظریہ فن کے سلسلے میں فیصل نواز "ادب برائے زندگی" کے نظریہ کے قائل ہیں وہ بغیر کسی مصلحت اور لگی لپٹی کے کہتے ہیں کہ فن کار جس خط میں رہ کر فنی کام انجام دیتا ہے تو "وہاں کے لکھے ہوئے ادب کو پڑھ کر وہاں کے ادبی معاشی، معاشرتی اور ڈیلی لائف کے متعلق قاری کو تمام معلومات ہونی چاہیے" اور فن کے منصب اور ذمہ داری کے بارے میں موصوف کا کہنا ہے کہ "ہر قلم کار پر ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ معاشرے میں اپنی تحریروں کے ذریعے تبدیلی لائے اور عوام الناس کو ایک نئی سوچ اور ذہنی تازگی فراہم کرے۔" آزاد قیدی میں شامل افسانے مصنف کے درجہ بالا خیالات کا عملی روپ لیے ہوئے ہیں۔

فیصل نواز چودھری کا افسانوی مجموعہ "آزادی قیدی" اٹھارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کے بیشتر افسانے ہندوپاک کے اعلیٰ معیار رسالوں میں شائع ہوکر قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں علاوہ ازیں ان کے کچھ افسانے دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوکر شائع ہوئے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا ہے۔ جسے دنیا بھر میں مقیم اردو کے ادیبوں اور دانشوروں نے اپنی تعمیری آراء سے نوازا ہے۔

فیصل نواز چودھری انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے پاسدار ہیں۔ وہ حقیقت پسندانہ سوچ کے مالک ہیں۔ اپنی کہانیوں میں انہوں نے مشرقی اور مغربی تہذیب کی خوبیوں اور خامیوں پر محققانہ نگاہ سے روشنی ڈالی ہیں اور بغیر کسی تعصب کے حسب موقع ان کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانے علامہ اقبال کے درجہ ذیل شعر کا نثری مرقع معلوم ہوتے ہیں۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حزر کر   فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اپنی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے بل پر فیصل نواز اپنے افسانوں میں اگرچہ ایک طرف مغربی تہذیب کی اخلاقی بے راہ روی، نسلی امتیاز اور مذہبی تعصب خصوصاً ۹/۱۱ کے واقعہ کے بعد مسلمانوں سے متعلق یورپین لوگوں کی بدلتی

ہوئی سوچ کا نقشہ بڑے دل پذیر انداز سے کھینچتے ہیں تو دوسری جانب وہ مشرقی تہذیب کے طبقاتی استحصال اور منجمد فکر خصوصاً پاکستان میں صدیوں سے رائج علاقائی تعصب، عدم مساوات اور سماجی نابرابری کے جاہلانہ رسم ورواج کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ بقول قمر سنبھل۔

الفاظ کی تاثیر، کہ جادو ہے زباں کا؟ لہجے سے وہ پتھر کا جگر کاٹ رہا ہے

''چارلمین'' نامی افسانے میں مشرقی اور مغربی لوگوں کے اخلاقی معیار کا موازنہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ کس طرح مغرب والے مادیت پرستی کے جنون میں انسانی اقدار کی تمام سرحدیں روندھ ڈالتے ہیں اور مشرق والے اس مشینی تہذیب میں بھی فطری طور پر ان صالح قدروں کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اس افسانے میں یورپ کی ایک ٹی. وی چینل ینگ جنریشن کا مورال چیک کرنے کے لیے ایک بہت بڑے پروگرام کا انعقاد کرتی ہے۔ افسانے میں یوہان کو مغربی تہذیب کا نمائندہ کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور راوی مشرقی تہذیب کے نمائندہ کردار کے طور پر افسانے میں موجود ہے۔ یوہان کا مورال چیک کرتے ہوئے جب اس کے سامنے چارلمین کراون کا چیک پیش کیا جاتا ہے تو وہ چارلمین کراون کی لالچ میں اپنے بیوی بچوں کی پرواہ کیے بغیر طلاق نامے پر دستخط کر دیتا ہے۔ ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے اور اس کی بیوی بچوں سمیت فنکشن ہال سے مایوس ہو کر چلی جاتی ہے۔ برعکس اس کے راوی، جو مشرقی تہذیب کا نمائندہ کردار ہوتا ہے، کو جب اسی طرح چارلمین کراون کا چیک پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ بھی طلاق نامے پر دستخط کر دے اور اس کا مورال چیک کیا جا سکے، وہ چیک ہاتھ میں لے کر اس پر کراس لگا دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ''مجھے یہ چیک نہیں چاہیے میری بیوی کی ویلیو چارلمین کراون سے زیادہ ہے'' اس کی یہ ہمت دیکھ کر پورے ہال میں پھر سناٹا چھا جاتا ہے کیونکہ راوی نے ناروجین کا باشندہ ہونے کے باوجود یورپ والوں کے مورال پر کراس لگایا تھا اور یہ ثابت کر دیا کہ اتنی ترقی کے باوجود بھی آپ لوگوں کا مورال کراس ہی کے قابل ہے۔

لیکن افسانے کا کلائمکس اس وقت زبردست متاثر کن بن جاتا ہے جب راوی سے پوچھا جاتا ہے کہ اس نے چارلمین کا چیک لے کر اپنی بیوی کو طلاق کیوں نہیں دی وہ لکھتا ہے ''میں نے ہال پر پھر ایک مرتبہ نظر دوڑائی، کیونکہ لوگ میرے جواب کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ میں نے کہا اس لیے کہ وہ..... میرے بچوں کی ماں ہے۔''

اسی طرح فیصل نواز چودھری نے یورپین لوگوں کی بدلتی ہوئی سوچ کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے افسانے ''دہشت گرد'' میں دکھایا ہے کہ کس طرح ۹/۱۱ کے واقعہ کے بعد یہ لوگ مسلمانوں کے اچھے کام کو بھی مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں۔ افسانے میں راوی اور اس کی ننھی سی چھوٹی بیٹی جب ریلوے اسٹیشن پر ایک زخمی کبوتر کو رحم کی بنیاد پر مرہم پٹی کرنے کے لیے ہاتھوں میں اٹھاتے ہیں تو نزدیک میں بیٹھا ہوا پولیس والا ان سے پوچھتا ہے کہ ''تم لوگ اس کو تکلیف تو نہیں دو گے؟'' یہ عجیب سا سوال ان دونوں کو حیران کر دیتا ہے اور راوی کی بیٹی جب پولیس سے پوچھتی ہے کہ ''آپ اس طرح کے سوال ہم سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' تو پولیس والا بڑی حقارت سے کہتا ہے کہ ''اس لیے کہ آپ لوگ.....؟''

مشرق میں سماجی نابرابری اور امتیاز کی بدعت کو فیصل نواز چودھری نے اپنے افسانے ''دو روٹیاں'' میں بڑے موثر انداز سے ظاہر کیا ہے۔ خالد یوسف (آکسفورڈ) نے فیصل نواز کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے مذکورہ

افسانے سے متعلق لکھا ہے کہ ''دو روٹیاں'' فیصل کا نمائندہ افسانہ ہے جسے طبقاتی استحصال اور ناہمواری کے خلاف ایک موثر تحریر کہا جاسکتا ہے اس میں ان کے مزاج کا ترقی پسندانہ رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔''
الغرض ''آزاد قیدی'' کے افسانوں میں فیصل نواز چودھری کی متانت، مشاہدہ انسان دوستی، انسانیت نوازی، تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی پاسداری، اصلاح پسندانہ سوچ اور انقلابی فکر جیسی بہت ساری خوبیاں شفافیت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

الفاظ کا نیا صورت گر: حسن انظر

ڈاکٹر حیات عامر حسینی (علی گڑھ)

فن تخلیقی عمل ہے اور اس کا تعلق نہ صرف ذات وصفات کے انکشاف بلکہ ان کی ایک نئی فہم اور صورت گری سے ہے جسے میر نے کارگہ شیشہ گری کہا ہے۔ شیشہ گری ایک مشکل اور نازک عمل ہے۔ کیونکہ یہ تخلیقی عمل ہے۔ ایک تخلیق کار جب اپنے فن کے ذریعہ الفاظ کی نئی صورت گری کرتا ہے تو وہ فن پارہ کہلاتا ہے۔ اسی کی ایک صورت شاعری ہے۔

شاعری اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی اور اس کی یہ حیثیت اس صفات سے ظاہر ہوتی ہے جو اچھائی اور برائی کا معیار بن جاتے ہیں۔

اچھی شاعری کے لیے کئی باتیں بہت ضروری ہیں اور یہی اس کی بنیاد اور اس کی معنویت کا جواز بن جاتی ہیں۔

الفاظ وبیان کی چستی، برجستگی، شگفتگی اور بیان میں اختصار اچھی شاعری کی پہچان ہے۔ اختصار، ذکاوت و دانائی کی روح ہے۔

الفاظ موزوں، متوازن، مناسب اور بیان کی روح کے مطابق ہوں اور ان کا اتنا ہی استعمال ہو جتنی ان کی ضرورت ہے تو پھر وہ ایک ایسے بیان کی صورت کو سامنے لاتے ہیں، جو معانی کی تہہ در تہہ پرتوں کو مستور بھی کرتے ہیں اور کھولتے بھی ہیں۔ اس طرح فن کارانہ بیان کہانی یا کہانیوں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ یہی وہ ڈرامائی عنصر ہے جو ان کو متحرک، معنی خیز اور مختلف الجہت بناتا ہے۔

پراسراریت اور ذات وکائنات سے تعلق جسے ہم مذہبیت Religesity کہہ سکتے ہیں، فن یا شاعری کی علمیات اور اس کی فنی اور معنوی قدروں اور بیان کے اندر چھپے ہوئے حقائق اور احساسات اور تمناؤں کا مظہر بن جاتی ہے۔ مذہبیت ہی کی سطح پر انسانی روح یا وجود اپنی مابعد الطبیعی، روحانی، اخلاقی، الہیاتی فنی اور وجودی بنیادوں اور سرحدوں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ جتنا یہ رشتہ گہرا ہوگا اس کا اظہار بھی اتنا ہی وسیع، گہرا، متنوع، پرفریب اور خوبصورت ہوگا۔ لیکن یہ خیال رہے کہ مذہبیت، دینیات سے کلی طور پر الگ شے ہے جو ایک لگا بندھا منطقی نظام ہے اور جس کی حیثیت محض خارجی ہے۔ اس کا انسان کی گہری روحانیت سے ایک محدود تعلق ہے۔ فن کا تعلق مذہبیت سے ہے، دینیات سے نہیں اور جب فن دینیات سے وابستہ ہو جاتا ہے تو وہ مناظرہ، پروپیگنڈہ یا منظوم کلام بن جاتا ہے۔ فن یا شاعری نہیں بنتا۔ یہ ایک بہت ہی نازک مسئلہ ہے۔ اعلیٰ اور اچھی شاعری مذہبی ہو سکتی ہے۔ دینیاتی نہیں۔ اس نازک اور پرخطر فرق کو ایک حقیقی فن کار کی روح اور سحر کار نظر پہچان لیتی ہے کیونکہ شاعری ایک وجدانی عمل ہے اور اس کا

سے کوئی تعلق نہیں۔ شاعری املا بازی نہیں اس کا تعلق گہرے احساسات وجذبات سے ہے، جس کا تعلق Dictation انسان کی پیچیدہ شعوری کیفیات سے ہوتا ہے۔ یہاں شاعری کے مختلف الجہت معانی یا اس کی مختلف شکلوں سے، مجھے کوئی بحث نہیں۔ البتہ یہ کہنا برمحل ہوگا کہ لطیف شاعری غزل، نعت اور مرثیہ میں ممکن ہے، نری نظم گوئی، جیسے قصائد و مثنوی کو اس میں شامل کرنے میں مجھے تردد ہے۔ اپنے ضمیر واحساسات اور انا کو تج کر کچھ سکوں یا مفادات کے حصول کے لیے کسی کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملانا محض نظم گری ہے۔

حسن انظر کشمیر کے اردو شعرا میں اپنے اندر بیان اور ڈکشن کے لحاظ سے ایک منفرد اور معتبر آواز ہے۔ اس کا شعری منظر نامہ کلاسکیت کے رنگ اور رس سے مزین ہے۔ لہجہ نوکلاسیکی اور الفاظ کا انتخاب واستعمال برمحل اور نپا تلا ہے۔ خشک، کھردرے، بے ربط اور بے معنویت سے گھرے الفاظ وتراکیب کے بجائے۔ اردو غزل اور کلاسیکی روایات کی روح میں رچے بسے الفاظ سے اپنے خوبصورت شعری ڈکشن کو تراشا ہے۔ ان کی مذہبیت (Religosity) ان کے شعری اظہارات کو خوب سے خوب تر اور بیحد حسین بنا دیتی ہے۔

بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں، لیکن انہوں جس طرح کی نعتیں لکھیں وہ ان کے ایمان کی تازگی، حرارت اور رسول اعظم وآخرﷺ سے ان کی بے پناہ محبت کے غماز ہیں۔ ان کے اشعار میں ایک طرح کی دیوانگی کے ساتھ ساتھ تڑپ اور لب ولہجہ کا احساس ہوتا ہے۔ وہ خود صوفی نہیں ہیں، لیکن تعلق ایک ایسے خانوادے سے ہے، جس میں یہ نیک روحیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ ادب کے ساتھ فلسفہ کی تعلیم نے منطق ودلائل کا خوگر بنا دیا ہے، بہت ہلکا سا سہی، اس کا عکس بھی اشعار میں ملتا ہے، لیکن یہ کوئی برائی یا عیب نہیں کیونکہ اگر منطق عشق بن جائے تو آدمی رازی سے رومی بن جاتا ہے۔

حسن انظر کے پہلے شعری مجموعہ "صبا صورت" میں شامل نعتوں سے مترشح ہے کہ نعت کے لیے روحانی تڑپ، ایک بنیادی شرط ہے اور جب انسان کا وجود اپنی روحانی بنیادوں کی تلاش کے تجربات سے گزرتا ہے تو تصوف کی چھاپ اس پر آہی جاتی ہے۔ عشق میں تجربات، عشق کی آگ کو اور برانگیختہ کردیتے ہیں۔ آگ جتنی شدید ہو، قلب کی صفائی اور پاکیزگی اتنی ہی بڑھ جاتی ہے اور قلب جتنا پاکیزہ ہو احساسات اور ان کا بیان اور بیان کا اسلوب اتنا ہی نکھر جاتا ہے۔

رسول خداﷺ کی ذات گرامی روحانی اور وجودی اعتبار سے Authenticity کی بنیاد ہے۔ آپ خدا کے محبوب اور وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ آپ کی وجہ سے ہی زمان ومکان قائم ہیں۔ آپ خلق عظیم، سراپا رشد وہدایت، شافع محشر، انسانیت کے لیے نمونہ نوید زندگی اور رحمۃ اللعالمین ہیں۔ آپ خیر البشر ہیں۔ آپ قرآن ناطق ہیں۔ آپ رشد وہدایت کا وہ نمونہ ہیں جو ہر دور میں انسانیت کی روح کو سیراب کرتا رہے گا۔ زندگی کے رموز آپ ہی نے بہت ہی میٹھی زبان میں سکھائے۔ آپ کی ہی وجہ سے انسانیت کو احترام ملا۔ عرفان وآگہی کا منبع اور مرکز آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔ آپ ہی نے ہر دور میں انسان کے روحانی اضطراب کو دور کیا اور اسے زندگی جینے کا سلیقہ سکھایا۔ آپ ہی نے کائنات اور تخلیق زندگی کے راز بتائے۔ آپ معصوم ہیں۔ آپ سے کبھی کسی گناہ کا ارتکاب نہ ہوا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ نے زندگی سے فرار کا راستہ اختیار کیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ وہ پیکر انقلاب ہیں جنہوں نے ہر دور میں

مظلوم انسانیت کا ہاتھ تھاما اور اسے ظلم و جبر کے مقابل قیام اور ایک بامعنی، پر امن اور اقدار عالیہ سے مزین سماج اور تہذیب کی صورت گری کا ہنر سکھایا۔ آپ کی سیرت مہر تاباں ہے اور آپ کی ذات اقدس وجہ تخلیق کونین ہے۔ آپ شہ لولاک ہیں۔ انوار رب کے حامل اور پیکر رحمت ہیں۔ آپ سراپا نور ہیں۔ آپ امی لقب ہیں، لیکن تمام علوم کے حامل ہیں۔ آپ ہی نور اول ہیں۔ آپ عبادات و اذکار کا خلاصہ ہیں۔ آپ ہی کی وجہ سے انبیاء، اولیاء، اصفیاء اور نیک روحوں کو مرتبہ بھی ملا اور دوام بھی۔

یہ تمام باتیں جن کا ذکر میں نے کیا حسن انظر کی نعتوں کا خلاصہ ہیں۔ سرور کونین ﷺ کی نعت شرف فن ہے۔ نعت کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں یہ تو بس عنایت ربانی ہے۔ خدا کرے کہ حسن انظر کا روحانی وجودی اور تخلیقی سفر متانت کے ساتھ جاری رہے تا کہ اردو ادب مالا مال ہوتا رہے اور انسانیت فیض یاب ہوتی رہے۔

ایاز رسول... اردو ادب کا درخشاں ستارہ

عمر فرحت (راجوری)

ڈاکٹر ایاز رسول نازکی ۲۵ رمئی ۱۹۵۱ء میں ریاست کے مقبول و باعزت گھرانہ نازکی خاندان میں پیدا ہوئے۔ نازکی خاندان نے اپنی تعمیری شاعری کے ذریعے اردو ادب کی دامے، درمے، سخنے ہر پہلو سے حتی المقدور خدمت انجام دی ہے۔ نازکی خاندان ۱۹۳۰ء سے برابر شعر و ادب کی آبیاری کر رہا ہے۔ ادبی دنیا کے مشہور و معروف شاعر مرحوم میر غلام رسول نازکی کے لخت جگر فاروق نازکی، ایاز نازکی نے نہ صرف ہندو پاک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی کثرت سے اپنی شاعری درج کروا کر ریاست جموں و کشمیر کا نام روشن کیا ہے۔ ایاز صاحب سے میری پہلی ملاقات راجوری میں مارچ ۲۰۰۷ء میں ایک مشاعرے میں ہوئی۔ جس میں وہ مہمان خصوصی تھے۔ انہوں نے دوسرے شعرا حضرات کو بڑے غور سے سنا اور اپنے خوبصورت، جدید اور معیاری کلام سے ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہے۔ ایاز صاحب نظم کے علاوہ نثر نگاری بھی بہت خوب کرتے ہیں۔ جس کا ثبوت جموں و کشمیر کا معیاری اور باعزت روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' کا ہفتہ وار کالم ''ادب نامہ'' ہے۔ جہاں وہ عوام کے دکھ درد اور ان کے غم کو پیش کرتے ہیں۔ ایاز صاحب کی غزلیں، نظمیں ان کی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی شاعری انفرادیت کی خوشبو بھی رکھتی ہے اور عصری آفاقی دھنک کی کیفیت بھی۔ ان کی شاعری میں مجاز اور حقیقت باہم شیر و شکر ہیں۔ شاعر کا دل عشق و آگہی کا سرچشمہ ہے اور ایاز صاحب کی پوری شاعری ان کے دلی احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ایاز صاحب کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔

جس نے ہم کو عشق سکھایا جس سے سمجھے سارے گر
اس کی عمر تھی سولہ سترہ اپنی تھی اکیس برس

ڈاکٹر ایاز رسول صاحب کا شعری مجموعہ ''شام سے پہلے'' ان کا دوسرا اردو شعری مجموعہ ہے جو ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''خودرو'' کے ۸ سال بعد منظر عام پر آیا اور مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اپنے پہلے ہی پڑاؤ پر انھوں نے ناقدین و قارئین کی اس قدر توجہ حاصل کر لی تھی کہ اس طویل وقفے کے باوجود صرف رسائل میں شائع ہونے والی تخلیقات کی بناء پر نمائندہ معاصرین کے زمرے میں ان کی شناخت برقرار رہی۔

جہاں پہ کوئی نہ منظر ہو
وہاں یہ مجھ کو اتار دینا

گلستان اردو ادب کے معتبر ادبا و ناقدین مثلاً حامدی کاشمیری، افتخار امام، ڈاکٹر عتیق اللہ، یوسف ٹینگ، فاروق نازکی، سید محمد عقیل رضوی، کرشن ادیب وغیرہ نے ایاز صاحب کی شاعری پر بڑے ارتکاز نظر کے ساتھ مضمون لکھے ہیں۔ جو زیر تبصرہ ''خودرو'' اور ''شام سے پہلے'' میں درج ہیں۔ ایاز صاحب کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے بزرگ شاعر ڈاکٹر حامدی کاشمیری صاحب کہتے ہیں:

''ایاز رسول کو نئی نسلوں کے ان گنے چنے شعرا میں شامل کرتے ہیں جو

روایت اور جدت کے امتزاجی عمل سے لفظوں کی آئینہ بندی کرتے ہیں۔ اور قاری کی حیرت کا سامان کرتے ہیں۔''

آیاز صاحب کے بڑے بھائی اور ہر دلعزیز شاعر فاروق نازکی مانتے ہیں:

''آیاز رسول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ ''ثبت است بر جریدہ عام دوالم ما'' کے مصداق جدید شعرا میں ان کی ایک الگ شناخت ہے۔''

یوسف ٹینگ کے مطابق:

''ان میں خالص شعر کے ارتعاش موجود ہیں اور اس لیے اپنی صداقت کا قائل کر دیتے ہیں۔''

ڈاکٹر عتیق اللہ کے نزدیک:

''آیاز رسول کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنی بات اپنی زبان میں ادا کر سکیں۔ اپنی بات سے مراد اپنے تجربے جن کا تعلق ان کی اپنی ذات سے ہے۔''

افتخار امام فرماتے ہیں کہ:

آیاز صاحب غزل مزاج شاعر ہیں تاہم وہ نظمیں بھی تخلیق کرتے ہیں۔ یعنی آٹے میں نمک کے مصداق۔ شاعری دونوں اصناف میں سمندر روں سمندر ہے۔''

مشہور و معروف ادبی جریدہ ''شاعر'' نے آیاز صاحب پر مئی ۲۰۰۹ء میں ایک خاص نمبر نکالا۔ جس میں پروفیسر رحمٰن راہی، ڈاکٹر پریمی رومانی، شمس الرحمٰن فاروقی، اسیر کشتواڑی، شمس کمال انجم وغیرہ جیسے معتبر و باعزت اور مشہور شعرا حضرات نے اپنی اپنی رائے پیش کی۔ ان حضرات کی اہم رائے کو غور سے پڑھیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آیاز صاحب کی شاعری میں ترقی پسند اور جدید شاعری دوڑ رہی ہے۔

امن کا بادل ہے لیکن میرے کھیتوں پر ہی — دیکھنا تم ایک دن یہ جنگ لے کر آئے گا
لڑکیوں کی ہیں انگلیاں زخمی — اس جگہ سے وہ نوجواں گزرا
کہیں پر تو بجلی گری ہے آیاز — کئی کارواں اب بھی راہوں میں تھے
بال جھڑنے سے کچھ نہیں بدلا — سر میں سودا جناب اب بھی ہے
گل کے اوراق رنگ سے خالی — یہ صفحے ہیں آیتوں کے بغیر
سامنے وہ ہمارے بیٹھے تھے — دل میں ان کے خیال کس کا تھا

نازکی صاحب کے دو شعری مجموعوں کے درمیان کا عرصہ ظاہرہ، شعور و فکر کے ارتفاع، مشاہدے اور تجربے کی توسیع اور احساس کے نکھار ہی سے عبارت رہا ہوگا۔ ذہن و دل کی بلوغت کے ان مراحل کو اظہار کی بلاغت کی شکل میں کئی اشعار میں پہچانا جا سکتا ہے۔ جن میں خیال کی گرائی اور زعزیت بھی ہے اور تزکیۂ نفس سے مملو دور مندی بھی۔

تیرے جانے سے لوٹ آنے تک — اک زمانہ سا درمیاں گزرا
قتل کرتا ہے تو دستور نبھانا ہوگا — سر ہمارا تجھے نیزے پہ اٹھانا ہوگا

سرد بستر کی رات باقی ہے　　　　یہ دسمبر کی رات باقی ہے

وسیع فکری تناظرات کے ساتھ ساتھ سماجی و معاشرتی معاملات کی پیچیدگیاں، تعلقات کے نفسیاتی زیر و بم، جذبات کا زیاں، شدت احساس کی رائیگانی اور اس نوع کے کئی باریک پیچ و خم ڈاکٹر ایاز نازکی صاحب کے شعری اظہار کا شروع سے ہی حصہ رہے ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ایاز صاحب کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ایک گنبد نما عمارت دل　　　　آنے جانے کا در نہیں دیکھا
شعر گوئی ایاز کی توبہ　　　　اس میں کوئی ہنر نہیں دیکھا
رات وہ جسم مہکتا پڑھنا　　　　صبح جو شعر لبو خوشبو لکھا
یاد آتا ہے لڑکپن میں ایاز　　　　نام تیرا ہی ہر اک سو لکھا
عشق میں کوئی ہم سری کرتا　　　　ہم کو الزام سے بری کرتا

ایاز صاحب کی شاعری ذہن و دل میں ایک تازہ خوشبو پھیلانے والی شاعری ہے۔ جو بہت کم شعرا میں پائی جاتی ہے۔ ایاز صاحب نے اپنی شاعری میں کشمیر کے عکس کی بھی خوب پذیرائی کی ہے۔ ایاز صاحب کہتے ہیں کہ:

وہ متانت کہاں وقار کہاں　　　　شہر میں اب چنار کہاں
برف آئی ہے بارشوں کے بعد　　　　یہ کرم ہے نوازشوں کے بعد
وہی چناروں کے سبز پتے　　　　بہار آنگن میں آرکی تھی

ایاز صاحب نے اپنی شاعری کو اپنے درد کا ترجمان بنایا ہے۔ اس بات کا اعتراف خود ایاز صاحب نے اپنے ایک شعر میں کیا ہے۔

اپنی پہچان کے مسائل ہیں　　　　شعر کہنا تو اک بہانہ ہے

چند اشعار اور ملاحظہ فرمایئے:

تمہارا نام لکھتا آسماں پر　　　　مرا مسکن نہیں ہے کہکشاں پر
جو غزل بھی کہی کہی ہم نے　　　　دفتر واوقعات ہے پیارے
وہ بھی کرتے نہیں ہیں وعدے اب　　　　ہم سے ہوتا ہے انتظار کہاں
پرندے یہاں سے گزرے تو ہیں　　　　یہاں پر بناتے نہیں آشیانہ

ایاز صاحب کی شاعری قدیم و جدید روایتوں کا حسین ترین مرقع بھی ہے۔ ایاز صاحب کے اشعار میں ایک لامحدود فکر و نظر، گہرائی و گیرائی اور جامعیت پائی ہے۔ ان کے اشعار میں جو جدت پائی جاتی ہے، بلاشبہ وہ قابل تعریف ہے اور جس طرح زندگی کے بعض بہت معمولی حادثوں یا بعض ایسے واقعات کو ہم تقریباً روزانہ دیکھتے ہیں یا سنتے ہیں، ایاز صاحب جس قدر خوبصورتی کے ساتھ ان تمام واقعات کو اپنے اشعار کے سانچے میں ڈھالتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایاز رسول صاحب معاشرے میں رونما ہونے والے کسی بھی واقعہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں اسے اپنے اشعار کے ذریعے ایک پیغام دیتے ہیں۔ ایاز صاحب نے اپنی شاعری میں کشمیر سے بے حد محبت اور جدائی کا درد بھی پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

ہم کو بچھڑے کتنے گزرے سال بتادوں اے کشمیر تیرے سولہ میرے سولہ ہیں بتیس برس
ہم شب و روز سلگتے ہیں اگر دوری میں میرے کشمیر کا موسم تو سہانا ہوگا

ایسے نہ جانے کتنے خوبصورت اشعار ایاز صاحب اپنے چاہنے والوں کی نذر کر چکے ہیں۔ جنھیں آج بھی قاری اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہر دور میں پڑھنے والے کی ترجمانی کرتے، جسے بار بار پڑھنے کو جی چاہے۔ وہ شاعری جس میں شاعر کے مشاہدات اور تجربات کا اظہار اس طرح ہو کہ قاری یا سامع کو انبساط کے ساتھ کوئی سبق بھی ملے، روح میں تڑپ پیدا ہو، سماج کے تئیں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو ایسی شاعری زندہ شاعری ہے۔ کسی تجربہ کار نے کیا خوب کہا ہے کہ ''اگر غزل اپنے دور کی تہذیبی اقدار کی ترجمان نہیں اور پر اثر انداز میں شاعر کے جذبات کی حامل نہیں تو اسے سچی شاعری نہیں کہا جا سکتا۔'' شاعری کو صرف ذاتی تجربات کے اظہار کا ذریعہ بنایا، خود بینی و خود نمائی اور فنی خیانت ہے۔ ایاز صاحب کے نزدیک زمانے کا دکھ درد ان کا اپنا دکھ درد ہے۔

گھر میں آج وہ کرب و بلا کا منظر تھا تھے سہمے سہمے پرندے بھی آشیانوں میں
ٹوٹ پھوٹ چراغ لے کر بھی روشنی میں شمار ہوتا تھا
میں سپیدے کا پیڑ ہوں لیکن برف نے میری ٹہنیاں توڑیں

ایاز صاحب اس درجہ حساس ہیں کہ خود کو انسانی انبوہ میں تنہا محسوس کرتے ہیں۔ ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سب نے شکلیں بدل رکھی ہیں۔ حقیقت کچھ اور اظہار کچھ اور ہے۔ ان محسوسات کو ایاز صاحب نے اپنے لفظوں میں سادہ سلیس انداز میں بیان کیا ہے۔

اپنی قوم کے غیرت مند سب کا خون بہاتے ہیں
زمین پر خون اتنا بہہ گیا ہے ہواؤں میں بھی خوشبو آ رہی ہے

ایاز صاحب محبوب کی محبت سے بھی دور نہیں ہیں۔ جذبات و انداز ملاحظہ فرمائیے۔

چاند لکھتا ہوں اس بدن کو میں جسم کو آفتاب پڑھتا ہوں
ہونٹ ان کے ایاز کھلتے ہیں شعر ایک لا جواب پڑھتا ہوں

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اردو کی خوش نصیبی ہے کہ اسے ایاز رسول جیسے معتبر و سنجیدہ شاعر ملے۔ ایاز رسول کی شاعری پڑھیں تو وہ پوری طرح محسوس ہوتی ہے۔ جسے چپ چاپ پڑھیں تو سنائی دیتی ہے، نظر بھی آتی ہے، حرف، صدا اور عکس کا یہ تھری ڈی افیکٹ (Three Dimensional Effect) ایاز صاحب کے یہاں اس لیے پیدا ہو سکا کہ انہوں نے زندگی کو بھگتا بھی ہے سمجھا بھی ہے۔ پڑھا بھی ہے لکھا بھی ہے، دیکھا بھی ہے دکھایا بھی ہے۔

وہ جو میری نظمیں غزلیں تنہائی میں گاتی ہے وہ ہے میرے فن کی عاشق، میری کب دیوانی ہے

ایاز صاحب نے ''خودرو'' میں کہا ہے کہ۔

ہجر کی نگری جل جائے گی وصل کے گاؤں جانا ہوگا
گیت یہ میرا لیتے جانا تنہائی میں گانا ہوگا
دل کے روگی ہی اکثر اپنا بھید چھپاتے ہیں

میں خموشی کی لاش سے نکلا　　　　تری آواز کا لہو ٹپکا

''کہاں تک مثالیں پیش کی جائیں۔ ایاز رسول نازکی صاحب کا پورا سرمایہ کلام اسی طرح کے گوہر آب دار سے بھرا ہوا ہے۔'' یہ اشعار غزل کی زبان میں ہیں۔ ان پر از دل خیزد بر دل ریزد کی مثل صادق آتی ہے۔ یہ عریاں بیانی نہیں ہے بلکہ وہ آرٹ ہے۔ جیسے غالباً مرزا غالب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ وہ فن ہے جس میں غم کو محبت کی سوغات کی طرح متبرک سمجھا جاتا ہے۔ جس میں شاعر ہر زخم کو پھول بنا کر پیش کرنے کا ہنر خوب جانتا ہے۔ ایاز صاحب غزل کے مزاج کو خوب پہچانتے ہیں، ایاز صاحب غزل کی نزاکت سے پوری طرح باخبر رہتے ہیں۔ غم دوست کو اصل حیات سمجھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ حسن کیا ہے؟ عشق کیا چیز ہے؟ جذبۂ عشق ہی نے داستان حسن میں رنگ آمیزی کی ہے۔

عاشق کشتۂ وفا ہوتا ہے، اسے در یار سے والہانہ لگاؤ ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اس کے گیسو یاد آئے　　　　ایک گھنا سا جنگل تھا

چہرے پر تھی دھوپ کھلی　　　　آنکھوں میں کیا کاجل تھا

جہاں پر تمہاری ردا چھن گئی تھی　　　　وہیں پر ہمارا بھی بازو کٹا تھا

یوں لگتا ہے کہ شاعر کے ہاتھ میں قلم نہ تھا، کسی مصور کے ہاتھ میں برش ہو اور اس سے وہ مرقعات دلکش بناتا چلا جاتا ہے۔ لفظ مصور سے یاد آیا کہ ایاز صاحب جتنے اچھے اور سچے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے مصور بھی ہیں۔ ایاز صاحب کے چند دلکش اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

رات چہرے کی دھوپ میں اکثر　　　　گیسوؤں کی کتاب پڑھتا ہوں

سنا عمارت ہی گر پڑی ہے　　　　وہ جس کی تعمیر کر رہے تھے

لہو کی بارش کا تذکرہ تھا　　　　وہ ذکر کشمیر کر رہے تھے

ایاز صاحب کی شاعری میں زمانے کے جور و ستم کا شکوہ بھی ہے۔ خود غرضی وخود ستائی کی شکایت بھی ہے اور چمن سے روتی ہوئی بہار کے رخصت ہونے کا المیہ بھی ہے۔'' لیکن ہر جگہ شاعر کا اپنا انداز بیان ہے۔ جو پوری طرح بیان تغزل سے شعر ابوز ہے۔

باغ ہمارے سوکھے ہیں　　　　برکھا رت کی نوبت دے

بچھڑے گا اب جانے کون　　　　جانے کس کا ماتم ہو

اپنے گھر میں پھیلتی ہیں چارسو　　　　بیل بن کر بے ثمر تنہائیاں

ایاز صاحب کی شاعری مجموعی طور پر کمال دل سوزی اور جگر کاری سے عبارت ہے۔ انہوں نے اپنے خون جگر سے چمنستان غزل کی آبیاری کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شاعر کو صحت یاب رکھے اور ان کے کلام کو حسن قبولیت بخشے۔

(آمین)

خیال کے پھول۔ عصری مسائل کی چبھن

ڈاکٹر حبیب اللہ (وارانسی)

اردو اور ہندی کی ملی جلی تہذیب کے نمائندہ شاعر شبیر حسین خاں معیار سنبھلی اپنی شاعری کے آغاز سے اپنی شناخت کی منزل پانے تک تجربات کے ایک لامتناہی سمندر اور دور تک پھیلے ہوئے گھنے جنگل سے گزرے ہیں۔ ان کی تخلیق میں ان تمام تجربات، مشکلات اور اندیشوں کے نقوش جا بجا موجود ہیں۔

''خیال کے پھول'' ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے، اس سے پہلے ۱۹۸۲ء میں انھوں نے ''وطن کے نام پانچ پھول'' کی اشاعت کر کے وطن سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اخباروں، رسالوں کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات کے ذریعہ ان کے شعری افکار عوام کے ایک بڑے طبقے تک پہنچ چکے ہیں، اس لیے یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ طباعت و اشاعت کی سہولتوں کے فقدان کے باوجود انھوں نے اپنے متوجہ کر دینے والے انداز بیان اور چونکا دینے والے لب و لہجہ سے عوام کے ذہن و دماغ میں اپنی جگہ بنالی ہے اور ہماری قومی یادداشت اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے حافظہ میں ان کی یادیں محفوظ ہو چکی ہیں۔

''خیال کے پھول'' کے گرد پوش کے دونوں اندرونی حصے پر ڈاکٹر ونے مشرا، مارکس وادی مفکر پروفیسر چندر بلی سنگھ کے اقتباسات اور ظہیر قریشی کے پیش لفظ سے معیار سنبھلی کے فکر و فن، انداز بیان، طرز اظہار اور ان کے اسلوب کی معنویت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ معیار نے ماضی کی شعریات، لفظیات، اور اسلوبیات کی روایت کی توسیع کر کے کس طرح اپنی تخلیقی مہارت اور فن کارانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے اور کن معنوں میں انھوں نے اپنی جدت پسند طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں، ان تینوں قلم کاروں کے خیالات سے اس جانب روشنی پڑتی ہے۔ خود معیار سنبھلی نے اپنی اولیات و ترجیحات کی طرف ''کہنے کی بات'' میں اشارے کیے ہیں۔ ان اشارات سے بھی ایسے گوشوں پر نگاہ جاتی ہے جن کی تنقید و تجزیہ اور تفسیر و تعبیر کو پھیلایا جائے تو بڑی مفید اور کارآمد باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے کہنے کی بات میں اپنے طریقۂ اظہار اور نظریہ شعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ابتدائی سطروں میں کہا ہے کہ میرا عقیدہ اور رویہ یہی رہا ہے کہ شعر میں جو کچھ کہا جائے اس میں صفائی اور تازگی ہو تا کہ پارکھی لوگوں کو پسند آئے۔ نیز کہنے کا ڈھنگ اور لفظوں کے استعمال کا طریقہ ایسا ہو کہ عام لوگوں کی دلچسپی اس میں قائم رہے۔ اس اقتباس میں معیار سنبھلی نے اپنی زبان، اسلوب بیان اور طرز ادا کے سلسلے میں ایک ایسا سرا ہمیں پکڑا دیا ہے جس کے سہارے الجھی ہوئی ڈور کے سارے الجھاؤ اور تمام گرہوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ دلی اور لکھنؤ کے شاعروں نے اصلاح زبان کی جو تحریک چلائی اور فن شاعری کے جو قواعد و ضوابط پیش کیے اس میں زبان کی صفائی، محاوروں کے برمحل استعمال، بات کہنے کا ایسا انداز کہ انسانی ذہن بات کی تہ تک بغیر کسی رکاوٹ کے فوراً پہنچ جائے اور کہنے والا کیا کہنا چاہتا ہے اس کی منشا کو بلا تامل اور بلا

تکلف سمجھ جائے۔ شاعروں کی اس کوشش اور زبان سخن کو سادہ و سلیس بنانے کے جذبے نے ایک ایسے شعری رویے کو وجود بخشا جس کو سہل ممتنع کی اصطلاح سے تعبیر کیا جانے لگا۔ سہل ممتنع کی شاعری کو قادر الکلامی اور برجستہ گوئی کی معراج کمال تصور کیا جانے لگا۔ سہل ممتنع میں کہے گئے اشعار کو اگر نثر میں بیان کیا جائے تو لفظوں کی جو ترتیب شعر میں آئی ہے اس کو الٹا پلٹا نہ جا سکے۔ ایسے اشعار کی تفہیم بڑی مشکل ہوتی ہے مگر سننے والے کے لیے اس کا سمجھنا اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے جتنا کہنے والے کے لیے مشکل۔ اس قسم کی شاعری میں لہجے کا سپاٹ پن اور بیان کی خشکی در آنے کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے۔ جس سے شعریت مجروح اور تازگی متاثر ہوتی ہے۔ ''خیال کے پھول'' کی زبان اور اس کے شعری رویے کے بارے میں مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل و تکلف نہیں ہے کہ معیار نے فکری اعتبار سے شعر کو نثر ہونے سے بچانے اور عام گوئی کی ڈگر سے ہٹانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے شعروں کو پڑھ کر ایک لطف سخن کا احساس ہوتا ہے۔ جس میں نشتریت اور فکر کی کاٹ موجود ہے۔ چند مثالوں سے اپنی بات کو مدلل بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

خزاں کا دور بھی آئے تو کم نہیں ہوتے	تصورات میں کھلتے ہیں وہ کمال کے پھول
اپنی اونچائی گھٹا لے فائدہ ہو جائے گا	ان کی محفل میں ترا بھی داخلہ ہو جائے گا
ہم محبت کے پجاری ہیں، محبت کی قسم	جس کو بھی سجدہ کریں گے وہ خدا ہو جائے گا
مرے سائے میں جو رہے اکثر	ٹہنیاں توڑ لے گئے اکثر
کارواں سے آندھیوں کی چھیڑ بھی کیا خوب تھی	ہوش والے اڑ گئے اور باد لے چلتے رہے

ان اشعار میں فکر کا بہاؤ اور زبان کا رچاؤ دونوں اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے سے دور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ آپس میں ایسے گتھے ہوئے ہیں اور اس انداز میں جڑے ہوئے ہیں کہ ایک جان دو قالب بن گئے ہیں۔

معیار نے شعری زبان ایسی استعمال کی ہے ہندوستانی روایت کو وسعت عطا کرتی ہے۔ اس میں ہندوستان کی دیومالائی تہذیب اور مشترکہ قدروں کے سرمائے سے استفادہ کی صورت نکالی گئی ہے اور ہمارے ملک کی گنگا جمنی معاشرت کو بڑھاوا دینے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ جیسے ۔

تیرے لیے اے زندگی اک راس رچوں گا	پہلے میں خیالات کو گھنشیام تو کرلوں
جٹاؤں سے وہ گنگا کا اترنا	ابھی تک لوگ ہر ہر بولتے ہیں
بھیلنی کے بیر جو جھوٹے تھے یہ کیسے دیکھتے	رام تو حیرت میں تھے جنگل میں اتنا پیار ہے

معیار سنبھلی نے اپنے کو بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے مگر جب وہ اس پر اپنا تبصرہ یا محاکمہ پیش کرتے ہیں تو ان کے نظریات و خیالات فلسفیانہ و مدبرانہ انداز نظر ہونے کے باوجود اشعار سیدھے سادے اور لفظی آرائش و نمائش اور صفت نمائی کے عیب سے پاک صاف اور نہایت آسان زبان میں ہوتے ہیں۔

انھوں نے اپنے اشعار میں آج کی بدلتی ہوئی دنیا، مٹتی ہوئی قدروں، بنتی بگڑتی سماجی تصویروں، سمٹتی پھیلتی خواہشوں کو نئے پیراہن دیے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے مختلف گوشوں پر نظر ڈالی ہے اور اپنے نتائج بلا کم و کاست بیان کیے ہیں۔ مگر ایک بات یہ نہ بھولنی چاہیے کہ انھوں نے زندگی پر اپنے اٹوٹ یقین کا ہر جگہ ثبوت فراہم کیا ہے۔ کسی مقام

پر انھوں نے امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور آزمائش کی گھڑی میں اپنے اعتماد و اعتقاد کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔

کانٹے جو بچھے ہیں انھیں گلفام تو کر لوں — ان پاؤں کے چھالوں سے میں یہ کام تو کر لوں

مانا کہ سمندر نہ اچھ پاؤں گا لیکن — اپنے تئیں یہ کوشش ناکام تو کر لوں

چھن گئیں خوشیاں تو غم کے راستے چلتے رہے — رکنے والے ہم نہ تھے جب چل پڑے، چلتے رہے

انھوں نے ہماری روحانی زندگی پر حاوی ہوتی ہوئی مادیت اور تہذیب کو بھی جنس بازار بن جانے اور روحانی قدروں کی پامالی پر غم کے آنسو بہائے ہیں۔ لوگ مغرب کی آسائش اور یورپ کی مادیت پر نظر رکھے ہوئے ہیں مگر اس کے نیچے دبی ہوئی انسانیت کے درد کو محسوس نہیں کرتے۔ مثلاً

ناؤ گاڑی پر رکھی اور ناؤ پر گاڑی کبھی — ہر طریقے سے مسافر وقت کے چلتے رہے

مذکورہ بالا شعر میں انھوں نے محاورے کا ایسا برمحل استعمال کیا ہے جو ان کی فنی مہارت اور زبان پر مکمل دسترس کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس سادہ سے بامحاورہ شعر میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ زندگی کے لامتناہی سلسلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ انسان آتے جاتے رہیں گے مگر زندگی کا قافلہ ختم نہیں ہوگا۔ یہ دنیا قائم رہے گی اور آنے والوں سے اپنی تکمیل کراتی رہے گی اور عمل تشکیل ہمیشہ حاوی رہے گا۔

معیارؔ نے مشکل ردیف اور سنگلاخ زمین میں بھی شگفتہ اشعار کہے ہیں۔ ان کی فکر کی تازگی اور اسلوب کی رنگینی نے منظر ناموں میں نئے رنگ بھرے ہیں۔ انھوں نے پلاش کا اور پھول کی ردیف کو پوری طرح کھپانے کی کوشش کی ہے مجموعہ کے ص ۱۷، ۲۲، ۳۷، ۹۶ کی غزلیں ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ شاعر کا ایک بڑا کمال فن یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی بحروں میں عجز کلام کا شکار نہ ہو اور بات اس طریقے سے کہے کہ الفاظ کی تنگ دامانی بھی خیالوں کے بہاؤ اور فکری وسعت کو محدود نہ کر سکے۔ ہمارے زیر تبصرہ شاعر بھی اس خوبی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے چند لفظوں میں بڑی گہری بات اور بامعنی گفتگو پیش کی ہے اور خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے موجودہ مسائل اور عصری حسیت کے تار و پود سے اشعار کی نت نئی قبائیں تیار کی ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری قدیم و جدید اور روایت و جدت کا حسین امتزاج بن گئی ہے۔ زمانے کے تقاضوں اور نئے حالات پر ان کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

جدت سے کوئی کام نہ لیں فکر و فن میں ہم — کیا چاہتے ہو جاکے رہیں پھر سے بن میں ہم

کہیں نہ دھوپ دکھائی پڑی نہ چھاؤں دکھی — اسی کو کہتے ہیں منزل کی جستجو رکھنا

مذہبی رواداری اور تہذیبی وسیع النظری کی بہترین مثال ملاحظہ ہو۔

خدا کی تجلی تو ہے دل کے اندر — مگر لوگ دیر و حرم دیکھتے ہیں

تم نے مذہب کو سیاسی پینتروں میں رکھ دیا — سر پر رکھنے والی شے کو ٹھوکروں میں رکھ دیا

معیارؔ صاحب نے مشکل ردیف میں شگفتہ اشعار پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے مثال ملاحظہ ہو۔

تنہا سفر تھا راہ کے منظر بھی تھے اداس — اچھا ہوا جو مل گیا سمبل پلاش کا

اس شعر کے ساتھ میں اپنی بات ختم کر رہا ہوں۔

سجا کے دامن الفاظ میں خیال کے پھول — میں دے رہا ہوں زمانے کو بول چال کے پھول

جدیدیت کا سربرآوردہ شاعر
روشن لال روشنؔ

جاوید انورؔ (وارانسی)

روشن لال روشنؔ کی شاعری کا مطالعہ کریں تو انکشاف ہوتا ہے کہ مظاہر کائنات اور زندگی کے بعض تجربات کو شعری جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے جس اسلوب کو سب سے محبوب رکھا ہے وہ عام قاری کی زبان میں نسبتاً سادہ لیکن بہت اثر انگیز ہے۔ میرؔ نے کہا تھا:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میرؔ کے کہنے کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ ہر خاص کسی نہ کسی سطح پر عام ہوتا ہے اور ہر عام کسی نہ کسی سطح پر خاص۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے شعر ہر کسی کے لیے ہیں۔ روشن لال روشنؔ کی گفتگو بھی سماج کے ہر فرد سے ہے خواہ عام ہو یا خاص۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے روشن لال روشنؔ کے متعلق فرمایا ہے کہ:

''روشن لال روشنؔ جدیدیت کے سربرآوردہ شاعر ہیں۔''

روشن لال روشنؔ کی شاعری سماج کے ہر فرد کے مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ زبان کی سادگی کا ذکر جو میں نے کیا ہے تو ایسا نہیں ہے کہ اس سے شعری سطح پر یا اس کی معنوی سطح ان کا اظہار یک رخا نظر آئے یا ظاہری طور پر جو معنی نظر آئے وہی اس کا اصل ہو بلکہ الفاظ کے انسلاک سے پیدا شدہ باطنی معنی اور علامتی اور استعاراتی طور پر جو معنی ان کے اشعار سے برآمد ہوتے ہیں یا برآمد کیے جا سکتے ہیں، ان کی قوت ان کی مشاہدات حس میں مضمر Catching Power کا پتہ دیتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

سوچیے تو گھومتی ہے یہ زمیں
دیکھیے تو آسماں گردش میں ہے

میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں
وہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے

یہ سر جھکا نہ کہیں بھی انا ہی ایسی تھی
قبول ہو نہ سکی کچھ دعا ہی ایسی تھی

وہ اور آگ ہے روشنؔ کہ اس جہنم میں
خدا کے فضل سے لطف ارم اٹھاتا ہوں

کس آفتاب صبح کی امید ہے انھیں
روشنؔ چراغ دل جو بجھائے ہوئے ہیں لوگ

ہر ایک شخص بہ باطن فنا ہوا روشنؔ
ہر ایک شخص بظاہر یہاں سلامت ہے

ہر خواہش بے دین ہوئی
ہر جذبہ ناپاک ہوا

مندرجہ بالا اشعار میں ذہنی ساخت اور طرز فکر کے طور ان الفاظ کا انتخاب مکمل نظر ہے جن کے ذریعہ مظاہر

کائنات اور زندگی کے تجربات کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ ان اشعار کے بطن کا تجزیہ کیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ شاعر بطور متکلم ان میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسانی ہستی کے مختلف رخ ہیں جو الگ الگ کرداروں کی صورت میں ہمارے سامنے منکشف ہوتے ہیں یعنی شاعر بطور تخلیق کار پس پشت چلا جاتا ہے اور اس کی جگہ جو مرکزی کردار ہمارے سامنے آتا ہے وہ عام معاشرے کا فرد ہے۔ (ادبی نکتۂ نظر سے ادیب کو سماج کے دوسرے افراد پر فوقیت حاصل ہے) اس کو کسی طرح کسی دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ہے بلکہ اپنے علم اور اپنے ظرف کے مطابق کائنات اور معاشرے پر غور وفکر کرتا ہے اور جو بھی نتیجہ اس کا ذہن اخذ کرتا ہے اس پر یا تو وہ سوال اٹھاتا ہے یا حیرت کا اظہار کرتا ہے یا پھر طنزیہ اور نیم طنزیہ لہجے میں اور کبھی بالواسطہ طور پر اپنی بے بسی کا اظہار کرتا ہے۔

پہلا سا زمانہ مت ڈھونڈو — رونے کا بہانہ مت ڈھونڈو
کھو جاؤ گے اندھی گلیوں میں — وہ شہر پرانا مت ڈھونڈو
سورج کو برا لگ جائے گا — سائے میں ٹھکانہ مت ڈھونڈو
اس دشت میں دریا مت چاہو — اس کھیت میں دانہ مت ڈھونڈو
بارش کی سانس ٹوٹ گئی خیریت ہوئی — ورنہ تمام شہر کو غرقاب دیکھتے
رات در پیش تھی ہجرت ایسی — گھر میں رہ کر مجھے گھر یاد آیا
عجب نہیں کہ نمو ہو سحر ہمارے لیے — دعائے مرگ کرو رات بھر ہمارے لیے

ان اشعار میں عمومی الفاظ میں فکر وفن کے جو انوکھے جہان روشن ہوتے ہیں اور جو مختلف طریقہ سے آئے ہیں وہ جدیدیت میں نئی نسل کی تبدیل ہوتی ہوئی فضا کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جو ہر ۱۰-۱۲ سال میں جدید Idiology کے زیر سایہ ضمنی طور پر زمانے کی تغیر پذیری کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہ تبدیلی ان تمام شعری رویے اور فنی نہج کا ساتھ دیتی ہے، جن کا تعلق عصر حاضر کے تقاضوں سے ہوتا ہے۔

روشن لال روشن نے اردو کی عظیم شعری روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہوئے غزل کی شعریت کے اہم عناصر مضمون آفرینی، معنی آفرینی، خیال بندی اور شعور انگیزی کو ملحوظ رکھتے ہوئے خیال اور اسلوب دونوں حوالوں سے موضوع اور لفظیات، مخصوص وہ لفظیات جو عام سماج کے روزمرہ کا حصہ ہیں کہ ایسے تجربے کیے ہیں جو ۱۹۷۰ء کے بعد کی غزل میں کم سے کم نظر آتے ہیں۔ نیر مسعود نے عرفان صدیقی کی شاعری کے متعلق فرمایا ہے:

> ''عرفان صدیقی کو جو چیز ان کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے وہ الفاظ کا رموز واسرار ہے۔ یہ بات میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح الفاظ کے رمز وایما کو انھوں نے سمجھا ہے اس طرح ان کے ہمعصر شعرا میں بہت کم شاعروں نے سمجھا ہے۔''

اس بات کو آگے کی نسل تک پھیلایا جائے تو ان بہت کم شعرا میں روشن لال روشن کا شمار بھی ناگزیر ہے۔ لیکن پہلے خیال اور اسلوب کے زیر سایہ تجربات کی دلیل کے طور پر چند اشعار درج کرتا ہوں۔

اتارتے ہو نہ چلنے کا بہت کرتے ہو — یہ بوجھ دل پہ سبک ہے، گراں ہے، کچھ تو کہو
صبح ہوگی تو وہ گھر لوٹے گی — قرض کنبے کا ادا کر دے گی

میں ہوں سورج تو مرے بارے میں — زندگی شام ڈھلے سوچے گی
دیکھ کے میرا حال یہ دنیا ہنستی ہے تو ہنسنے دو — میں اندھا ہو جاؤں گا تو اک اک سے بدلا لوں گا
ہم سے اوڑھی گئی نہ عریانی — سو بدن کا لہو قبا ہے میاں
اس سفر میں سوچ لو تشنہ لبو — راستے میں ایک بھی دریا نہیں
کون ہوں، کوئی جو پوچھے کیا کہوں — میں نے روشن یہ کبھی سوچا نہیں

مندرجہ بالا تمام اشعار خیال اور اسلوب کے تجربات کی عمدہ مثالیں ہیں۔ خیال کے اعتبار سے غور کیا جائے تو بعض خیال ایک مکمل اکائی کی حیثیت اختیار کر گیا (شعر نمبر ۲، ۵) اور بعض کو ایک مکمل اکائی نہ بنا کر خیال کو ادھورا چھوڑ دیا گیا ہے۔ کوئی بھی فیصلہ قاری اور سامع کے سپرد ہے کہ وہ ان خیالات کی روشنی میں سماج اور معاشرے کی موجودہ صورت حال کا ان اشعار کی روشنی میں اپنی مشاہداتی فہم کے سیاق میں اندازہ کر سکے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ شعر نمبر ۲ اور ۵ میں متکلم نے کوئی ایسا فیصلہ صادر فرمایا ہے جس کا رد نہیں کیا جا سکتا یا اس سے مختلف اور آگے کی سمتوں تک نہیں سوچا جا سکتا بلکہ متکلم کا فیصلہ بس اس کا ایک نظریہ بھر ہے۔ اب میں اسلوب کی طرف آتا ہوں۔ شعر نمبر ا میں سادہ اسلوب شعر نمبر ۳ اور ۵ میں مشاہدانہ اسلوب اور باقی تمام میں زور کلام کا استعمال کیا گیا ہے۔ معنویت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دوسرا شعر اپنے آپ میں ایک مکمل افسانوی کیفیت رکھتا ہے یعنی ایک شعر میں افسانے کا پورا پلاٹ موجود ہے۔ چوتھے شعر میں ''اندھا'' کا استعمال شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ یعنی متکلم کے مطابق یہ دنیا ذہنی و شعوری اعتبار سے اندھی ہو چکی ہے جو ظاہری حال پر ہنس رہی ہے اور متکلم اپنی دانائی اور وسعت نظری کے ہاتھوں مجبور ہے۔ ان ہنسنے والوں کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق تبھی جواب دیا جا سکتا ہے جب متکلم کا ذہن ان کی ذہنی سطح تک اتر جائے جو کہ فی الحال ممکن نظر نہیں آتا۔ اس طرح متکلم سماج کے ایک باشعور فرد کا کردار پیش کرتا ہے۔ اس طرح ایک اور نکتہ برآمد ہوتا ہے کہ دنیا کو متکلم کے حال پر نہیں بلکہ اپنی ذہنی پسپائی کے سبب اپنے حال پر ہنسنا چاہیے دانش۔ جمال دانش کا ایک بے مثال شعر یاد آتا ہے حالانکہ وہ دوسرے سیاق میں ہے، لیکن یہاں برمحل ہے۔ اس لیے درج کرتا ہوں۔

منزل مجھ پہ ہنستی ہے — میں منزل پہ ہنستا ہوں

شعر نمبر چھ کا جو مرکزی خیال ہے اس تعلق سے محمد علوی کا شعر یاد آتا ہے۔

پانی تو اب ملے گا نہیں ریگزار میں — موقع ہے خوب دیکھ لو دامن نچوڑ کر

غور کیا جائے تو یقیناً روشن لال روشن کے شعر میں اس مرکزی خیال کی جھلک موجود ہے اور ممکن ہے انھوں نے شعر کہتے وقت اس شعر سے استفادہ کیا ہو۔ لیکن یہاں معاملہ محض استفادے تک ہی محدود ہے۔ تقلید تک نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ روشن لال روشن کے شعر کے متن کی طرف توجہ کی جائے تو اس کی ایک صاف حد نظر آتی ہے (اس شعر میں) جبکہ محمد علوی نے اپنے مستعمل الفاظ کے توسط سے لامحدودیت کا پتہ دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ روشن لال روشن کا متن قرآن مجید میں بیان کردہ اس واقعے کی جانب بھی مڑ جاتا ہے جس میں بنی اسرائیل قوم کے ایک عادل بادشاہ نے حق کے لیے جنگ پر جاتے ہوئے اپنی فوج کو راستے میں پڑنے والے دریا کا پانی پینے سے منع فرمایا تھا کہ یہ خدا کا امتحان ہے۔ ہاں اگر ایک دو چلو پی لیا تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اس سے زیادہ جو پیے گا اس کی فتح ناممکن ہے۔

لیکن دریا چونکہ مکمل سیرابی کی علامت ہے لہٰذا اس سفر میں ایک دو چلو پر اکتفا کرنا دریا کے ہونے میں بھی اس کے نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ یہ روشن لال روشن کا امتیاز ہے کہ ایک خیال سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے اسلوب کے ذریعہ واقعہ در واقعہ کی صورت پیدا کر دیتے ہیں اسلوب کی تعریف کے طور پر انگریزی کے پروفیسر لوکاس کا بیان درج کرتا ہوں۔

''یہ حقیقت ہے کہ آج تک اسٹائل کی کوئی جامع تعریف سامنے نہیں آئی۔ یہ پروفیسر سرے سے لے کر بوفان تک کارلائل سے لے کر ایمرسن تک، سب ہی اسٹائل کی تعریف بیان کرنے میں اس بات سے متفق ہیں کہ اسٹائل ''شخصیت اظہار کی ٹیکنیک'' اور ''اظہار کی انفرادیت'' کا نام ہے یہ صحیح ہے کہ اسلوب کے اصطلاحی معنی فن کار کے اظہار کی ٹیکنیک سے وابستہ ہیں۔ شاید اسی لیے کسی کے نزدیک اسٹائل ''فن کارانہ طریقہ کار'' ہے تو کسی کی نظر میں اسٹائل اظہاریت کا شعوری طریقہ کار ہے۔ بوفان نے اسٹائل کو شخصیت کا اظہار بتایا ہے تو ایمرسن کے نزدیک اسبول فن کار کے ''ذہن کی زبان'' ہے۔''

(بحوالہ نئے زاویے۔ از ڈاکٹر رفعت اختر ص ۳۲)

خیال اور اسلوب کے علاوہ انھیں اشعار میں نیر مسعود صاحب کے اظہار کردہ رمزو ایما کے پہلو بھی نکالے جاسکتے ہیں۔ لیکن گفتگو کو اور مضبوط کرنے کے لیے بغیر کسی خاص کھوج بین کے رمزو ایما کے متعلق چند اشعار درج کرتا ہوں۔

بک گئے لوگ اور خبر بھی نہیں — کون گاہک تھا کون تھا تاجر
سراغ دشت ہنر عطا کر کہاں گیا وہ — نئے غزالوں میں بتلا کر کہاں گیا وہ
نفس نفس عذاب پانیوں کا ہے — صدف صدف گہر میں ڈھل گئے تو کیا
وہ جو مل جائے سر راہ دعا ہے نہ سلام — اور محفل میں سر آنکھوں پہ بٹھاتا ہے مجھے
سامنے زندگی کا آئینہ — اور میں موت کی جھلک دیکھوں
لوگ لیں حرف حرف چٹخارہ — اور میں شعر میں نمک دیکھوں
غزل کی بات تو ائے دل یہی ہے — بہت آسان ہے مشکل یہی ہے

بحرالفصاحت میں کنایہ (رمزو ایما) کی تعریف کا بیان اس طرح ہے۔

''علم بیان کی اصطلاح میں کنایہ اس لفظ کو کہتے ہیں جو اپنے معنی موضوع بہ میں مستعمل ہو لیکن مقصود وہ معنی نہ ہوں بلکہ ایک دوسرے معنی ہوں جو ان پہلے معنوں کے ملزوم ہوں اور ان دوسرے معنی کا مقصود ہونا معنی موضوع بہ کے ارادے کے منافی نہیں کیونکہ استعمال اس لفظ کا موضوع بہ میں ہوا ہے تو ان معنی کے مقصود ہونے کے دوسرے معنی میں کوئی حرج پیدا نہیں ہوگا۔

پس کنایہ میں لازم موضوع بہ بھی مراد ہوتا ہے مگر فرق اتنا ہے کہ یہ بالفرض

مراد ہوتا ہے اور دوسرے معنی میں جو ملزوم ہیں وہ بات مراد ہوتے ہیں کیونکہ موضوع بہ کا مراد ہونا محض اس غرض سے ہے کہ جب سننے والے کے ذہن میں اس کی تصویر حاصل ہو جائے تو دوسرے معنی کی طرف جن سے کنایہ واقع ہوتا ہے، انتقال کرے۔''

(بحر الفصاحت، از نجم الغنی ص ۸۷۲-۸۷۳)

بحر الفصاحت میں لفظ پر کنایہ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ لیکن بات اگر اور بڑھائی جائے تو اس کے اطلاق ایک پورے فقرے اور شعر کے دونوں مصرعوں پر بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ جبکہ اشعار کی ظاہری فضا موضوع بہ کے ساتھ ساتھ دوسرے اشاراتی معنی کی بھی توضیح کرے۔ حدائق البلاغت میں کنایہ کے بیان کی طرف نظر کی جائے۔

''اصطلاح میں ذکر کرنا لازم کا اور مراد ہونا ملزوم کا اور یا اس کے معنی مراد نہ ہوں بلکہ وہ چیز مراد ہو کہ اس کے معنی کو لازم ہے۔''

کنایہ کی ان تعریفوں کی روشنی میں روشن لال روشن کے اشعار پر غور کریں تو شعر معاشرے کی موجودہ قدروں کی پامالی کے ساتھ ساتھ آئندہ کے ہولناک منظر نامے کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔ سراغ دشت ہنر عطا کرنا بمعنی نئے عذابوں میں مبتلا کرنا بھی اس دور کا المیہ ہے۔ ''کہاں گیا وہ'' اشاراتی فقرہ ہے۔ تیسرا شعر اپنے متن کے اعتبار سے حقیقی معنی رکھتے ہوئے بھی مضبوط مزاجی معنی رکھتا ہے۔ چوتھا شعر بھی موجودہ دور کے تعلقات کی نشاندہی کنایاتی طور پر بخوبی کرتا ہے۔

پانچویں شعر کا پہلا مصرعہ دنیا کے جم غفیر اور ان کے عصری ترقیاتی مزاجوں کا کنایہ ہے تو دوسرا مصرعہ ان کے نتائج کا اشاریہ۔ شعر نمبر چھ بے مثال شعر ہے۔ میرے خیال میں اس کی کنایاتی جہت کا ذکر ضروری نہیں۔ ساتواں شعر ''آسان'' اور ''مشکل'' لفظ سے کنایاتی حسن پیدا کرتا ہے۔

ایک اور خوبی جو روشن لال روشن کے اشعار میں جا بجا نظر آتی ہے وہ حسن تضاد ہے۔ ان کے متعدد اشعار اس صفت سے مزین ہیں۔ لیکن ان کے تضادات کے مرکزی معنی کا تعلق الفاظ کے ظاہر سے بہت کم اور علامتی اور استعاراتی طریقہ کار کی وجہ سے جو ابہام پیدا ہوتا ہے اس سے معنی کے مختلف امکانات روشن ہوتے ہیں، زیادہ ہے۔

روشن لال روشن کے یہاں سادہ بیانی میں بھی معنی کی پیچیدگی مخصوص مقام رکھتی ہے بعض اشعار میں تضاد کے ساتھ ساتھ اور بعض اشعار میں تضاد کے بغیر معنی کی وہ پیچیدگی ہے کہ واضح معنی کی سمت کے تعین کی دشواری کے بعد بھی شعر ان کی فنکارانہ مہارت کی مثال ہے۔ مثلاً ایک شعر صفت تضاد کی ضمن میں یہ ہے کہ۔

ذرے ذرے سے بن گیا صحرا　　　قطرہ قطرہ بکھر گیا پانی

اس شعر میں ذرے ذرے کا مقابل قطرہ قطرہ، بن گیا۔ بکھر گیا، صحرا۔ پانی کی لسانی ترکیب موجود ہے لیکن معنی کی کوئی واضح سمت نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پورا شعر ایک فلسفہ ہے۔ لیکن پھر بھی شعریات کے سیاق میں روشن لال روشن کے فن کا لوہا ماننا پڑے گا۔ اسی طرح بنا تضاد والا ایک شعر ہے۔

کوئی باہر ہی نہ ڈر سے نکلا　　　کوئی زندہ بھی نہ گھر سے نکلا

اس شعر میں بھی ابہام کی خوبی نمایاں ہے۔ دنیا کی مختلف بلاؤں سے ڈر کر ان سے بچنے کے لیے آدمی گھر

میں قید ہو کر عافیت محسوس کرتا ہے۔ حتی کہ سردی، گرمی اور بارش کی شدت جیسی قدرتی آفات سے بچنے کے لیے بھی آدمی گھر کی پناہ لیتا ہے۔ اب اس شعر کی معنوی وسعت پر غور کیا جائے تو سونامی کو بھی اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ زلزلے کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے۔ شدید برفباری کا منظر بھی اس میں قید ہے غرض پوری دنیا میں دنیاوی اور قدرتی آفات کی جتنی بھی قسمیں ہیں، یہ تنہا شعر ان تمام کی عکاسی کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ یہی شعر کی آفاقیت بھی ہوتی ہے۔ تضاد کے تعلق سے مزید اشعار ذیل میں درج ہیں۔

یہ زندگی ہے کہ روشنؔ سراپا محرومی — خدا کا شکر ہے مری طلب تمام ہوئی

مرثیہ دور پر آشوب کا اب ہوں روشنؔ — میں نے چاہا تھا کہ میں شعرِ غزل کا ہو جاؤں

ہر دکاں پر ہیں الٹی ٹنگی ساری بے کھال بھیڑیں — اور پر آب تلوار سے بوچڑوں کے بدن ہیں

لمحہ لمحہ چھان مارا زندگی در زندگی — خواب سے جاگا تو دیکھا جاوداں کوئی نہ تھا

ہم نہ سمجھے تھے سو پچھتائے بہت — فائدے میں بھی خسارہ کم نہ تھا

عہد کا بیاں ہوں میں — اور بے زباں ہوں میں

دانش مندی نادانی میں — مشکل ایسی آسانی میں

سراپا محرومی اور طلب کا تمام ہونا لیکن محرومی کے سبب طلب کا تمام ہونا ایک الگ نکتہ ہے۔ غزل کا شعر اور دور پر آشوب کا مرثیہ کے پس منظر میں فطرت اور ذہن کا تضاد نمایاں ہے۔ تیرا شعر جو اپنے موضوع، آہنگ اور اسلوب کے اعتبار سے نیا اور انوکھا منظر پیش کرتا ہے۔ سماج میں بکھرے ہوئے ان موضوعات پر ہماری نظر بہت کم جاتی ہے۔ زندگی اور جاودانی فائدہ میں خسارہ۔ بے زبان بیان، نادانی میں دانش مندی اور آسانی میں مشکل کا حسن تضاد خود بیان کرتا ہے کہ شاعر کی لسانی ترکیبات پر کتنی دسترس ہے۔ یہاں روشن لال روشنؔ نے اس عوامی حسی ذہن کا استعمال زیادہ تر کیا ہے جو سادہ اور عام الفاظ کی ندرت کو زیادہ قبول کرتا ہے۔ یہ بات اور کہ موقع اور محل کو دیکھتے ہوئے ان کا مشاہداتی ذہن بحیثیت معاشرے کے ایک حساس فرد کے معاشرتی فضا کی پیچیدگیوں کی عکاسی کے لیے پیچیدہ معنی سے پر الفاظ کا انتخاب بھی کرتا ہے۔

ایک اور آسماں بالائے آسماں دیکھوں — میں زینہ زینہ اڑانوں کو رائگاں دیکھوں

مرے کردار کا آخر ورق بھی — کتابوں سے نکالا جا رہا ہے

عجب منظر فضا کا — لہو پانی ہوا کا

اک غزل، اک شعر اک حرف دگر — ورنہ یارو! یہ شمارہ کم نہ تھا

زندگی کی شراب پانی ہے — اور وہ بھی خراب پانی ہے

زباں تو پی چکی جام شہادت — لب اظہار تو محفوظ کر لو

بھوک کو کر لیا انا کا لباس — کیا کریں کھیت ہی کپاس کا ہے

روشن لال روشنؔ نے غزل کی روایتی شعریات کو برتتے ہوئے اپنے شعری موضوعات کو واقعاتی سطح پر عام زندگی کے معاملات کے تذکروں کے ساتھ منسلک کر کے بہت اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کے اشعار میں افرا

تفریح انوکھے، معمولی اور روزمرہ کے واقعات جن میں بعض حیرت انگیزی کا پہلو بھی شامل ہے، معاشرے کے حساس فرد کی نصف سے زاید زندگی کے مشاہداتی تجربات کی عکاسی کرتے ہیں۔ روشن لال روشن نے زندگی کے ہر طبقے کو ایک سیدھے سادے مگر حساس ذہن کے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ ذات، ناکامی فریب خوردگی، فریب شکستگی جیسے موضوعات میں معاشرے سے منسلک ہوتے ہوئے بھی بے نیازی کا تاثر اور پھکڑ پن کے جذبات کا اظہار بھی روشن لال روشن نے اپنے اشعار میں بخوبی کیا ہے۔ یہ بھی ان کے اشعار کا ایک امتیاز ہے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ بعض معنی پیچیدگی کی حد میں داخل ہیں لہٰذا جلد گرفت میں نہیں آتے لیکن بعض اشعار متن کے اعتبار سے سادہ ہوتے ہوئے بھی معنی کی ایک فلسفیانہ پیچیدگی یا دوسرے لفظوں میں حکایاتی پیچیدگی یا محاوراتی پیچیدگی لیے ہوتے ہیں ان کا مقام و مرتبہ معنی کی کسی مخصوص حد سے بے نیاز ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہنا کہ "ایک شعر میں جہان معنی آباد ہیں" رٹا رٹایا جملہ ہے جو کم و بیش ہر کس و ناکس شاعر کی تعریف میں ہمیں اکثر تحریر کیا ہوا دکھائی دے جاتا ہے۔ لیکن جب ہم اس جملے کے سیاق میں روشن لال روشن کے اس قسم کے اشعار دیکھتے ہیں۔

مجھ کو تو مر جانا ہے	جس کو جینا ہو گھبرائے
خوبصورت دل نشیں آرام جاں ہے زندگی	ڈھونڈ کر لاؤ اسے یارو! کہاں سے زندگی؟
ایک چوہا بھوک سے گھبرا گیا	گوند کو حلوا سمجھ کر کھا گیا
بھیڑ بے ہنگام تھی چاروں طرف	آج چوراہا بھی خود چکرا گیا
میں نے بلیا میں اتر کر سانس لی	خیر میرا دوست تو چھپرا گیا

تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس جملے کے ایک اصل حقدار ان کے اشعار بھی ہیں۔ پہلے دوسرے شعر کے نکات خود عیاں کرتے ہیں کہ ان کے اندر کتنے معنی پوشیدہ ہیں۔ تیرے شعر میں علامت کی کارفرمائی کس خوبصورت رنگ میں نظر آتی ہے کہ چوہا جیسا چھوٹا جانور جو ہلکی سی آہٹ سے بھی اپنے سامنے پڑا ہوا دانہ چھوڑ کر حفاظت کی جگہ بھاگتا ہے اور اگر دوبارہ موقع نہ ملے تو جو اسے مل گیا اس پر قناعت کرتا ہے۔ وہ بھی بھوک سے گھبرا کر گوند کو حلوا سمجھ کر کھانے پر مجبور ہے۔ اب دنیا کے مفلس، دبے، کچلے افراد جن کی حیثیت اور مقام و مرتبہ چوہے سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کے موجودہ حالات کا اندازہ اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے۔ چوتھا شعر بڑھتی ہوئی آبادی کے المیے کو کس مزاح کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ پانچواں شعر ہندوستان کی لوکل ٹرین، پسنجر ٹرین (سواری گاڑی) اور تھرڈ کلاس ڈبے میں سفر کرنے والے افراد کے حالات کا آئینہ ہے۔ جانوروں کی طرح ریل کے ڈبوں میں بھرے ہوئے افراد کے حالات ہم کسی بھی ریلوے اسٹیشن پر دیکھ سکتے ہیں، اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہاں بلیا (Balia) اور چھپرا (Chhapra) کی وضاحت بھی کردوں کہ بلیا ہندوستان کے سب سے بڑے صوبہ یو. پی. اتر پردیش (Uttar Pradesh U.P.) کا آخری شہر ہے اور دوسرے صوبہ بہار (Bihar) کا بارڈر ہے، دہلیز ہے۔ اس سے آگے بہار کا پہلا شہر چھپرا ہے۔ بلیا سے چھپرا کی دوری بہت زیادہ نہیں ہے۔ لیکن ریل گاڑی کے لوکل ڈبوں میں سفر کا تجربہ جو متکلم نے بیان کیا ہے کہ اپنے حساس ذہن کی بدولت اسے مشاہدہ ہوا کہ وہ صحیح سلامت منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا۔ "سانس لینا" بھی یہاں محاوراتی طور پر مختلف مقامات پر مختلف معنی رکھتا ہے۔ بھیڑ اس قدر تھی کہ اس نے بلیا میں اتر کر سانس لی۔ یعنی

اپنے دوست کے ساتھ چھپرا جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن اسے یہ اطمینان ہے کہ میرا دوست منزل مقصود کی طرف گیا۔ اس ''خیر'' میں ایک بے چینی بھی ہے کہ پتہ نہیں وہ کس حال میں چھپرا گیا۔ پہنچا کہ نہیں پہنچا یہ معاملہ مبہم ہے کہاں سے سفر شروع ہوا تھا یہ بھی مبہم ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان تمام واقعات کا ذکر شعر میں نہیں ہے۔ صرف دو شہروں کے نام اور الفاظ کی لسانی ترکیب سے کم از کم ہندوستان کی سطح پر عہد حاضر کا یہ بہت بڑا مسئلہ بیان کر دیا گیا ہے۔

یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ ہم اس شعر سے لطف اندوز ہونے کے لیے بلیا اور چھپرا شہروں کے بارے میں واقفیت رکھیں بلکہ یہ دونوں پوری دنیا نہیں تو کم از کم پورے ہندوستان میں کسی بھی دو جگہوں کی علامت بننے کی قوت رکھتے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس قسم کے اشعار کی کامیابی کا زیادہ تر دار و مدار شعریات کے ایک اہم رکن ''کیفیت'' پر ہے۔ کیفیت کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی کا بیان ملاحظہ ہو۔

> ''درحقیقت کیفیت اس چیز کا نام ہے جس کو ذہن میں رکھ کر بیدلؔ نے اپنا مشہور فقرہ کہا ہوگا کہ ''شعر خوب معنی نہ دارد''۔ یعنی وہ صورت حال جب شعر میں کوئی خاص معنی نہ ہوں۔ یا اس کے معنی پوری طرح فوراً ظاہر نہ ہوں لیکن اس کا جذباتی تاثر یا محاکاتی اثر فوری ہو۔ بعض اوقات ایسے شعر کے معنی بیان بھی نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر اس کا جذباتی تاثر یا محاکاتی اثر دیرپا نہ ہو، یا بعض مخصوص سیاق و سباق کا محتاج ہو تو اس شعر میں کیفیت نہیں بلکہ سطحیت ہوگی۔''
>
> (شعر شور انگیز۔ از شمس الرحمٰن فاروقی۔ جلد اول ص ۵۰، ۵۱)

اور جیسا کہ اشعار سے واضح ہے کہ روشن لال روشنؔ کے یہاں سطحیت کا نام و نشاں تک نہیں ہے۔ روشن لال روشنؔ نے ''خاک'' اور ''لہو'' کو بھی بطور تمثیل، استعارہ، کنایہ اور علامت متعدد جگہ پر اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چپ رہا خاک کے بھرم کے لیے	وہ لہو جو کہ بے زبان نہ تھا
لہو کے سب معجزے دکھا کر کہاں گیا وہ	یہ خاک بے زر پہ گل کھلا کر کہاں گیا وہ
لہو کے خط کو پڑھ کر خاک روئی	معانی نقش ہیں تحریر گم ہے
خاک سونا ہوگئی اب کے لہو پانی ہوا	رات دن یہ لوگ ہیں اپنی دوکاں کھولے ہوئے
دیر کیا ہے خاک جاں کو گل نمو کرتے ہوئے	پر لہو دامن کشا ہے آرزو کرتے ہوئے
خاک کو ذوق نمو بھی چاہیے	قطرہ بھر تن میں لہو بھی چاہیے
خاک سوداگر سیاست داں لہو	جھوٹ سچ وہم و گماں کچھ بھی نہ تھا

جدیدیت کے رجحان سے متاثر ہو کر لکھنے والے جدید شعرا پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ذات کے حصار میں اپنے کو مقید کر لیا ہے۔ معاشرے کے مسائل سے اپنے کو علیحدہ کر لیا ہے اور ایک داخلی دنیا اپنے خوابوں میں سجا کر ظاہری دنیا میں اس کی تعبیر کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر معاشرتی مسائل سے جڑنے کے بعد تحاریر کے موضوعاتی یکسانیت کا جو ایک لمبا سلسلہ چلا اس نے دوسرے

داخلی اور روحانی مسائل کی توجہ نہیں کی۔ جدیدیت میں اجتماعیت انقلاب اور سیاست وغیرہ موضوعات جو ترقی پسند ادبا و شعرا کے خصوصی موضوعات تھے، مکمل طور پر انکار کرنے کی کوئی مستحکم دلیل تو نہیں ملتی البتہ ان کی وہ کثرت جدیدیت کے حامی شعرا کے یہاں نہیں ہے لیکن باقی سے لے کر روشن لال روشن کے عہد تک جدیدیت کے حامی شعرا کے یہاں علامت اور استعاراتی اور ابہام سے پر متعدد اشعار موجود ہیں۔ حتیٰ کہ تجریدی افسانے جو سب سے زیادہ ان الزامات کی زد میں آئے میں بھی بعض ایسے ہیں جو انقلاب اور سیاست کے موضوع کی بہت عمدہ ترجمانی کرتے ہیں۔ بلراج مین را کا افسانہ کمپوزیشن چھ (۶) اور سریندر پرکاش کا بازگوئی اس کی بہت عمدہ مثالیں ہیں۔ روشن لال روشن کے اشعار بھی مندرجہ بالا مفروضات کے باطل ہونے کے بین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ جیسا کہ شعر نمبر ۷ واضح کرتا ہے۔ مزید اشعار کو دیکھا جائے۔

پہلے اندھا تجھے وہ کر دے گا	اور پھر اپنی ہی نظر دے گا
سازشیں موت کی کرے گا وہ	زندگی کی دعا مگر دے گا
برگ و بار میرے ہیں اور نہ اک ثمر میرا	پھر بھی باغ میرا ہے پھر بھی ہر شجر میرا

تیسرا شعر ممکن ہے کہ اکبرالہ آبادی کے شعر

کچھ بھی نہیں ہمارا، وہم و گماں ہمارا	رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا

سے متاثر ہو کر کہا گیا ہو۔ لیکن متکلم یہاں کچھ بھی نہیں ہمارا'' کہہ کر بیزاری کا یا طنز کا یا فرار کی راہ ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یقیناً اکبرالہ آبادی کا شعر اپنے دور کے معاشرے اور ماحول اور آج کے معاشرے اور ماحول پر صدفی صد درست بیٹھتا ہے۔ یہاں عرض یہ کرنا ہے کہ روشن لال روشن نے مرکزی خیال کو رہنما بناتے ہوئے برگ و بار، ثمر، باغ، شجر سے اس سے آگے کی بات کہنے کی کوشش کی ہے اور کافی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اس طرح ان کے اشعار میں جدیدیت کے بیش تر نمائندہ شاعروں سے استفادے کا رجحان ملتا ہے۔ لیکن ان سب کے اسلوب اور لسانی ترکیبات کو یکجا کر کے ان کے درمیان سے اپنی شناختی راہ نکالنا بہت مشکل ہے لیکن روشن لال روشن نے یہ کر دکھایا ہے۔ انھوں نے جدیدیت کے رجحان سے جو بھی مستعار لیا اس کو عام فہم اسلوب میں موجودہ معاشرے سے منسلک کر کے بیان کر دیا۔ الفاظ کی جدت اور فلسفیانہ لسانی ترکیب ان کے ماہر فن ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ اپنے پیش رو شعرا حضرات سے انھوں نے جو بھی نکات مستعار لیے اس کو شعر میں برتتے ہوئے (لسانی حوالوں سے یا موضوعاتی حوالوں سے) ان سے آگے جانے کا رجحان ان کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ ان کے اشعار میں آمد کا دخل بہت کم اور آورد کا بہت زیادہ ہے۔ شعر کو بنانا، سنوارنا اور پیچیدہ موضوع کو بعض اوقات فلسفیانہ لسانی ترکیب میں ڈھال دینا اور اس کے لیے بھی اپنے ذہن میں معاشرے کے عام حساس فرد کے ذہن و جذبات اور حالات کی تصویر کشی کر کے، اس کو اپنے تصور میں لا کر اس کے ذہنی سروکار کے اظہار کا فن روشن لال روشن کی اختراع ہے۔ ان کی شاعری میں مضمر یہ تمام نکات مل کر انھیں جدید شعرا کی صف میں ممتاز حیثیت کا حامل بنا دیتے ہیں۔

خالد جمالؔ کی شاعری۔ جدیدیت کی آزاد فضا میں

جاوید انور (وارانسی)

خالد جمالؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے وحید اختر، خلیل الرحمٰن اعظمی اور آل احمد سرور کا جدیدیت کے سلسلے میں ایک خیال جس پر کہ یہ تینوں حضرات متفق ہیں۔ ذہن میں فوراً آتا ہے:

''جدیدیت ایک ایسا مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔''

(وحید اختر)

''جدیدیت خلا میں لٹکی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ اس کی جڑیں اپنی روایت میں ہوتی ہیں۔ جو شاعری اپنے ماضی سے بالکل کٹ کر جدید ہوگی وہ صحیح معنوں میں جدید بھی نہ ہوگی۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

''جدیدیت ایک مستقل قدر ہے، اس لیے کہ زندگی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔''

(آل احمد سرور)

غور کیا جائے تو ان میں محض چند فارمولے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن آزادانہ تخلیقی تقاضے تو یہ ہیں کہ جدیدیت کو ان سے بھی آزاد رکھا جائے۔ یعنی جدیدیت ایک ایسا مستقل عمل ہے جو جاری ہو بھی سکتا ہے اور بعض تخلیقات کی روشنی میں اگر یہ امکانات نہ بنتے ہوں تو بھی اسے جدید ہونے سے خارج نہ کیا جائے۔ اگر شاعری اپنے ماضی سے کٹ بھی جائے تو وہ صحیح معنوں میں جدید ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ اور جدیدیت کی قدریں یا بنیادی مستقل قدر زندگی کے ساتھ جدید تخلیقی اصولوں کی روشنی میں تبدیل ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ دراصل ہم جس دور میں جی رہے ہیں، سانس لے رہے ہیں، یہ صنعتی دور ہے اور جب صنعتی دور کا شاعر اپنی شاعری میں ان خیالات کا اظہار کرتا ہے:

اس دیارِ کُن میں آخر کوئی ہم جیسا بھی ہو — ڈھونڈتے رہیے زمیں تا آسماں کوئی نہیں

وہ ایک عکس جو دھندلا گیا ہے آنکھوں میں — نہ جانے کس لیے حرفِ دنوا ہی چاہتا ہے

لہو بھی رنگ ہو اور خاک سرخرو ہو جائے — یہ معجزہ بھی تو مجھ سے خدا ہی چاہتا ہے

کہاں تلک میں سنبھالے رکھوں گا پلکوں پر — تو میرے خوابوں کو اب ٹوٹنے بکھرنے دے

جنوں کی راہ میں اٹھتی ہوئی یہ گردِ ملال — نہ جانے کون سی تصویر اب ابھرنے دے

تو دراصل اس خوف، تنہائی، احساسِ جرم اور انتشار کا بیان کرتا ہے جو ۱۹۶۰ء کے بعد رونما ہوئے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کے پہلے کے زمانوں میں خوف، تنہائی اور اس طرح کے احساسات نہیں پائے جاتے تھے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی نوعیت یکسر مختلف تھی۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آج کا دور صنعتی دور ہے تو اس کا

مطلب یہ ہرگز نہیں کہ پہلے کے ادوار صنعتی نہیں تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کی صنعت اور اس دور کی صنعت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلے جن چیزوں کا تصور بھی محال تھا، آج وہ رائج ہیں اور پہلے جن چیزوں کے وجود کا تصور بھی محال تھا آج وہ موجود ہیں۔ اس طرح آج کے دور کے نشیب و فراز کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ خالد جمالؔ کی شاعری میں آج کے خیالات کی عکاسی دورِ حاضر کی شعری زبان کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی گئی ہے تو غیر مناسب نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ ایک طرح کی نظریات قید بھی ہو سکتی ہے اور اس نظریے کا اطلاق خالد جمالؔ کی مکمل شاعری پر نہیں کیا جا سکتا۔

سفر تمام ہوا گردِ جستجو بھی گئی — تری تلاش میں نکلی تو آرزو بھی گئی
اک انتظار سا تھا برف کے پگھلنے کا — پھر اس کے بعد تو امید آبجو بھی گئی
نہ بادباں نہ تلاطم، نہ کچھ ہوا کی خبر — سفینے ڈوب گئے کچھ تو ساز باز ہوئی
شکست و فتح کے بارے میں سوچتے ہم بھی — مگر وہ جنگ لڑی ہے جو بے جواز ہوئی
انا شعار وہ رشتے لہو لہو ٹھہرے — کہ حرف حرف تھا اک ضرب جاں شگاف مرا

ان اشعار میں تاریخی تسلسل کے ٹوٹنے کا کوئی رجحان نظر نہیں آتا۔ لیکن ان سے انسلاک کی کوئی واضح صورت بھی ہمیں لسانیاتی طور پر نہیں محسوس ہوتی۔ یہی جدیدیت کا آزادانہ تخلیقی رویہ ہے جس کے بارے میں باقر مہدی اس طرح رقم طراز ہیں۔

''نئی نسل اب ایک شاخ ہی نہیں بلکہ الگ ایک پودا ہے اور وہ پچھلی نسل سے برسرِ پیکار ہے...... جدیدیت انسان کو ایک فرد سمجھتی ہے۔ لاشعور اور شعور کی آویزش کو زندگی کی دلیل اور شخصیات کے پروان چڑھنے کا ذریعہ سمجھتی ہے، جدیدیت ایک طرف تو اقدار کے پیمانوں کو رد کرتی ہے تو دوسری طرف ذاتی تجربے اور جستجو کو لبیک کہتی ہے.....وہ شہری کے رول اور شاعر کے منصب میں فرق کرتی ہے.... جدیدیت تعمیر اور تخریب کی پر فریب اصطلاحوں کو رد کرتی ہے، وہ ادب کو سب سے پہلے ذات کا آئینہ قرار دیتی ہے۔ لیکن ذات کو حرف آخر نہیں سمجھتی اس لیے کہ جدیدیت حرف آخر کی سرے سے قائل ہی نہیں ہے۔''

اس نظریے کو ملحوظ رکھتے ہوئے خالد جمالؔ کے مزید اشعار کو دیکھا جائے:

تھکن کا بوجھ لے کر کوئی کتنی دور چلتا ہے — مگر جب راہ میں اک میل کا پتھر نکل آئے
یہ خوں اگلتے مرے اطاعت گزار لمحے — یہی امیں تھے بساطِ جاں پر مدافعت کے
وحشتیں کھینچ رہی تھیں دامن — آخرِ شب وہ سحر ختم ہوا
خاک نم چاہتی ہے جمالؔ — اک قدم آگہی کی طرف

خالد جمالؔ کے یہ اشعار جہاں انسانی عقل و عمل کے نئے مظاہر کی آئینہ داری اس طرح کرتے ہیں کہ پرانے مظاہر جدید کی اصطلاح میں قدیم محسوس ہوتے ہیں۔ دراصل جدید رجحانات کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہر وہ

تجربہ اور ہر وہ مظہر جو شخصیت اور مسائل کے تعلق سے کسی نہ کسی پہلو سے نئے انسان سے کچھ بھی ربط وضبط رکھتا ہو، جدیدیت سے منسلک ہے یا ہوسکتا ہے۔ خالد جمالؔ کی شاعری کا یہ پہلو آل احمد سرور کے جدیدیت کے متعلق اس بیان کے عین مطابق ہے۔

''جدیدیت صرف انسان کی تنہائی، مایوسی اور اس کے اعصاب زدگی کی داستان نہیں ہے۔ اس میں انسانیت کی عظمت کے ترانے بھی ہیں، اس میں فرد اور سماج کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں انسان دوستی کا جذبہ بھی ہے۔ مگر جدیدیت کا نمایاں روپ آج آئیڈیالاجی سے بیزاری، فرد پر توجہ، اس کی نفسیات کی تحقیق، ذات کے عرفان، اس کی تنہائی اور اس کی موت کے تصور سے خالص دلچسپی ہے۔ اس کے لیے شعروادب کی پرانی روایات کو بدلنا پڑا ہے۔ اس کے اظہار کے لیے اسے علامتوں کا سہارا لینا پڑا ہے۔''

(جدیدیت اور اردو ادب، علی گڑھ ص ۱۲)

آل احمد سرور کے مندرجہ بالا بیان اور خالد جمالؔ کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدیدیت کے عناصر و عوامل جہاں فرد، اجتماعیت، قوم اور ملک کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں وہیں ان کا تعلق غیر قوموں اور عالم کی دیگر دنیاؤں سے بھی ہے۔ اور دور جدید میں صنعت نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں کے مسائل بھی ہمارے سامنے شفاف آئینے کی طرح عیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی کونے کا فرد دنیا کی کسی بھی قوم اور ملک کے مسائل سے بیگانہ اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح غور کیا جائے تو خالد جمالؔ کے اشعار میں مشرق و مغرب کی ہمعصر حقیقتوں کا بیان علامتی اور کہیں استعاراتی طور پر موجود ہے۔

جستجو زاد سفر ہے اب بھی	واہمہ سوئے مفر ہے اب بھی
شفق شفق شورشیں لہو کی	زبان آشفتگان چپ ہے
ہم قافلے کے رخ کا تعین نہ کر سکے	ہر نقش معتبر کو مٹاتی رہی ہوا
بہت ہے اتنی ہی اظہار ذات کی خاطر	چراغ صبح کی یک لمحہ زندگی ہے تو کیا
ایسا بھی نہیں اس کی تمنا ہی نہیں کی	یہ بات الگ ہے کہ میں اس کا بھی نہیں ہوں

خالد جمالؔ نے اپنے اشعار میں ان سماجی سطحوں کو تو بیان کیا ہی ہے جن کے پھولنے، پھلنے، سمٹنے، بکھرنے اور نت نئی شکل وصورت اختیار کرنے کا اثر تخلیق کار کی ادبی حسیت پر بھی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انفرادی سطح پر انسان کی روحانی اور داخلی ضرورتیں اور اس کے لوازمات بھی بہت اہم ہوتے ہیں۔ اس سطح پر اشعار نظم کرتے ہوئے تخلیق کار پر مرتب ہونے والے اثرات جن کو مختلف صورتوں کے ساتھ برتا ہے، یہ شعوری اور لاشعوری عملیات جن کے ذریعہ خالد جمالؔ نے اپنے اشعار کی تشکیل کی ہے، وہ انسان اور کائنات بمعنی دنیا اور اس کے محرکات کے تعلق سے حقائق کی ضمن میں ہمارے ذہنوں کو اشاراتی طور پر منعطف تو کرتے ہیں لیکن ان میں اقوال محال (Paradoxes) کی جانب زیادہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ میرے خیال میں خالد جمالؔ کو شاید اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ

اقوال محال کے تعلق سے جتنے بھی عناصر سے اشعار کو پر اثر بنایا جا سکتا ہے، ان کا بیشتر کام انھوں نے حقائق کے مختلف بیانیہ عناصر سے لیا ہے۔

عجیب راز زمیں و زماں کے کھلتے ہیں — کبھی جو حلقۂ دیوار و در سے نکلو تو
آگ دل کی یوں بڑھی دست طلب تک آئی — دیکھیے اب کون ٹھہرے دیدہ ور کے سامنے
اے جنوں خیز ہوا تجھ سے بھی ڈھائی نہ گئی — ایک دیوار اٹھی تھی جو من و تو کی طرح
دیار نور سے ملتی ہیں راہیں — یہ کالی رات فانی ہی نہیں ہے
کشتی بھی، بادبان بھی، موجیں بھی ہیں وہی — سمتیں بدل رہی ہیں یہ کیسی ہوا چلی
دل و نظر کو اجالے بھی راس آئیں گے — یہ روشنی کا سفر ہے سنبھل سنبھل کے چلو

خالد جمال نے اپنے اشعار میں موضوعات کے تعلق سے وہ واقعات جن کے اظہار کے لیے اشعار کہے گئے ہیں، ان کی فنی خصوصیات کے متعلق شعر کی زبان، لفظوں کی ترتیب اور ان کی اہمیت، موضوع کے اعتبار سے خیال اور ہیئت کے مربوط تعلق، شعر کے داخلی اور خارجی آہنگ پر خصوصی توجہ کی ہے۔ انھوں نے جہاں اپنے اشعار میں سماجی مواد (Social Content) کو جگہ دی ہے وہیں جمالیاتی معروض کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی اشعار قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے اپنے شعری تجربات، خیالات اور محسوسات کو جہاں پیچیدہ تلازمات کے ساتھ علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ پیش کیا ہے وہیں قدر آسان اشعار بھی ان کے یہاں موجود ہیں۔ ان دونوں پہلوؤں کو ذہن میں رکھتے ہوئے پیچیدہ شاعری کے تعلق سے میراجی کا یہ خیال ذہن میں آتا ہے۔

> ''سچی شاعری وہی ہوتی ہے جو اشاراتی (علامتی) ہو...... بات کو دھند لکے میں رکھنے سے ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ علامت خیال سے بڑھ کر آپ روپی صورت ہے۔ اشاراتی شاعری اظہار کا ایک ایسا فطری طریقہ ہے جو ہماری ہستی کی گہرائیوں سے اُمڈ کر نمودار ہوتا ہے۔''

دوسرے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

> ''روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والی زبان میں موجود بھی خصائص، طریق کار اور سانچے شاعری میں بہ حسن موجود ہوتے ہیں اس لیے روزمرہ کی مستعمل زبان ہی شاعری کا میڈیم ہے۔''

ان دونوں نظریات کی روشنی میں خالد جمال کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے بہت مایوس ہیں — ایک چنگاری سہی ان کا بھی اب کوئی تو ہو
رشتوں کی بھیڑ بھاڑ سے اکتا گئے تو کیا — تنہائیوں کے شہر میں خود سے ملا کرو
سفینے کی طنابیں کھل رہی ہیں — لہو کی موج کو گرداب کر دے
ساتھ اب کوئی گوارا بھی نہیں — اے ہوا تیرا سہارا بھی نہیں
وہ عکس خواب ہے، پیکر نہیں ہے — شعور ذات سے باہر نہیں ہے

جانے کیوں اب کے غبار خاک بھی کچھ یوں اڑی ۔۔۔ موجۂ خوں رنگ پھیلی آسماں در آسماں
کوئی میرے پاس نہ آسکا میں کسی کے پاس نہ جا سکا ۔۔۔ ہے ہر ایک شخص گھرا ہوا کہ سبھی کا اپنا حصار ہے

ظاہر ہے کہ خالد جمالؔ کے اشعار مندرجہ بالا دونوں نظریات پر پورے اترتے ہیں۔ جدیدیت کی آزادانہ تخلیقی فضا جس کا ذکر میں نے کیا ہے وہ اگر اپنی تمام تر نہیں تو بیش تر خصوصیات کے ساتھ خالد جمالؔ کی شاعری میں نظر آتی ہے یہاں موجودہ عہد کا مشاہدہ بھی ہے اور مستقبل کے ادبی تقاضے بھی۔ جن کا اظہار خالد جمالؔ نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے۔

جلا رکھے ہیں چراغ ہم نے مسافرت کے ۔۔۔ کہ ہم مسافر نئے یگوں کے، نئی جہت کے

بھگوان داس اعجاز
نئی دہلی

سوچ کے پھلے کون تھا

رام رہیں گے اس طرف اور ادھر اسلام
جب سے گھر دو گھر ہوا، کھویا سکھ آرام
ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا جگر، سہتے درد اسیم
تو نے دیکھا ہے کبھی، گھر ہوتا تقسیم
ہوا رہ ایسا ہوا، بجی اینٹ سے اینٹ
گھر کی اک اک اینٹ پر پڑی خون کی چھینٹ
بجی اینٹ سے اینٹ جب، ہم نا ہوئے اداس
یہ گھر ٹوٹے گا کبھی، ہمیں خبر تھی خاص
سندھ گیا پنجاب بھی اور آدھا بنگال
ملک بنا جیسے بنے، مرے باپ کا مال
لوگ آپس میں کٹ مرے، دیس ہو گیا دھول
دیکھا آدھی اینٹ نے، کتنا پکڑا طول
سرحد پر اک پیڑ کی، چھاؤں ہوئی تقسیم
کاٹ کے دونوں لے گئے، آدھا آدھا نیم
آزادی ایسی ملی، ہوا اثاثہ راکھ
خانہ جنگی میں مرے بدنصیب دس لاکھ
اک دوجے کے خون کے پیاسے ہیں شیطان
ہمسائے تھے دیوتا کون بھر گیا کان
سڑکیں لہولہان ہیں، اور دھرم ہے مون
اندھا ہے قانون بھی، پوچھے قاتل کون؟

عقیل شاداب
کوئٹہ

شیشے کی دیوار

اس طرف تم / اس طرف میں
بیچ میں / شیشے کی
دیوار ہے / دیکھ تو سکتے ہیں
چھو سکتے نہیں / وقت
مجبوری پہ / انہیں
ہنس رہا ہے / پاس ہو کر
دوری کا / احساس
دل کو / ڈس رہا ہے
دونوں ہی / شیشے سے
سر ٹکرا / رہے ہیں
خواہشوں کی / بے حجابی
دیکھ کر / شرما رہے ہیں
دونوں ہی / شرما رہے ہیں
کھو رہے ہیں / پا رہے ہیں

نظمیں

ڈاکٹر علی عباس امید
بھوپال

بستر علالت سے ایک نظم

پیرہن دھند کا سورج کا مقدر ٹھہرا
پلکیں بوجھل ہوئی جاتی ہیں دریچوں کی امید
دن کی دہلیز پہ آپہنچے اندھیرے شاید
پھر بجھے جاتے ہیں دیواروں کے روشن چہرے
بند ماحول میں ٹھہرے ہیں گریزاں لمحے
تازگی ایک چھلاوے کی طرح آکے چلی جاتی ہے
جاگتی آنکھوں کو بے نور بنا جاتی ہے
دن کی دہلیز پہ آپہنچے اندھیرے شاید
پھر سزا جاگتے رہنے کی ملے گی مجھ کو
ذہن کے دشت میں۔آوارہ خیالوں کے ہجوم
درد کے قافلے، جلتے ہوئے خوابوں کے ہجوم
یاس کے شانے پہ سر رکھے شکستہ احساس
ٹوٹے لفظوں میں الجھتی ہوئی آس
کوئی بھولا ہوا لمحہ، کوئی بسرا ہوا ساتھ
کوئی مانوس سی خوشبو، کوئی شفقت بھرا ہاتھ
ایک اک کر کے دبے پاؤں چلے آئیں گے
بجھ گئے ہیں در و دیوار کے روشن چہرے
ہو چکے اور بھی تنہائی کے سائے گہرے
درد کی لہر میں لپٹی ہوئی رات آپہنچی!
شب تو شب ہے یہ بہر حال گزر جائے گی
صبح کو آنا ہے، آئے گی، ضرور آئے گی
پلکیں بوجھل تھیں دریچوں کی وہ اب بند ہوئیں
ہاں مگر وا تھا در خواب سوا ہے اب بھی!!

شفیق علوی
کناڈا

اگرچہ وقت کے نقش و نگر ہویدا تھے
گرا تھا چیخ کے شب میں میرا مکاں تو نہیں
زمیں کی چھاتی سے سونا نکالنے والے
لیے تھے ہاتھ میں کشکول جو کساں تو نہیں
نظر جو آتی ہے سرخی فرات و دجلہ میں
یہ فیض پیر مغاں آب ارغواں تو نہیں
گلے میں جس کے پڑی ہے رسن سر بازار
وہ مصلحت کے تقاضوں کا سارباں تو نہیں
یہ دھیمی دھیمی لرزتی ہوئی صدائے سحر
ستم کے شہر میں گونجی ہوئی اذاں تو نہیں
یہ گوانتا نا موبے اور اجل کی ارزانی
شفیق آپ کو انصاف کا گماں تو نہیں

☆☆☆

غبار خاطر احباب اک دھواں تو نہیں
لگی ہے آگ جہاں، کوئی آشیاں تو نہیں
یہ گھن گرج سر افلاک، بجلیوں کا ہجوم
مزاج چارہ گر غم کے قصہ خواں تو نہیں
میری نگاہ میں خدشے ہیں ابر نیساں کے
چھپی ہوئی تہ دامان بجلیاں تو نہیں
اے عندلیب گہر بار اور شیریں مقال
قطع ہوئی جو چمن میں تیری زباں تو نہیں
یہ سرخ سرخ سحر اور شبنمی آنکھیں
دریدہ دامن ہستی کی داستاں تو نہیں

شاہین رضوی

میرے چھوٹے سے تاریک کمرے میں
وحشت ہے
سناٹا ہے
شکستگی ہے
جان لیوا تنہائی ہے
میری نبض شناس تنہائی
بوسیدہ لباس میں
گوش گل قیاس میں
زرد و کپاس میں
دامن کشف احساس میں
حزن کے اقتباس میں
قبائے حسرت و یاس میں
درو دیوار کے کف و پاؤ
سے لپٹ کر روتی ہے
دیر تلک روتے روتے
ایک فکر خوش قیاس کی
بانہوں میں سو جاتی ہے
میری تنہائی.....
اکثر میری تنہائی
عبیر گل پیراہن
میں ڈھل جاتی ہے

خان حسنین عاقب

مہاراشٹرا

انتشار ذات

عجیب پرپیچ وادیاں ہیں
جہاں کنویں اور کھائیاں ہیں
ہر ایک وادی، ہر ایک کھائی / غریب کا جیسے کوئی گھر ہو
کہ جس میں کھڑکی نہ کوئی در ہو
پہاڑ کوئی بڑا ہے قد میں
تو ننھے ننھے ہیں سارے ٹیلے
ہر ایک ٹیلے پہ میں کھڑا ہوں
پہاڑ کی ہر بلند چوٹی پہ عکس بن کر تو میں جڑا ہوں
جہاں سے نیچے کی سمت دیکھوں
تو منتظر ہیں عمیق گہرائیاں زمیں کی
ادھر ہے پیوند رشتہ خوں / ادھر بلاوا ہے چاہتوں کا
ادھر ہے الجھن شکن پری کی / ادھر تقاضہ ہے دلیری کا
ادھر ہے میری شکستہ پائی / ادھر فرائض کی پابجائی
عجیب عالم ہے کشمکش کا
کہ جیسے لاچار ہو تصوف بھی آتش کا
یا شیکسپیئر کی حیات کی ابتدا ہو جیسے
تو میرے بزدل ارادے اتنا مجھے بتا دے
کدھر میں جاؤں؟
گروں کنویں میں یا پھر لگا دوں چھلانگ
کھائی میں؟ یا کہ ہو جاؤں منجمد اب؟
مگر بہر کیف!
زندگی کی بلندیاں تو / یہیں رہیں گی!!!

دبیر احمد
ممبئی

کالی کالی رات

اندھے کنویں میں اندھا گورا ناگ
کنڈلی مارے پھن پھیلائے گھائل ہر انسان
چاند ستارے سوگئے سب چپ چاپ
خود غرضی کی چادر کو سونگھ گیا ہے سانپ
جگمگاتے صحرا پہ جیسے اگی کالی کالی رات

اندھیرے اجالے

گل پرافشاں کی خوشبو تیری زلفوں کی بات نہیں
بے باک حسن اجالے کی بات نہیں۔
اڑتے ہیں جگنو ہر سوں ستاروں کی بات نہیں
گنگناتے بھنورے، بلبل بیمار کی نہیں
چاند اور چکور کی طرح تیری میری ذات نہیں
بجلیوں کی کڑک تیری نگاہ مست کا خمار نہیں
برقی قمقموں آہ! تاروں بھری رات نہیں

اسلم عمادی
کویت

کابوس

دھندلی دھندلی آب وہوا میں
نیم رسیدہ آنکھوں پر کھلنے والا منظر
جیسے بجھتا سورج۔ مکڑی جال میں
ڈوب گیا ہے
مکڑی جال سے ابھر رہی ہے۔ ایک تڑپتی زخمی روشنی
مکڑی جال سے پھیل رہے ہیں۔
چاروں سمت گھنی اک جال سی روشنی چادر
کوئی آنکھ ہی اب ایسی ہو
جو اس جال کے اندر کے اصلی مطلب کو دیکھ سکے!!
شاید کوئی اک فنکار
اس گہرائی کو چھو پائے
چونک اٹھے، تشریح کرلے!

ڈاکٹر شبنم عشائی

سرینگر

مجھے
فرار بھری جوتیوں نے پہن لیا
اور ایک سفر / ایجاد کیا
میرے ساتھ
میری خاموشی ہے،
اک بے سوادی ہے
باقی سب / ثواب عشق وفا
نیندیں
سب کچھ جاگیرداری کے
کونے کھدروں میں
پڑے ہوئے ہیں!
خاموشی کے دامن سے
وفا کا دامن بڑا ہوتا ہے
پیروں کے چھالے پڑنے پر
وفا کی طلب بڑھتی ہے
میں مور کی مانند / اپنے پیر دیکھ کر
روتی ہوں / میرے قدم
مجھے واپس کردو / انتقال سے پہلے
میں اپنا دل
کہیں بو دینا چاہتی ہوں

اظہر نیر

دربھنگا

سیلاب

سیلاب کے خوفناک منظر سے
دل کانپ جاتا ہے / گھر، سڑکیں، ندی، تالاب
صرف پانی ہی پانی / اس میں بہہ جاتا ہے سب اثاثہ
کچھ نہیں بچتا ہے
کتابیں، نظمیں، غزلیں اور
تخلیقی چہرے خواب ہوئے
یادیں جل تھل ہو جاتی ہیں!
لڑکے سوچتے ہیں نہیں ہوگا میرا داخلہ
نہیں بن پاؤں گا ڈاکٹر، انجینئر
میرا مستقبل خواب بن کر رہ جائے گا
سب کچھ بہالے گیا سیلاب
آنکھوں میں پانی ہی پانی!!
جواں دوشیزائیں سوچتی ہیں
اپنے آپ سے پوچھتی ہیں
اب کیسے ہوگی شادی
کیا انہیں پہن پاؤں گی چوڑیاں
مرے مرمریں ہاتھوں میں نہیں لگے گی
سہاگ کی مہندی
کیوں آتے ہیں یہ خوفناک سیلاب
جس میں بہہ جاتے ہیں
حسیں خواب / اور رہ جاتی ہیں
دل سوز تعبیریں

شیدا رومانی

رائے چور

اکیلا پن

ازل ہی سے یہ پیر تسمہ پا بن کر
مری گردن سے چمٹا ہے
کئی صدیوں سے
جس کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہوں
کھلایا ہر قدم پر خوشۂ انگور تمنا!
بہت منت سماجت کی
یہاں تک کہ خود اپنا خوں پلایا
مگر ظالم سے چھٹکارا نہ پایا
بڑی مشکل سے
اندھیارے گپھاؤں سے نکل کر
کانچ کے شہروں میں آیا ہوں
اسی امید پر شاید
کہیں سے کوئی نسخہ ہاتھ آئے
اسے بے ہوش کردوں
اور کسی اندھے کنویں میں
پھینک آؤں

صاحبہ شہریار

سچ کیا ھے

یونہی کبھی
اچانک کوئی آجاتا ہے
خیال بن کر
اور بیٹھ جاتا ہے
ذہن کے کسی کونے میں
جھانکتا رہتا ہے لمحہ لمحہ
اور پھر
اچانک کسی روز
متشکل ہو جاتا ہے
اور میری چشم حیرت
ڈھونڈنے لگ جاتی ہے

ترسیل

بے باک، آزاد
سرحدوں کی
رواجوں کی
قید سے دور، بہت دور
چھٹپٹاتے رہتے ہیں
نوچتے رہتے ہیں....
میرے ذہن کو اکثر....
لفظ__ کہو تو کاغذ پہ اتار دوں؟

سعید روشن

بانسواڑہ

نظم

رات کے مسافر تھے
دوران کو جانا تھا
شب گزاری کرنی تھی
داستان سنانی تھی
داستاں حقیقت سے
دور دور ہوتی ہے
فکر کے دیاروں میں
سحر ایسا کرتی ہے
عقل سوتی رہتی ہے

☆

نہ قبول ہوئے
نہ رد ہوئے
یوں ہی صف بہ صف
ہیں کھڑے ہوئے
سبھی لفظ میری دعاؤں کے
جنہیں آنسوؤں نے بھگو دیا

تسنیم شہباز

کولکاتہ

اندھی قیامت، لہو، ماتم

تو پھر ایسا ہوا،
کہ میں نے آنکھیں موند لیں اپنی
کہ میرے جسم کے اندر
عجیب سی سن سناہٹ تھی،
جو ہر لمحہ
بھیانک گونج میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی،
وہ اک اندھی قیامت تھی،
جو میرے جسم کی اس قید سے باہر نکل جانے کو
پاگل ہو رہی تھی،
تو پھر ایسا ہوا،
کہ میں
تھکن سے چور خود اپنے لہو میں
تربہ تر
بے سدھ پڑا تھا،
سامنے تاریکیاں تھیں
دور کتے
جشن ماتم کر رہے تھے!

ڈاکٹر رام اوتار پانڈے
وارانسی

کیا کروں گا

گر زمیں بے چین ہو آکاش لے کر کیا کروں گا
ہے نہیں شردھا جہاں وشواس لے کر کیا کروں گا
آدمی ہو آدمی کی جان کا دشمن جہاں
اس دھرا پر میں بھلا مدھوماس لے کر کیا کروں گا
زندگی کو ساتھ جینے کی قسم جب توڑ دی
سوچتا ہوں تب ملن کی آس لے کر کیا کروں گا
جب کسی کے دل میں اوروں کے لیے دھڑکن نہ ہو
میں اکیلا درد کا احساس لے کر کیا کروں گا
بھوک جب انسان کے ایمان کو کھانے لگے
تیاگ اور بلیدان کا اتیہاس لے کر کیا کروں گا
لوگ اپنے سوارتھ تکڑم میں جہاں بے چین ہوں
اپنی کنٹھا یا گھٹن، سنتراس لے کر کیا کروں گا
جب نہیں فرصت کسی کو بیٹھنے کی پاس میں
پھر ٹھہاکے ہاس اور پریہاس لے کر کیا کروں گا
زندگی جینے کا جب احساس یا مقصد نہیں
آدمی ہے جیسے زندہ لاش، لے کر کیا کروں گا

क्या करुँगा

गर ज़मीं बेचैन हो आकाश लेकर क्या करुँगा
है नहीं श्रद्धा जहाँ विश्वास लेकर क्या करुँगा
आदमी हो आदमी की जान का दुश्मन जहाँ
इस धरा पर मैं भला मधुमास लेकर क्या करुँगा
ज़िन्दगी को साथ जीने की कसम जब तोड़ दी
सोचता हूँ तब मिलन की आस लेकर क्या करुँगा
जब किसी के दिल में औरों के लिए धड़कन न हो
मैं अकेला दर्द का एहसास लेकर क्या करुँगा
भूख जब इंसान के ईमान को खाने लगे
त्याग और बलिदान का इतिहास लेकर क्या करुँगा
लोग अपने स्वार्थ तिकड़म में जहाँ बेचैन हों
अपनी कुण्ठा या घुटन संत्रास लेकर क्या करुँगा
जब नहीं फुरसत किसी को बैठने की पास में
फिर ठहाके, हास और परिहास लेकर क्या करुँगा
ज़िन्दगी जीने का जब एहसास या मकसद नहीं
आदमी है जैसे ज़िन्दा लाश, लेकर क्या करुँगा

وِنے کپور غافل
وارانسی

ہماری کاشی (بنارس)

ہماری اس کاشی میں سب کچھ کشل ہے
یہاں سب کا جیون بڑا ہی سرل ہے
نفرت نے، دل کو یہاں نہ چھوا ہے
یہاں ہر لبوں پر دعا ہی دعا ہے
یہاں پیار ہر ایک دل میں بسا ہے
اظہر کی امی کشن کی بوا ہے
ہماری ہی بیوی کا بھائی ہے اسلم
جو مندر میں نارے لگاتا ہے بم بم
یہاں بہکی بہکی فضائیں ہیں ہر دم
یہاں گنگناتی ہوائیں ہیں ہر دم
یہاں پر محرم مناتے ہیں ہندو
عزاداری بڑھ کر نبھاتے ہیں ہندو
ہیں ہندو مزاروں پہ چادر چڑھاتے
یہاں شیخ جی مندروں میں ہیں جاتے
مندر کے آنگن، مسجد کھڑی ہیں
محبت سے ان کی بھی آنکھیں لڑی ہیں
یہاں نہ کسی کے بھی ماتھے پہ بل ہے
ہماری اس کاشی میں سب کچھ کشل ہے
یہاں سب کا جیون بڑا ہی سرل ہے
یہاں ساری بہوئیں ہیں بیٹی سے بڑھ کر
جو آتی ہیں سسرال ماں سے جھگڑ کر
یہاں ساس لیتی بہو کی بلائیں
بہو ان کو دیتی ہے جی بھر دعائیں
سسر ہے پتا سے بھی زیادہ پیارا
بہو رانی ہے ان کی آنکھوں کا تارا
نند کرتی ہے بھابھیوں سے ٹھٹھولی
اٹھے گدگدی سن کے دیور کی بولی
یہاں دادا پوتے ہیں سنگ بھانگ پیتے
جو مستی سے مرتے ہیں مستی سے جیتے
یہاں عمر کا کوئی پردہ نہیں ہے
دلوں میں چھپاوٹ کا گردہ نہیں ہے
یہ بھولے کی نگری ہے، بم بم رہی ہے
نہیں اس کا ثانی جہاں میں کوئی ہے
یہاں کی ہواؤں میں گیت و غزل ہے
ہماری اس کاشی میں سب کچھ کشل ہے
یہاں سب کا جیون بڑا ہی سرل ہے
ہم سب کی سانجھی یہاں ماں ہیں گنگا
نپٹتے ہیں تٹ پہ ہی جمن و چھنگا
یہاں گھومتے دن میں بلا ورنگا
نہیں ان سے کوئی بھی لیتا ہے پنگا
یہاں جانگھ کھولے کبھی گھومتے ہیں
پئے بے پئے سب یہاں جھومتے ہیں
بنا بات کے ہے یہاں بات ہوتی
یہاں گالیوں کی ہے برسات ہوتی
تٹ پر ہزاروں ہیں صافا لگاتے
اہیر اپنی بھینسیں اسی میں نہاتے
یہاں گرتا گنگا میں نالوں کا پانی
جسے پی کے چڑھتی ہے ہم کو جوانی
اسی جل کا پنڈت کرے آچمن ہے
وضو کر کے ملا کرے من کو چنگا
نہیں جوڑ اس کا نہ کوئی بدل ہے
ہماری اس کاشی میں سب کچھ کشل ہے
یہاں سب کا جیون بڑا ہی سرل ہے

हमारी काशी

हमारी इस काशी में सब कुछ कुशल है।
यहाँ सबका जीवन बड़ा ही सरल है।।

नफरत ने, दिल को यहाँ न छुआ है,
यहाँ हर लबों पर दुआ ही दुआ है,
यहाँ प्यार हर एक दिल में बसा है,
अज़हर की अम्मी, किशन की बुआ है,
हमारी ही बीवी का भाई है असलम,
जो मन्दिर में नारे लगाता है बम-बम,
यहाँ बहकी-बहकी फज़ायें हैं हरदम,
यहाँ गुनगुनाती हवायें हैं हरदम,
यहाँ पर मुहर्रम मनाते हैं हिन्दू,
अज़ादारी बढ़ के निभाते हैं हिन्दू,
हैं हिन्दू मज़ारों पे चादर चढ़ाते,
यहाँ शैख़ जी मन्दिरों में हैं जाते,
मन्दिर के आंगन, मस्जिद खड़ी है,
मुहब्बत से इनकी भी आंखें लड़ी हैं,
यहाँ न किसी के भी माथे पे बल है,

हमारी इस काशी में सब कुछ कुशल है।
यहाँ सबका जीवन बड़ा ही सरल है।।

यहाँ सारी बहुएं हैं बेटी से बढ़ कर,
जो आती हैं ससुराल माँ से झगड़ कर,
यहाँ सास लेतीं बहू की बलायें,
बहू उनको देती है जी भर दुआयें
ससुर है पिता से भी ज़्यादा प्यारा,
बहूरानी है उनकी आंखों का तारा,
ननद करती है भाभियों से ठिठोली,
उठे गुदगुदी सुन के देवर की बोली,

यहाँ दादा-पोते हैं संग भाँग पीते,
जो मस्ती से मरते हैं, मस्ती से जीते,
यहाँ उम्र का कोई परदा नहीं है,
दिलों में छुपावट का गरदा नहीं है,
ये भोले की नगरी है, बम बम रही है,
नहीं इसका सानी जहाँ में कोई है,
यहाँ की हवाओं में गीत-व-ग़ज़ल है,

हमारी इस काशी में सब कुछ कुशल है।
यहाँ सबका जीवन बड़ा ही सरल है।।

हम सब की सांझी यहाँ माँ हैं गंगा,
निपटते हैं तट पे ही जुम्मन-व-छंगा,
यहाँ घूमते दिन में बिल्ला-व-रंगा,
नहीं इनसे कोई भी लेता है पंगा,
यहाँ जांघ खोले सभी घूमते हैं,
पिये, बेपिये सब यहाँ झूमते हैं,
बिना बात के है यहाँ बात होती,
यहाँ गालियों की है बरसात होती,
तट पर हज़ारों हैं साफ़ा लगाते,
अहीर अपनी भैंसे इसी में नहाते,
यहाँ गिरता गंगा में नालों का पानी,
जिसे पी के चढ़ती है हमको जवानी,
इसी जल का पण्डित करे आचमन है,
वज़ू करके मुल्ला करे मन को चंगा,
नहीं जोड़ इसका, न कोई बदल है,

हमारी इस काशी में सब कुछ कुशल है।
यहाँ सबका जीवन बड़ा ही सरल है।।

ڈاکٹر دیو
وارانسی

فطرت

پرچھائیوں کے پیچھے بہت بھاگتا ہوں میں
پانی کی طرح نیچے بہت بھاگتا ہوں میں
جس راہ کے بے انتہا کانٹوں کا پتہ ہے
اس پر بھی آنکھیں میچے بہت بھاگتا ہوں میں

سوچا کہ بہت درد کی توہین ہو چکی
سمجھا کہ بہت غفلت یقین ہو چکی
دیکھا کہ بہت دیکھے گئے خواب جوئے شیر
اے ابر اے صبر زندگی ذہین ہو چکی

اپنی تلاش کی تو خدا مل گیا مجھے
میں اس کا کیا کروں گا یہ کیا مل گیا مجھے
مانگی تھی میں نے دنیا تو دنیا نہیں ملی
جو دنیا میں کہیں نہیں تھا مل گیا مجھے

پرچھائیوں کے پیچھے بہت بھاگتا ہوں میں

फ़ितरत

परछाइयों के पीछे बहुत भागता हूं मैं
पानी की तरह नीचे बहुत भागता हूं मैं
जिस राह के बेइंतहा कांटों का पता है
उस पर भी आँख मीचे बहुत भागता हूं मैं

सोचा कि बहुत दर्द की तौहीन हो चुकी
समझा कि बहुत गफ़लत-ए-यक़ीन हो चुकी
देखा कि बहुत देखे गए ख़्याल-ए-जूए-शीर
ये अब्र-ए-सब्र? ज़िन्दगी ज़हीन हो चुकी

अपनी तलाश की तो खुदा मिल गया मुझे
मैं इसका क्या करुँगा ये क्या मिल गया मुझे
माँगी थी मैंने दुनिया तो दुनिया नहीं मिली
जो दुनिया मे कहीं नहीं था मिल गया मुझे

परछाइयों के पीछे बहुत भागता हूं मैं

سنجے شریواستو
وارانسی

چیتنا

چیتنامنشیہ کی کھنگالی جائے
شکتیوں کی ووشتا میں اسہائے ہے منشیہ
گرنتھیوں کے نروریہ سپنے
سگھن ہو چلے ہیں
کھلی ہے ہوا اور ہلتے ہیں پیڑ
جھکتے بھی ہیں
لیکن اپنے ہی من سے،
باوجود سب کے
کہرا گھنا ہے
سائیں سائیں کرتی ہوا
کٹ کٹ کرتی ہے چڑیا
سونے ہیں گھر
کام پر کوئی گیا ہی نہیں ہے
لوگ سہمے گھروں میں
بند دروازے
راہ لیکن ہے خالی
نہیں ہے کوئی وہاں
بات اپنے سے کرتا کوئی جا رہا ہے
نکٹ میں نہیں ہے کوئی ایسے وکٹ میں
سرپ : دردر : سکھادتی
دردر : سرپ : کھادتی
ویاکرن کے بیچ میں اچمبھت
بات کو الٹتا ہے کوئی
مگر بات بنتی نہیں ہے

चेतना

चेतना मनुष्य की खंगाली जाए
शक्तियों की विवशता में असहाय है मनुष्य
ग्रंथियों के निर्वीय सपने
सघन हो चले है
खुली है हवा और हिलते हैं पेड़
झुकते भी हैं
लेकिन अपने ही मन से,
बावजूद सबके
कोहरा घना है
साँय-साँय करती हवा
किट-किट करती है चिड़िया
सूने हैं घर
काम पर कोई गया ही नहीं है
लोग सहमे घरों मे
बंद दरवाज़े
राह लेकिन है खाली
नहीं है कोई वहाँ
बात अपने से करता कोई जा रहा है
निकट में नहीं है कोई ऐसे विकट में
सर्प : दर्दुर : खादति
दर्दुर : सर्प : खादति
व्याकरण के सच में अचंभित
बात को उलटता है कोई
मगर बात बनती नहीं है

پرتپال سنگھ بیتابؔ

پلٹ دے کوہ و دریا
کوئی تیشہ صدا کا

(جاوید انور)

بلاعنوان نسل کا شاعر۔ پرتپال سنگھ بیتاب

خالد حسین (جموں)

پرتپال سنگھ بیتاب میرے لڑکپن اور جوانی کا دوست ہے۔ہم دونوں نے ادبی آوارگی کم وبیش ساتھ ساتھ شروع کی۔ ہم دونوں بزم فروغ اردو کی ادبی نشستوں میں اپنی تخلیقات کو تنقید کے لیے پیش کیا کرتے جہاں اکثریت روایت پسندوں کی تھی اور نئے رجحانات اور جدیدیت یا مابعد جدیدیت ان لوگوں سے ہضم نہیں ہو پاتی تھی۔ جس کی وجہ سے کئی بار بزم کا ماحول روایت پرستی کی راکھ اور نئے تخلیقی رجحانات کے الاؤ سے سرد اور گرم ہو جاتا اور کبھی کبھی تیز و تند ہوائیں بھی چلنے لگتیں۔ بزم فروغ اردو جموں کی ان نشستوں میں راجکمار چندن اور آنند لہر بھی ہماری ڈاچی کے سوار تھے۔ پرتپال سنگھ بیتاب نئے ذہن، نئی سوچ اور نئے رجحان کے ساتھ اردو شاعری کے اکھاڑے میں کودا تھا اور اپنے نظریے اور مطالعے کے زور پر کسی کو کم ہی خاطر میں لاتا تھا۔ بیتاب کے پاس الفاظ کی تہذیب تھی۔ تخیل کی رعنائی تھی، جدید سوچ تھی۔ وہ کائنات کے الگ الگ رنگوں کو علامتوں اور استعاروں کے ذریعے اپنی نظموں اور غزلوں میں پیش کرتا۔ وہ روایت پرست ہرگز نہ تھا البتہ اسے روایت پسند کہا جا سکتا ہے کیونکہ ماہیت اور دانش وحکمت والی کلاسکی شاعری کا وہ پرستار تھا۔ اساتذہ کے اشعار کو وہ نئے معنی دیتا۔

پرتپال سنگھ بیتاب نے اپنی شاعری کا آغاز راست گوئی سے کیا اور کسی کی تقلید نہیں کی۔ گوفنی لوازمات کے حوالے سے وہ ساحر سیالکوٹی سے اصلاح لیتا رہا لیکن بیتاب نے ان کے تصورات اور اثرات کو قبول نہیں کیا۔

میں نے کب کہا تو گہر نہیں	ذرا پتھروں سے جدا تو لگ
تو جمیل ہے یہ بجا مگر	مجھے بھی تو ذوق جمال دے
میں جو سنگ زاد ازل سے ہوں	میری آنکھ میں کئی خواب ہیں
مجھے گیلی مٹی سا نرم کر	کسی بت میں مجھ کو بھی ڈھال دے
جو برابری پہ دکھائی دے	کوئی ہوگا تیرے جہان میں
جو سوال ہوں تو جواب دے	میں جواب ہوں تو سوال دے

اچھا شعر آب حیات سے کم نہیں ہوتا۔ اسے آپ سونے کے پانی سے کاغذی پیرہن پر اتاریں یا کوئلے کے ساتھ دیوار پر لکھ دیں اس کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اسی طرح گھٹیا شعر کے لیے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذہن کی دھنک اور طاقت کی دھمک اور چمک چمچے تو پیدا کر سکتی ہے لیکن شعر کو عمدہ نہیں بنا سکتی۔ اچھی شاعری انسانی جذبوں کی ترجمانی کرتی ہے اچھے شعر کی عمر صدیوں پر محیط ہوتی ہے اور شاعر کو زندہ وجاوید بنا دیتی ہے۔ بیتاب کے یہ اشعار بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔

موجوں کے ساتھ دور تلک بہہ گئے تھے ہم　　پھر جانے کب چڑھا ہوا دریا اتر گیا
دیوار و در کھڑے رہے باہر اسی طرح　　اور زلزلہ مکان کے اندر اتر گیا

کوئی دن انا کو صفر دیکھنا　　پھر اپنی صدا کا اثر دیکھنا
چراغ آج بھی جل رہا ہے یہاں　　کبھی آکے میرا کھنڈر دیکھنا

نہ دے پختہ عمارت، اک کھنڈر دے　　میں بے گھر ہوں مجھے بھی کوئی گھر دے
نہ دے اونچائی میرے قد کو بے شک　　میری ہر شاخ کو لیکن ثمر دے
فرشتہ میرے حصے کا عطا کر　　مجھے بھی میرے ہونے کی خبر دے

پرتپال سنگھ بیتاب لا ابالی طبیعت کا مالک تھا۔ چائے خانوں میں محفلیں سجانا اور تین بٹا چھ کپ چائے کا آرڈر دینا اور مستی اور ملنگی میں دن گذارنا روز کا معمول تھا اور اسی ملنگی میں اس نے سائنسی مضامین میں گریجویشن کر لی اور پھر وکالت کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروسز کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ اس کی پہلی تعیناتی سول سیکریٹریٹ میں بحیثیت انڈر سیکریٹری ہوئی۔ جہاں ناچیز پہلے ہی سے موجود تھا اور نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ کے پرسنل اسسٹنٹ کے فرائض نبھا رہا تھا۔ چنانچہ اب محفلیں میرے دفتر کے کمرے میں سجنے لگیں۔ جس میں بیتاب کے ساتھ ساتھ سارا .K.A.S گروپ شامل ہوتا۔ بیتاب ہی کی بدولت میری شناسائی تنویر جہاں، نسیمہ لنکر مسعود سامون، سید افضل اللہ اور دلیپ سنگھ وغیرہ سے ہوئی اور یہ شناسائی دوستی اور برادرانہ رشتوں میں بندھ گئی اور ماشاءاللہ آج تک قائم ہے۔ اسی دوران بیتاب کی زندگی میں ایک طوفان آیا۔ اس طوفاں سے باہر نکلنے میں ناچیز نے بیتاب کا مضبوطی سے ساتھ دیا اور بیتاب انو بھابھی کے ہمراہ کچھ مدت میرے پاس رہے۔ کچھ دیر بعد طوفان تھم گیا اور بیتاب اپنے پیار کی کشتی کو کامیابی کے ساتھ بھنور سے نکال لایا اور اپنے طور زندگی جینے لگا۔ ان دنوں کی شاعری میں بیتاب کے ہاں تلخی، درد، کرب، پریشانی اور سماج کے دوغلے پن کی بدصورتی نظر آئے گی۔

ہر طرف آسیب نے جب اپنے پر پھیلا دیے　　اور کچھ چارہ نہیں تھا گھر کو ٹھکرانا پڑا

میری ہجرت عجیب ہجرت تھی　　گھر میں تھا پھر بھی گھر سے باہر تھا
مجھ پہ صدیاں گذارنے والو　　میں تو رستے کا میل پتھر تھا

تاریک جنگلوں میں تو محفوظ ہم رہے　　اپنی پناہ گاہوں میں بے آسرا ہوئے

گھر سے مجھے نکال کے خوش ہو گیا تھا وہ　　میں تو مگر بسا ہوا پورے نگر میں تھا
سر سے بھی اونچا ہونے کو سیلاب تھا مگر　　صحرا کا سلسلہ ابھی میری نظر میں تھا

پرتپال سنگھ بیتاب اپنے عقائد اور نظریات پر ثابت قدم رہا۔ اس کی شاعری سیاسی اور سماجی اتھل پتھل، تہذیبی آداب واطوار کی ٹوٹ پھوٹ، بے جوڑ اور غیر محفوظ زندگی، انتشار و خلفشار کی آئینہ بندی کرتی ہے۔

زلزلوں کا اک تسلسل شہر شہر　　لمحہ لمحہ خستگی گھر گھر اداس

آلام کی زد میں ہے مگر شاد بہت ہے　　دل عہد غلامی میں بھی آزاد بہت ہے
سو رنگ سے آباد کیا ہے اسے ہم نے　　یہ شہر تمنا ہے کہ برباد بہت ہے

اصلی چہرے کتنے سہمے سہمے نکلے　　ہمیں لوٹنے والے بھی ہم جیسے نکلے
کیا جوگی، سنیاسی، کیا بھوگی سنساری　　کپڑوں سے باہر ہم سب اک جیسے نکلے

آسکر وائلڈ کا قول ہے کہ جو شخص جسم اور روح میں امتیاز کرے۔ اس کا نہ کوئی جسم ہے اور نہ روح۔ اور اس قول پر بیتاب پوری طرح اترتا ہے۔ اس کے ہاں جسم اور روح ایک ہی جز کا نام ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ تصوف کی دنیا میں گھوم رہا ہے۔ صوفیائے کرام اور سنتوں کی بانی کی خماری میں مست ہے۔

ایک دن سوچا تھا اجلے ہو جائیں　　تن کو دھویا تھا کہ من یاد آیا
زندگی کٹ گئی بے ننگ و نام　　گور میں تھے تو کفن یاد آیا
جسے ہر روز باہر ڈھونڈتے تھے　　اس اک روز اندر دیکھنا تھا
قد آور اپنی خواہش تھی کہ خود کو　　تیرے قد کے برابر دیکھنا تھا
سارے دروازے کھلے باہر کی اور　　ایک دروازہ مگر اندر کھلا
آسماں چادر تیری پھٹ جائے گی　　میرے اندر کا اگر جوہر کھلا
دنیا میں ہم تھے تو اپنی یاد نہ تھی　　اندر سفر کیا تو باہر بھول گئے

بیتاب کے پہلے شعری مجموعے ''پیش خیمہ'' کا دیباچہ شمس الرحمن فاروقی نے لکھا۔ ان کا کہنا ہے: ''بیتاب اپنی نظموں میں تھوڑے تلخ، تھوڑے بہت رنجیدہ، تھوڑے آشفتہ نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں ابہام بھی ہے۔'' جبکہ بلراج کومل نے ''موج ریگ'' پر اپنے مضمون میں لکھا ہے: ''پرتپال سنگھ بیتاب کی غزلوں کا مطالعہ کرتے وقت مجھے اکثر احساس ہوا ہے کہ ان کا تخلیقی ردعمل انتہاؤں اور انتہاؤں کے درمیان رونما ہونے والے عوامل کی جمالیاتی تفہیم اور پیش کش سے وابستہ ہے۔'' وہ مزید کہتے ہیں: ''بیتاب کا قلم بیک وقت شاعر کا قلم بھی ہے اور مصور کا لمس تخلیق کار بھی اور اپنے دست ہنرمند سے انہوں نے جو تہذیبی منظر نامہ پیش کیا ہے وہ بیک وقت شاعرانہ ردعمل اور دانشورانہ دلآویزی کی گوناگوں روشنیاں لیے ہوئے ہے۔''

بیتاب کے اب تک پانچ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ''پیش خیمہ''، ''سراب در سراب''، ''خود رنگ''، ''موج ریگ'' اور ''نظم اکیسویں صدی'' ان کی کچھ نظموں کا انگریزی ترجمہ عزیز پریہار نے کیا ہے، جو کتابی شکل میں "The Third Strand" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اردو غزلوں کے دو انتخاب دیوناگری رسم الخط میں چھپ چکے ہیں۔ جن کے نام ہیں۔ ''کیکٹس اور گلاب'' اور ''شہر غزل''۔ اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعے بیتاب اپنی انفرادیت کا سکہ منوانے میں کامیاب رہا ہے۔ اس کے پاس ترنم نہیں مگر ایک منفرد لہجہ ہے۔ شعروں میں عام لفظوں کے تخلیقی برتاؤ اور سنجیدہ رچاؤ نے اس کی نظموں اور غزلوں کو فکر انگیزی بخشی ہے۔ ادب ہماری زندگی سے بناوٹ اور ظاہرداری کو باہر کر دیتا ہے اور سادگی، شائستگی، انکساری، حق اور سچ کو زندگی کا سرمایہ بنا دیتا ہے۔ ایک کامیاب ادیب اور شاعر انسانی رشتوں کی کیفیتوں اور سماجی زندگی کے تصورات اور نظریات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ پھر زندگی کی سچائیوں اور اس میں سے ابھرنے والے جذبات کو اپنی تحریر میں قلم بند کرتا ہے۔ اور اپنے تخیل، بصیرت اور فنی مہارت سے ایک فن پارے کو تخلیق کرتا ہے۔ پرتپال سنگھ بیتاب بھی اسی قبیل کا شاعر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ

''قاری اس کی شاعری کے لباس کے بھدے پن کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی روح میں اترنے کی کوشش کرے۔'' بیتاب کے پاس تخیل کی سحر کاری بھی ہے اور مشاہدہ بھی۔ گو اس کے کلام میں کہیں کہیں کھردراپن اور ابہام ملتا ہے لیکن اس کے لیے وہ سماج کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''میری شاعری زندگی کی شاعری ہے۔ زندگی میں کرب اگر اس قدر زیادہ ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔'' وہ یہ بھی کہتا ہے: ''جس نسل سے میں تعلق رکھتا ہوں وہ نسل ہی بلا عنوان ہے۔ پھر اس نسل کی نظموں کا عنوان کیوں ہو۔'' حالانکہ اس کی تقریباً سبھی نظموں کے عنوان موجود ہیں۔ نظم ''گر تو برا نہ مانے'' کا یہ بند دیکھیں:

''چشمے کی مدد سے دیکھتے ہو
اور کہتے ہو کہ ہائے
دنیا کتنی خوبصورت کتنی پیاری ہے
کبھی اسے اتار کر دیکھو
تو تمہیں معلوم ہو
کہ جنت کی حقیقت کیا ہے''

''غلاموں کے نگر میں
کس لیے پیدا ہوا میں
میرے اندر لوازم وہ بھی موجود ہیں
آزاد ہونے کے لیے
جو ہیں ضروری'' (شناخت کا المیہ)

''کبھی سوچتا ہوں
کہ اپنے اندر اگے ہوئے
سارے گھنے جنگل کو
کاٹ ڈالوں
لیکن پھر سوچتا ہوں
کہ یہی تو میری پناہ گاہ ہے
یہ نہیں رہے گا
تو میں چھپوں گا کہاں'' (گھنا جنگل میری انا کا)

''ہر اک کروٹ ہراساں
ہر اک بستر پریشاں
بھلا اس خوف کے عالم میں
کوئی سو سکا ہے'' (ایک نظم سے اقتباس)

''میں جنگل سے بھاگوں
جنگل میرے پیچھے بھاگے
او بڑکھا بڑ چٹانوں سے
خوف نہیں ہے
خوف ہے ان میدانوں سے
میدانوں میں
ہر گام پہ جنگل گہرا ہے
میں جنگل سے جتنا بھاگوں
جنگل اتنا
میرے اندر اگتا ہے'' (ہر گام پہ جنگل گہرا ہے)

یہ اقتباسات بیتاب کی نظموں کے حالیہ مجموعے ''نظم اکیسویں صدی'' سے ہیں جن کے بارے میں بیتاب کا کہنا ہے کہ اس کی یہ نظمیں اکیسویں صدی میں ہی سمجھی جا سکیں گی۔ ''نظم اکیسویں صدی'' کے حوالے سے کرشن کمار طور کا ایک مضمون ''ستارہ ہفت رنگ'' کتاب میں شامل ہے جس میں طور صاحب کا کہنا ہے کہ ''بیتاب کی نظموں میں فکر و بصیرت اندرون سے نکل کر ہمہ طرف دور رس اثرات چھوڑتی ہے۔'' وہ کہتے ہیں ''بیتاب نے اپنی نظموں کی تعمیر و تشکیل کچھ اس انداز سے کی ہے کہ یہ ان کے ذہنی اور جذباتی آہنگ کی مثال بن گئی ہے۔ نظم ان کے تاثراتی تشخص کی پہچان بھی ہے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی مظہر بھی۔''

پرتپال سنگھ بیتاب کو غزل اور نظم پر برابر کی مہارت حاصل ہے۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ اصل میں وہ غزل کا شاعر ہے یا نظم کا۔ کیونکہ دونوں اصناف افادیت اور تاثیر میں اضافہ کرتی ہیں۔ ہاں یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ شاعر ہے اور شاعری اس کا پہلا اور آخری عشق ہے۔ حالانکہ اس نے نثر میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے تنقیدی مضامین پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے پیش لفظ اور دیباچے بھی رقم کر چکا ہے۔ لیکن شاعری اس کی روح کی خوراک ہے۔ بیتاب کے پاس چشم بینا ہے۔ اس نے غزلوں کے لیے سہل، رواں دواں بحروں کا استعمال کیا ہے۔ اساتذہ کی زمینوں میں بھی شعر کہے ہیں۔ بیتاب کا ذوق جنوں دیکھیں۔

ہم کو خاموش نہ جانو صاحب — اندر اک شور بپا رہتا ہے
میری تنہائی کی پگڈنڈی پر — میرے ہمراہ خدا رہتا ہے
زمانہ تھا ہماری دسترس میں — مگر جب ہم نہ تھے خود اپنے بس میں
نہ بھیگے عمر بھر باہر کے موسم — نہ بھیگے ہم کبھی اندر کے رس میں
ان بدلتے موسموں میں مستقل کچھ بھی نہیں — سبزہ زاروں کی جگہ پر زردیاں رہ جائیں گی
ہم طبیعت کے مہاجر اور یہ وادی اک مقام — خواب زاروں میں فقط کچھ تتلیاں رہ جائیں گی

حشمتوں کا زوال سامنے ہے — زلزلوں کا کمال سامنے ہے

ہے سوال بقا تعاقب میں — اور انا کا سوال سامنے ہے

چار جانب ہے ایک جم غفیر — اور قحط الرجال سامنے ہے۔

کل جو بندے تھے آج ہیں وہ خدا — بندگی کا زوال سامنے ہے

موت کے راستے ہزار سہی — زندگی کے بھی سو بہانے ہیں

خواہشوں کے دیار میں ہر سو — قید خانے ہی قید خانے ہیں

یہ جو گنجان شہر ہیں دراصل — اندر اندر سبھی ویرانے ہیں

بیتاب کی ایک حمد کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دھوپ اس کی محبتوں کا جوش — بارشیں گل فشانیاں اس کی

اس کے قدموں کی چاپ باد نسیم — بلبلیں خوش بیانیاں اس کی

پرتپال سنگھ بیتاب کے کلام میں اس کی باطنی دنیا کے انتشار کا مظاہرہ ملے گا۔ نابرابری، ناانصافی، صنعتی تمدن، جنگی بربادی نے آج احساس تنہائی کو عالمگیر مسئلہ بنا دیا ہے۔ سامراجی طاقتوں کی سازشوں نے فرد کی تخلیقی صلاحیت، انفرادیت اور شخصی آزادی کو چھین لیا ہے اور یہ سب بیتاب کی شاعری کا منظرنامہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں ہمیں کبھی جھنجھلاہٹ اور برہمی ملے گی تو کبھی بے باکی اور بے ساختگی۔ اظہار میں جدت بھی اور کلام میں لہو کی روانی بھی۔ اس کے استعارے مانوس اور زندگی سے جڑے ہوئے بھی ملیں گے۔

اپنے ہاتھوں سے جلایا گھر کو — آگ بھڑکی ہے تو روتا کیا ہے

بیچ بازار کھڑا سوچتا ہوں — خود کو بیچا تو خریدا کیا ہے

کئی پردوں میں چھپا ہے اک شخص — اور اس چہرے میں رکھا کیا ہے

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ بیتاب روحانیت اور رومانیت کی تہیں کھول رہا ہے۔ اس طرح وہ شعر کو آفاقی سطح تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔

اک کنواں ہے کہاں کہاں جائے — دھواں اٹھتا ہے آج گھر گھر سے

خوبصورت ہیں یہ کھلونے مگر — سبھی ٹوٹے ہوئے ہیں اندر سے

مٹی ڈالو رشتوں پر — مٹی کے سب رشتے ہیں

وہ سچا ہے مگر اس کے — سبھی حوالے جھوٹے ہیں

سپنے بیچنے والوں کے — اپنے بھی کچھ سپنے ہیں

دنیائے رنگ و بو سے کنارا نہیں کیا — اچھا کیا کہ ہم نے دکھاوا نہیں کیا

بیتاب کا کلام اپنی انفرادیت اور معنویت کے لحاظ سے نہ فقط اردو حلقوں میں بلکہ ہندی پاٹھکوں میں بھی معتبر جانا جاتا ہے۔ بیتاب کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا۔ وہ انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس میں بھی لیا گیا لیکن ہمیشہ زمین کے ساتھ جڑا رہا۔ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی محفلیں سجانا، ادبی پروگرام کروانا اور نئے شاعروں اور ادیبوں کی حوصلہ

افزائی کرنا اس کی خوبیوں میں شامل ہے۔ بیتاب نے پہلی غزل اسکولی ایام میں کہی اور ابتدا میں اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی شعر کہنے لگا لیکن ریاست میں پنجابی شاعری کی کمزور حالت دیکھ کر اور بیشتر بے وزنے، بے بحرے اور تک بندئے شاعروں کے کلام سے مایوس ہو کر اس نے اردو کا ہی دامن تھام لیا۔ اس کی اردو غزلیں اور نظمیں ملک کے مشہور اور معیاری ادبی رسائل میں چھپنے لگیں۔ آج برصغیر ہندو پاک میں شاید ہی کوئی ایسا جزیرہ ہو جس میں پرتپال سنگھ بیتاب نہ چھپا ہو۔ اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے اسے پورے ملک میں پذیرائی ملی۔ انعام و اکرام ملے، خلعت فاخرہ سے نوازا گیا۔ اس کی غزلوں اور نظموں کے حوالے سے بے شمار مضامین لکھے گئے۔ پاکستان اور ہندوستان کے نامور نقادوں نے اس کی شاعری پر تنقیدی پرچے لکھے۔ اس کے کلام کو نصاب کا حصہ بنایا گیا لیکن افسوس کہ ریاست کی کسی یونیورسٹی نے اس طرف دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ درس و تدریس سے وابستہ اکثر لوگ درسی اور نصابی کتب کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھتے۔ نئی تخلیقات اور نئے ادیبوں سے ناواقف ہوتے ہیں ورنہ بیتاب ایسے جدید لب و لہجے کے شاعر کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے جس شخص کو شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا جیسے عالمی شہرت یافتہ نقادوں نے قبول کیا ہو اور جو اپنی شاعرانہ صلاحیت اور تخلیقی قوت کو منوا چکا ہو، جس کی شاعری میں جدت اور انفرادیت ہو۔ جو شخص عصر حاضر کا نباض ہو، اس کے ساتھ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی بے رخی قابل افسوس ہے لیکن ایک فطری شاعر اور ادیب کو ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ پڑنا چاہیے۔ کیونکہ بقول بیتاب ؎

ہم جسم کو بچا نہ سکے گرد سے مگر　　　یہ تو کیا کہ روح کو میلا نہیں کیا

پرتپال سنگھ بیتاب۔ بھیڑ میں چلنے والا تنہا شاعر

احتشام اختر (کوٹہ)

یہ صحیح ہے کہ پرتپال سنگھ بیتاب کی غزلوں سے دانشور قاری لطف اندوز ہوتا ہے لیکن درحقیقت بیتاب کی غزلوں میں عوام کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میر نے کہا تھا کہ۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند　　گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

یہ بات پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری پر بھی صادق آتی ہے۔ ان کی شاعری عوام و خواص دونوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ بیتاب آل انڈیا مشاعروں میں بھی شرکت کرتے ہیں اور الیکٹرونک میڈیا سے بھی وابستہ ہیں۔ ہندی اور انگریزی میں ان کی شاعری کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری دماغ کے ساتھ ساتھ دل کو بھی متاثر کرتی ہے۔ پرتپال سنگھ بیتاب حساس اور جذباتی انسان ہیں۔ جمالیاتی حس بھی ان کی تیز ہے۔ درختوں اور پھولوں سے انھیں محبت ہے۔ صنوبر کو تو انھوں نے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے صنوبر کا انھوں نے اپنی غزلوں میں بار بار ذکر کیا ہے۔ صنوبر کے کچھ رنگ دیکھئے۔

اک صنوبر ہے میری یادوں میں　　کہیں ان جنگلوں سے آگے ہے

نہ رکھنا تھا ہمیں رستے میں رونہ　　صنوبر باہیں پھیلائے کھڑے تھے

جنوں تھا اور لا محدود جنگل　　وہی بس اک صنوبر دیکھنا تھا

صنوبر ہی نہیں بیتاب نے بھی درختوں اور پھولوں کو تشبیہ استعارے اور علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور انھیں زندگی سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ بیتاب کو شہر کا موسم بھی زندگی کے غم اور خوشی کی طرح لگتا ہے۔ زندگی بھی موسم کی طرح بدلتی رہتی ہے۔ بیتاب کو بادام و سیب کے بے لذت ہو جانے کا افسوس بھی ہے اور گھنے جنگل میں اپنے ہاتھ سے ایک پودا لگانے کی خوشی بھی ہے جواب پیڑ بن چکا ہے۔ مسافر کے لیے ایک پیڑ کا سایہ کافی ہے۔ بیتاب کی غزلوں میں درختوں اور پھولوں کے نئے انداز دیکھئے جس میں گہری معنویت پوشیدہ ہے۔

ایک پودا اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا یہاں!　　اس گھنے جنگل میں کوئی اک شجر میرا بھی ہے

کوئی موسم ہو انھیں تو کاٹنا ہوتا ہے وقت　　کچھ درختوں پر کبھی کوئی ثمر ہوتا نہیں

راہ میں بیتاب ہوتے ہیں کبھی جنگل گھنے　　اور قسمت میں کبھی اک بھی شجر ہوتا نہیں

جڑ سے اکھڑ چکا تھا وہ طوفاں زدہ شجر　　لیکن بلا کا ذائقہ اس کے ثمر میں تھا

ایک ایک کر کے اپنی جڑوں سے جدا ہوئے　　کیا کیا بلند تھے جو شجر لے گئی ہوا

دیکھنے میں سبز صحرا بے شجر ہوتا نہیں　　جو ثمر پوچھو تو اک بھی شاخ پر ہوتا نہیں

ہندوستان کی "حسین جنت" یعنی کشمیر میں رہنے والا شاعر جب درختوں پھولوں اور بادام وسیب کا غزل میں ذکر کرتا ہے تو اچھا لگتا ہے لیکن سرسبز وشاداب علاقے کا شاعر جب دشت وصحرا کی بات کرتا ہے تو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ شاعر اتنا حساس ہوتا ہے کہ وہ صحرا کی ویرانی کی کیفیت کو اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے وہ غمزدہ اور مصیبت زدہ شخص کے دکھ درد کو خود محسوس کرتا ہے۔ بیتاب نے صحرا کو زندگی سے استعارہ کیا ہے۔ صحرا کی ویرانی کی زندگی کی اداسی اور افسردگی سے مماثلت پیدا کی ہے۔ بیتاب کی غزلوں میں دشت وصحرا کی تصویر دیکھئے بیتاب نے لفظوں سے پیکر تراشی اور مصوری کی ہے۔

ریت ہے اور بے کرانی ہے — اور صحرا کی کیا کہانی ہے
اپنی تصویر میں صحرا ہی اگر رکھنا ہے — ہو سکے تو کسی گوشے میں شجر بھی رکھئے
اسی صحرا میں لگا لیجیے خیمہ بیتاب — دل میں محفوظ مگر گرد سفر بھی رکھئے
دشت ویران پھر سے ہے بیتاب — قافلے شب کے اٹھ گئے ہیں میاں
سفر اک اور ہے سراب سراب — اور اک ریگ زار ہے گویا
آباد اگر پوچھو تو گنجان بہت ہے — یہ دشت نما شہر جو ویران بہت ہے
آوارگی میں صبح کیا ہے شام کیا — صحراؤں میں آغاز کیا انجام کیا

پرتپال سنگھ بیتاب اکیسویں صدی کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری صارفین کلچر کی دین ہے۔ وہ خود بھی جنگل میں رہ رہے ہیں۔ لیکن یہ جنگل کنکریٹ کا ہے۔ اس جنگل میں صحرا کی ویرانی بھی ہے اور بھیڑ میں تنہا ہونے کا، احساس بھی۔ بیتاب کی غزل کا محاورہ نیا ہے۔ وہ راست لہجے میں بات نہیں کرتے۔ اپنا دکھ درد ہو یا عام آدمی کا، وہ اس دکھ درد کا تزکرہ بھی غزل کی زبان میں کرتے ہیں۔ اشارے اور کنائے میں بات کرتے ہیں۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی کی نئی امنگ نئی امید اور نئی آواز ہے ان کی غزل میں زندگی رقصاں اور فرحاں وشاداں نظر آتی ہے غزل کا تمام تر جلال و جمال بیتاب کی غزل میں موجود ہے جب وہ کیکٹس کی بات کرتے ہیں تو گلاب کا ذکر کرنا نہیں بھولتے۔ ایک شعری مجموعے کا نام ہی "کیکٹس اور گلاب" رکھا ہے۔ نئے موسم کو دیکھ کر اور پیڑوں پر نئے پتوں کو دیکھ کر شاعر خوش ہوتا ہے زندگی کے مسکرانے کا رنگ اس کی شاعری میں بہت خوبصورت اور دلکش ہے۔

پرتپال سنگھ بیتاب کی فکر جدید ہے لیکن اس میں جذبے کی سچائی بھی موجود ہے۔ بیتاب کی شاعری جدید معاشرے کی ترجمان ہے اور زمینی صداقتوں کی عکاس ہے۔ اس لیے ان کی شاعری کثیر الجہات اور Multi-Dimensional ہے۔

سمت کیسی یہاں سفر کیسا — بھیڑ میں ہم بھی چل رہے ہیں میاں
بھیڑ تھی کون کس شمار میں تھا — گمشدہ ہر کوئی غبار میں تھا
شوق سوداگری میں ہم بیتاب — اپنا سرمایہ سب لٹا کے رہے!
وسیلہ تھی ندی بس بہہ گئے ہم — پہنچنا تھا سمندر دیکھنا تھا
ہم نے جن کو بیرونی طاقت سمجھا تھا — ہم سے لڑنے والے اپنے بچے نکلے

بھیڑ میں چلنے والا یہ تنہا شاعر ہی آر کے لکشمن کا Common Man یا عام آدمی ہے۔ بیتابؔ نے ایک عام آدمی کی کیفیات کو اپنے اوپر طاری کیا ہے۔ کبھی کبھی وہ خود بھی عام آدمی کے مسائل کا شکار ہوئے ہیں۔ میں نے شروع میں میر کا شعر نقل کیا تھا اس لیے آپ کہیں کہ بیتابؔ کی شاعری میں عام آدمی کہاں ہے۔ دراصل یہ عام آدمی جدید ہے اور اکیسویں صدی کا نمائندہ ہے۔ یہ عام آدمی ہائی ٹیک سوسائٹی اور صارفین کلچر کی پیداوار ہے۔ جو بھیڑ میں اپنے آپ کو گمشدہ محسوس کرتا ہے جسے اپنی پہچان کھودینے کا افسوس ہے۔ پرانی اقدار کی شکست وریخت تہذیب و کلچر کی تخریب اور پھر اس کی تعمیر نو۔ یہ موبائل کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا دور ہے۔ اس دور میں شعری اظہار بھی راست بیانیہ اظہار نہیں ہوسکتا ہے اور غزل کی گفتگو جس میں قدم قدم پر تشبیہ مجاز مرسل اور استعارے کا سہارا لیا جاتا ہے۔ غالب کے دور میں یہ کہا جاتا تھا کہ۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تو آج کا جدید شعری اظہار نئی لفظیات اور تلازمات کا سہارا لیتا ہے۔ آج کے دور میں تحریری پیغام اور موبائل کے SMS میں بہت فرق ہے۔ بیتابؔ نے غزل کی صنف میں الفاظ کے ذریعہ اپنے جذبات واحساسات کو Visualize کیا ہے۔ وہ لفظوں کے مصور ہیں۔ ان کی غزلوں میں جذبات واحساسات کی صداقت اور خلوص نظر آتا ہے۔ وہ مخلص اور کھرے شاعر ہیں۔ یہ متحرک اور فعال شاعر اپنی ذات کے مسلسل سفر میں ہے۔ نئے جزیرے کی تلاش میں انھیں ابھی بہت دور جانا ہے۔

ابھی نہ کر بیتابؔ جزیروں کی باتیں   آگے اور سفر ہے اس طغیانی میں

پرتپال سنگھ بیتابؔ کی اکیسویں صدی کی نظمیں

جاوید انورؔ (وارانسی)

پرتپال سنگھ بیتابؔ نے اپنے تازہ مجموعۂ نظمیات ''نظم اکیسویں صدی'' میں لکھا ہے:

''بیسویں صدی کے ہمارے زیادہ تر پیش رو جا چکے ہیں، اور کچھ جانے والے ہیں۔ ہم اور ہمارے ہمعصر بھی اکیسویں صدی میں بہت دور تک نہ جا سکیں گے۔ اس لیے میں اپنی یہ نظمیں اکیسویں صدی کی اگلی نو دہائیوں پر محیط قارئین و نقادان اردو ادب کی نذر کرتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ وہ اپنی تمام تر نئی سوچ، وسیع سائنسی نظر اور اپنے عہد کے مکمل غیر جانب دارانہ پیمانوں کی کسوٹی پر انھیں پرکھیں گے اور ایسا کرتے ہوئے بیسویں صدی میں پیدا ہونے والی میری اس سوچ کا بھی احاطہ کریں گے کہ مجھے یہ نظمیں سو سال بعد لکھنی چاہیے تھیں۔''

اس نکتۂ نظر سے ان کی نظم ''نظم اکیسویں صدی'' کا بھی مطالع کیا جائے۔

ہم جو پاش پاش ہیں
کسی مہیب غار کی تلاش میں ہیں گامزن
ہم جو پل صراط سے گزر گئے
تو یہ صدی تمام پیچ و تاب سمیٹ کر
یہ سفید میں نمود پائے گی
اور ہم جو آتشیں سراب میں بھٹک گئے
تو دیکھنا یہ دھوپ
سات سلسلوں میں ٹوٹ پھوٹ جائے گی (نظم اکیسویں صدی)

جب ہم ان کے پورے مجموعۂ کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظم مجموعہ میں کل کی حیثیت رکھتی ہے اور باقی نظمیں اس کی جز ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نظم کا ہر مصرعہ اپنے آپ میں نئی صدی اور اس کے متعلقات کے اعتبار سے سوالوں کا ایک مہیب سلسلہ رکھتا ہے جن کے جوابات تلاش کرنا ہمارے اور آگے کے عہدوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ یقیناً شاعر کا یہ کام نہیں ہے۔ اس کا مصنف بھی نہیں ہے کہ وہ نئی صدی کے ان سوالات و جوابات کی جستجو اپنے اوپر لازم کر لے۔ لیکن اس جانب نشاندہی کو میرے خیال میں اگر اس کے آزادانہ تخلیقی رویوں پر مسلط نہیں تو سماج کے تعلق سے ادبی سروکاروں اور تقاضوں میں ضرور شامل کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے اس نکتۂ نظر کو بھی ذہن میں رکھتے ہوئے پرتپال سنگھ بیتابؔ نے اپنی نظم اور مجموعۂ کلام کا عنوان تجویز کیا ہو۔ صدیوں، سالوں، مہینوں، دنوں، گھنٹوں اور لمحوں میں سفر کرتی ہوئی زندگی اور اس کے مشاہدوں کے آئینے میں آگے کے زمانوں کا

موضوعاتی انتخاب کے ساتھ بیان پرتپال سنگھ بیتاب کو ہمعصر شعرا میں مختلف مقام کا حامل بناتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی بعض نظموں کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''ہواؤں کا پیغام'' ملاحظہ ہو۔

ہواؤں کا پیغام
اڑنے سے پہلے
نہیں پاؤ گے
پانیوں پر منقش جو تحریر ہے
ساحلوں سے دکھائی نہیں دے سکے گی
زمینوں سے اپنا تعلق
اگر توڑلو
تو خلا در خلا.....
بیکراں پانیوں کے پیامات کو
جاننے کا ہنر سیکھ لوگے (ہواؤں کا پیغام)

اس نظم کا بنیادی لہجہ خطابیہ ہے اور خطاب کے جو بھی لوازمات ہیں مثلاً ماضی کی روایت کا درس، حال کی نشاندہی اور مستقبل میں کامیابی کے لیے منصوبوں اور جوش وخروش کا اظہار۔ یہ تمام صفات اس نظم میں موجود ہیں۔ اس طرح ماضی، حال اور مستقبل میں جو تسلسل ہے وہ حزنیہ اور طنزیہ عناصر جو خطابیہ نظموں کا عام طور پر خاصہ ہوتے ہیں، اس میں نہیں ہیں ہاں دعائیہ عناصر تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے ایک قدم آگے دیکھیں تو طنزیہ اور حزنیہ عناصر سے ماورا استفہامیہ عناصر ضرور محسوس ہوتے ہیں یا محسوس کیے جاسکتے ہیں جو دریافت کے عمل کو مزید تقویت دیتے ہیں۔ دراصل پرتپال سنگھ بیتاب کی یہ نظم آنے والے زمانوں میں ان جرأت مندانہ افراد سے مخاطب ہے جو مسائل کے زہر ہلاہل کو پی کر بھی یا پی کر ہی اور ''ہل من مزید'' کا نعرہ بلند کرنے کے ساتھ آنے والے زمانوں میں کامیابی کے مراحل طے کر سکتے ہیں۔ خواہ وہ سائنسی نکتۂ نظر سے ہو یا فلسفیانہ نکتۂ نظر سے۔ یا زندگی اور مابعد الطبیعات کے کسی بھی گوشے کے تعلق سے۔ ان کی نظموں کے کینوس پر مزید غور کرنے کے لیے ان کی ایک نظم ''ہمارے بعد'' کو دیکھا جائے۔

ہمارے بعد
جو بھی آئے گا
ہمارا حشر اس کے واسطے
حیات کی کتاب کا ورق ہے وہ
سبق ہے وہ
کہ جس کو ایک منچلا امیدوار
امتحاں کے ہال میں تو لے گیا
مگر سوال ہی نہ تھا وہ امتحاں میں

جس کا وہ جواب تھا (ہمارے بعد)

اس نظم کے تحت الفاظ میں جو حزنیہ اور طنزیہ کیفیت ہے اور روایتی قدروں اور آج کی مثبت اور کافی حد تک روایت کے اعتبار سے منفی کا بھی جو منظر نامہ آنے والے وقتوں کے پس منظر میں بیان کیا گیا ہے وہ ایک طرح کی خود ترحمی (Self Pity) کے جذبات کو بھی ابھارتا ہے۔ دراصل ان کا یہ نظریہ حسی ادراک کے معروضی ارتباط کے زیر اثر دنیا کے دیگر ادبی اور سماجی سلسلوں کی زندہ روایتوں کے شعور اور مختلف تخلیقی ادوار کے درمیان مشاہداتی طور پر محسوس کیے جا رہے زمانی بعد کا مرہون منت ہے۔ اس سلسلے میں قدیم یونانی شاعر ہومر کے تعلق سے ایک روایت کا ذکر خالی از دلچسپ نہ ہوگا۔ اس روایت کی رو سے بوڑھا ہومر ارکیڈیا کے ساحل پر واقع ماہی گیروں کی ایک بستی تک پہنچا اور سوال کیا کہ:

''اے ارکیڈیا کے ماہی گیرو! کیا تمہارے پاس کچھ ہے؟''

اس سوال کے جواب میں انھوں نے ایک پہیلی کہی۔

''جو کچھ ہم نے پکڑا تھا، وہ پیچھے چھوٹ گیا، البتہ جو ہم نے نہیں پکڑا، وہی ہمارے پاس ہے۔''

(بحوالہ الیٹ کا اردو دنیا میں خیر مقدم، از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، شب خون شمارہ ۲۰۵، بابت اپریل ۱۹۹۷ء ص ۵۱)

ممکن ہے پرتپال سنگھ بیتاب کی نظر سے یہ روایت نہ گزری ہو یا اگر گزری بھی ہو تو شعوری یا لاشعوری طور پر اس نظم کی تخلیق کے وقت اس کا وقتی تاثر ان کے تخلیقی شعور پر باقی یا مسلط رہا ہو، یہ کہنا دشوار ہے۔ درحقیقت آفاقی سچائیاں اس طرح زمان و مکان کی حدود کو عبور کرتے ہوئے اپنے اظہار کے وسائل تلاش کر لیتی ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاب کی ایک نظم ''یہ لڑائی دائمی ہے'' کو دیکھا جائے۔

آفتاب مغرب میں کہ مشرق میں ہو
یہ لڑائی دائمی ہے
ایک جنگ لڑ کے لوٹتا ہوں میں
تو ایک اور جنگ راہ روکتی ہے
ہار کب ہوئی تھی اور جیت کب
کس جگہ شکست میں نہاں تھی فتح
کب تھی فتح میں شکست یاد کس کو؟
تیغ اور تبر اٹھائے دائروں میں دوڑنا
جانے کب تلک مرا نصیب ہے
سوچتا ہوں اپنی ساری سرحدوں کو توڑ دوں
اپنے سارے اشتہار پھاڑ دوں
اپنے سارے سلسلوں کو بھول جاؤں
ساری جنگی قوت اپنی
منتظر سمندروں میں پھینک دوں (یہ لڑائی دائمی ہے)

اس نظم میں لفظ ''جنگ'' خود ایک Totalizing قوت کا اشاریہ معلوم ہوتا ہے۔ کائنات کے ہر موجود میں جاری وساری زندگی اور اس کے عمل کے ہر تغیر کو اس حوالے کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پوری نظم اشاراتی صفات سے متصف ہے۔ جگہ، نام اور واقعہ کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ یہاں میراجی کا نظریہ یاد آتا ہے۔

> ''سچی شاعری وہی ہوتی ہے جو اشاراتی ہو..... بات کو دھندلکے میں رکھنے سے ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ علامت خیال کی سب سے بڑھ کر آپ روپی صورت ہے۔ اشاراتی شاعری اظہار کا ایک ایسا فطری طریقہ ہے جو ہماری ہستی کی گہرائیوں سے امڈ کر نمودار ہوتا ہے۔''

لہجہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس نظم میں والہانہ پن کی کیفیت تو ہے لیکن سرخوشی کا شائبہ تک نہیں۔ علاوہ بریں اتنا سنجیدہ آفاقی مسئلہ بیان کرنے کے درمیان زیادہ تر بلند بانگی کے جو عناصر نمایاں ہو جاتے ہیں، نظم اس سے بھی پاک ہے۔ یعنی سنجیدہ مسئلے کا اشاراتی اظہار بہت سلیقہ مند سنجیدگی سے کر دیا گیا۔ ایک نظم ''غاروں سے غاروں تک'' ملاحظہ ہو۔

میں جب غاروں سے نکلا تو میں نے سوچا
برف جمی ہے جو اشجار پہ پگھلا دوں گا
گرد جمی ہے جو چہروں پر صاف کر دوں گا
زہر ہوا میں جو پھیلا ہے پی جاؤں گا
لیکن
سڑکوں بازاروں میں
اندھا دھند گزرتی بھیڑ
اور بارش میں چلتی لاری کو چھینٹے اڑاتے جب دیکھا
سڑکوں اور خونخوار ہجوموں سے گھبرا کر
اپنی ساری سوچ سمیٹ کر
میں غاروں میں لوٹ گیا (غاروں سے غاروں تک)

یہ نظم لفظی اعتبار سے قدرے آسان ہے۔ ظاہری مفہوم بھی بہت پیچیدہ نہیں بلکہ واضح ہی ہے۔ لیکن عنوان میں ہی جو مرکزی خیال نمایاں کر دیا گیا ہے چار لفظوں میں، اگر ہم پوری نظم کے آئینے میں اس کی تفہیم کرنے بیٹھیں تو ورق کے ورق سیاہ کرنا پڑیں گے۔ پرتپال سنگھ بیتاب کی نظموں میں غور کرنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ ان کی تمام تر نہیں تو بیش تر اور میرے ناقص مطالعے کی بنیاد پر اکا دکا نظموں کو علیحدہ کر دیں تو تخلیق کار کی شخصیت کا اظہار نہیں ملتا۔ سیدھے موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اسی طرح الیٹ کے اس نظریہ جس کا میں کلی طور پر قائل نہیں لیکن پرتپال سنگھ بیتاب کی نظمیں اس نظریہ سے نزدیک تر معلوم ہوتی ہیں لہٰذا اس کا ذکر کر دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ الیٹ کہتا ہے:

"شاعر کے ہاں شخصیت کی طرز کی کوئی شئے نہیں ہوتی، جس کا وہ اظہار کرے۔ اس کے پاس تو محض اظہار کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اس وسیلۂ اظہار میں تاثرات اور تجربات عجیب وغریب اور غیر متوقع صورتوں میں یکجا ہو جاتے ہیں۔"

میرے نزدیک شاعری شخصیت کا اظہار بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی بھی ہے۔ اور میں اسے تب تک کوئی عیب نہیں سمجھتا جب تک کہ اس قسم کے خیالات نظم کی شعریات پر پورے اتریں۔ بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے، اس سے درگزر کرتے ہوئے پرتپال سنگھ بیتاب کی نظم "احساس جرم" کو دیکھا جائے۔

سرسوتی کو جب میں نے
اپنے گھر میں استھاپت کیا
تو سوچا تھا کہ اس کی آرادھنا کروں گا
سادھنا کروں گا
ور مانگوں گا اور پاؤں گا
لیکن مورتی کو شوکیس میں سجا کر میں
روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا
اور قریب قریب بھول ہی گیا
کہ میرے گھر میں
سرسوتی کا پرویش بھی ہے
کبھی کبھار گھر میں آیا ہوا کوئی مہمان
جب ڈرائنگ روم کی ہر چیز پر
اچٹتی سی نگاہ ڈالتا ہے
اور اس کی نظر
اک جگہ پر آ کر ٹھہر جاتی ہے
تو وہ چونک کر کہتا ہے
"واہ کتنی پیاری مورتی ہے
پیتل کی ہے یا تانبے کی؟" (احساس جرم)

اس نظم میں تین باتیں غور کرنے کی ہیں۔ (۱) کیا یہ علامتی نظم ہے؟ (۲) کیا یہ غیر علامتی نظم ہے؟ (۳) اگر علامتی نظم ہے تو اس کی کیا اہمیت اور قدر ہے اور اگر غیر علامتی ہے تو اس کی اہمیت اور قدر کیا ہے؟

پہلے سوال کا جواب تو یہی ہے کہ یہ نظم غیر علامتی طور پر بھی بہت زبردست تاثر رکھتی ہے۔ مذہبی قدروں کی پامالی کا استعارہ بھی اس کے مرکزی خیال کو کہہ سکتے ہیں

دوسرے سوال پر غور کریں تو ہمیں اس نظم کے جو چھوٹے چھوٹے ضمنی واقعات ہیں اس سے بڑی مدد ملتی

ہے اور یہ نظم اس آئینے میں بہت معنی خیز ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ہندو مذہب کی روایت کے تعلق سے مورتی کو شوکیس میں استھاپت کرنے کا (لفظ استھاپت پر غور کریں) حوالہ نہیں ملتا۔ دوسرے مورتی کو شوکیس میں سجانے اور اس کی سادھنا کرنے میں دور دور تک کوئی واسطہ نہیں۔ یہی معاملہ ڈرائنگ روم کا ہے۔ یعنی سرسوتی کی مورتی کو گھر میں استھاپت کرنے اور اس کی آرادھنا، سادھنا کے لیے شوکیس اور ڈرائنگ روم کا انتخاب جہاں کہ اکثر ظاہری سجاوٹ کی چیزیں رکھی جاتی ہیں کہ کوئی مہمان آئے تو اس پر ہماری شخصیت اور اخلاق کا اچھا اثر ہو، قطعاً نامناسب ہے۔ اس لیے کہ استھاپنا اور آرادھنا سادھنا کا تعلق عقیدت سے ہے سجاوٹ سے نہیں۔

تیسری بات یہ کہ امیر سے امیر اور مفلس سے مفلس ہندو گھروں میں اگر پوجا گھر کے عنوان سے ایک علیحدہ کمرہ نہیں تو پوجا استھل کے طور پر ایک طاق ضرور ہوتا ہے جو علیحدہ ہوتا ہے اور جس کے اوپر دوسری چیزیں نہیں رکھی جاتیں۔ سوائے پوجا سامگری کے۔ جدید دور میں (قدیم دور میں تو ڈرائنگ روم کا تصور نہ تھا، بیٹھک کا کمرہ یقیناً ہوتا تھا اور اس میں طاق پر مورتی کا رواج بھی ہوتا تھا لیکن پوجا گھر اس میں نہیں تھا) اگر ڈرائنگ روم میں مورتی استھاپت کرنے کا اہتمام کیا بھی جاتا ہے تو وہ اس طرح کہ پورا ڈرائنگ روم ایک چھوٹے سے مندر کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ دلائل کے لیے مختلف ٹیلی وژن سیریلز موجود ہیں اور جن سے متاثر ہو کر ہی شاید ڈرائنگ روم میں یہ رواج اب بڑھتا جا رہا ہے۔

تو پھر شاعر کا مذہبی قدروں کی پامالی کی ضمن میں علامتی اظہار کے لیے ان الفاظ کا استعمال چہ معنی دارد؟

یہیں سے علامتی تفہیم کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ اگر سرسوتی کو علم کی علامت تصور کر لیا جائے اس لیے بھی کہ سرسوتی کو علم کی دیوی ہی کہا جاتا ہے تو راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو جانا، مورتی کو شوکیس میں سجانا، ڈرائنگ روم میں استھاپت کرنا اور اس کی آرادھنا اور سادھنا نہ کر پانے کا احساس جرم اور اگر مورتی کو ڈرائنگ روم میں استھاپت کرنے کی غلطی کو بھی احساس جرم میں شامل کر لیا جائے تو معنوی نسبت میں ایک السیاتی عنصر کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے ڈرائنگ روم میں مورتی کو سجاوٹ کے طور پر رکھنا ہی اس روحانی محرومیت کا باعث ہو۔ تو اب تمام ظاہری مفاہیم تبدیل ہو جاتے ہیں اور مذہبی اقدار کی پامالی کی اور اس کے پس منظر میں خالص علم کی پامالی بھی کئی دیگر وجوہات کے ساتھ بہت شدت لے کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اثر کی یہ شدت نظم کے آخری مصرعہ میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے کہ "پیتل اور تانبے" کا ذکر ہمارے مردہ سماجی ذہنوں جو کہ Economical Status سے آگے غور و فکر نہیں کر سکتے کی پول کھول دیتا ہے۔ اور اس زد میں ہم تھوڑی بہت حیثیت رکھنے والے بھی پوری طرح آ جاتے ہیں۔ یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مندرجہ بالا تمام نظموں میں یہ بات آگے کے زمانوں کی بھی ہو رہی ہے۔ ایک اور نظم "میں ایسا نہیں کروں گا" ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

میں اپنی حیات کا نوسٹراڈوس ہوں
میری خوابیدہ نظموں میں درج باتیں اکثر
کچھ عرصہ گزرنے کے بعد حقائق کا لبادہ پہن کر
میرے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں

پہلے کہی ہوئی نظمیں
اپنے بھرپور تشخص کے ساتھ
وقتاً فوقتاً پیش آتی رہی ہیں
جو کچھ میں اب نظموں کی صورت میں
لکھ رہا ہوں
وہ سب بعد میں کسی نہ کسی روپ میں
ضرور سامنے آئے گا
کبھی کبھی میں سوچتا ہوں
کہ یہ نظم نگاری چھوڑ دوں
کہیں ایسا نہ ہو
کہ میں کوئی ایسی نظم لکھ دوں
جو میرے لیے بہت بری ہو
اور کبھی نہ کبھی اپنی بری تجسیم لیے
میرے سامنے آ کھڑی ہو
لیکن پھر میں سوچتا ہوں
اگر میں یہ سب چھوڑ بھی دوں
تو بھی جو پیشانی پہ لکھا ہے
وہ تو پیش آئے گا ہی
اس لیے میں اپنے اندر کے
نوسٹرا ڈومس کو قتل نہیں کروں گا (میں ایسا نہیں کروں گا)

وضاحت کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن پھر بھی عرض کر دیتا ہوں کہ نوسٹرا ڈومس کو بہت بڑا عالم نجوم کہا جاتا ہے۔ اس نظم کا لفظی و معنوی کینوس کس قدر وسیع ہے بتانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح کی متعدد مثالیں پرتپال سنگھ بیتاب کی نظموں میں موجود ہیں۔ ان کی روشنی میں ان کا بیان کہ 'اکیسویں صدی میں پیدا ہونے والی ان کی سوچ کے احاطے میں یہ تصور کہ پرتپال سنگھ بیتاب کو یہ نظمیں سو سال بعد کہنی چاہیے تھیں' صادق آتا ہے۔

ریداد/ریوداس

روی داس اور ریداس ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ ہندی میں ایک نصابی کتاب 'ہمارے پوروج' (हमारे पुर्वज) نام سے ہے جو اتر پردیش اور اطراف میں درجہ ۶، ۷ اور ۸ میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس میں یہ سنت کوی بھکتی کال سے بے حد اہم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ریداس اور ریوداس دونوں ناموں سے ان کے پد مل جاتے ہیں۔ جیسے

ریداس: کہہ ریداس خلاص چمارا

ریوداس: نام دیو، کبیر، تکوچن، سدھنا سین ترین

کہہ ریوداس سنہورے سنتہو! ہری جیو تے سبھی سریں

ریداس نام کے متعلق ہندی کے بے حد معتبر ادبا اس بات پر متفق ہیں کہ بھگت کال کے اس کوی کا اصل نام ریداس ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ برادری کے اعتبار سے چمار تھے۔ روی داس نام کے حامی ان کے مداح ریداس نام کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے بعض دلائل میں سے ان کی دلیل یہ ہے کہ ہر نام کا کوئی نہ کوئی مطلب، کوئی معنی ہوتا ہے۔ رویداس کے معنی ہیں 'سورج کا غلام' لیکن ریداس کے کیا معنی ہیں؟ اس کا جواب ریداس نام کے حامیوں کے پاس یہ ہے کہ ہندو مذہب میں انسان چار شاخوں میں بٹا ہوا ہے۔ سب سے اوپری شاخ برہمن (ब्राह्मण)، اس کے بعد شکتریہ (क्षत्रिय)، اس کے بعد وشیہ (वैश्य)، آخر میں شودر (शूद्र)۔ ان میں ہر ایک شاخ سے وابستہ اور جنم لینے والے فرد کا نام اس اعتبار سے رکھا جاتا ہے جسے جاتی سوچک (जाति सूचक) کہتے ہیں۔ مثلاً اگر برہمن ہوگا تو اس کا نام پرجاپتی تیواری، رام اوتار پانڈے (प्रजापति तिवारी, राम अवतार पाण्डेय) وغیرہ ہوگا۔ شکتریہ چونکہ بہادری کی علامت ہے اس لیے ان کا نام ویر بھان سنگھ، ادے پرتاپ سنگھ (वीर भान सिंह, उदय प्रताप सिंह) وغیرہ ہوگا۔ وشیہ کا طبقہ چونکہ تجارتی طبقہ ہے اس لیے اس میں جنم لینے والے فرد کا نام متھراداس، کروڑی مل، راجیش سیٹھ (मथुरा दास, करोड़ीमल, राजेश सेठ) وغیرہ ہوگا۔ ان سب ناموں کے معنی و مطلب ہیں۔ شودر شاخ چونکہ ان تینوں اوپری شاخوں کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے اور یہ سب سے پست مقام کی حامل ہے اس لیے ان کا جاتی سوچک نام اس طرح ہوتا ہے۔ جیسے بچانو، بھیالال، چرکٹ، لالتا پرشاد وغیرہ (बचानू, भैयालाल, चिरकुट, लालता प्रसाद) اور ان کے نام کا کوئی معنی بھی ہو یہ ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح ریداس کا بھی کوئی معنی نہیں ہے لیکن وہ ہی اصل نام ہے اس لیے کہ وہ چمار تھے جس کا تعلق شودر شاخ سے ہے۔

ریداس نے رامانند کا شاگرد ہونے کے بعد اپنے کو ریداس اور رویداس دونوں کہا ہے۔ یعنی بعد میں انہوں نے اپنے کو رویداس بھی لکھا جس سے ان کے نام کا ایک معنی نکلتا ہے اور یہ ایک طرح سے اپنے اندر احترامی

نشان(आदर सूचक) خصوصیت بھی رکھتا ہے۔

اچاریہ رام چند شکل (आचार्य रामचन्द्र शुक्ल) نے اپنی بے حد معتبر کتاب ہندی ساہتیہ کا اتیہاس (हिन्दी साहित्य का इतिहास) میں لکھا ہے کہ:

> ''رامانند (جو کبیر داس کے بھی استاد تھے) کے بارہ شاگردوں میں ریداس بھی مانے جاتے ہیں۔'' (ص ۵۷)
>
> ''کبیر داس کی طرح ریداس بھی کاشی (بنارس) کے رہنے والے کہے جاتے ہیں۔'' (۵۷)
>
> ''ریداس کا نام دھنا (धन्ना) اور میرابائی (मीराबाई) نے بڑے احترام (आदर) کے ساتھ لیا ہے۔'' (۵۷)

پرتپال سنگھ بیتاب نے اپنے دونوں مضامین میں جس بھگتی کال کے رویداس کا ذکر کیا وہ ریداس ہی ہیں۔ جنہیں آج ایک بڑا طبقہ رویداس کہتا ہے۔ چونکہ گرو گرنتھ صاحب میں اس بھگتی کال کے کوی کے جو پد گرو نانک دیو جی نے گائے ہیں ان میں رویداس ہی نام ہے۔ اس لیے پرتپال سنگھ بیتاب نے جہاں جہاں بھی بھگتی کال کے اس کوی کا ذکر کیا ہے وہ رویداس کے نام سے ہی کیا ہے۔

(جاوید انور)

میں اور میری نظم

پرتپال سنگھ بیتاب

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے دوران ریاست جموں وکشمیر بھی دو حصوں میں بٹ گئی۔ ریاست کا ضلع پونچھ بھی اس مارا ماری اور نفسا نفسی کا شکار تھا۔ پونچھ شہر سے کچھ مہاجر (زیادہ تر ہندو و سکھ) ہندوستانی فوج کے چھوٹے طیاروں کے ذریعے ہندوستان میں الگ الگ جگہوں پر لے جارہے تھے۔ شہر پونچھ سے پانچ کلومیٹر دور کھڑی دھرمسال نام کے ایک گاؤں سے آیا ہوا ایک خاندان بھی جزوی طور پر فوجی طیارے پہ سوار ہو کر کہیں بھٹکنے کے لیے نکل پڑا۔ حالانکہ یہ گاؤں بٹوارے کی گرد چھٹنے کے بعد ہندوستانی کشمیر کے حصے میں آگیا۔ بلکہ ہوا یہ کہ ہمارا یہ گاؤں جموں وکشمیر میں ہندوستان، پاکستان کے درمیان قبضے کی حقیقی لکیر یعنی سرحد بن کے رہ گیا۔ مہاجر خاندان یعنی میرے والدین ہندوستان میں یہاں وہاں بھٹک رہے تھے۔ حالت یہ تھی کہ:

خیمہ بستی کوئی نہ راس آئی　　　ہم وہ اجڑے کہ پھر بسے بھی نہیں

ہجرت کے انہی ایام میں یہ خاندان انبالہ (اس وقت کا پنجاب آج کا ہریانہ) میں تھا جب ۲۶/جولائی ۱۹۴۹ء کے ان کے ہاں میری پیدائش واقع ہوئی۔ میرے والدین ہجرت کے اسی عالم میں بھٹکتے رہے، بھٹکتے رہے۔ جب ۶۵۔ ۱۹۶۴ء کے دوران انہوں نے واپس جموں شہر میں آکر بس جانے کا فیصلہ کیا۔ میں اس وقت نویں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اسی زمانے میں شعر کہنے کا میرا شوق زمین کا سینہ چیر کر پھوٹ نکلنے والے پانی کے کسی چشمے کی طرح دفعتہً معرض وجود میں آیا۔

اپنے ادبی سفر کا آغاز میں نے غزل اور نظم ہر دو اصناف کے ساتھ کیا۔ غزل اردو شاعری کی وہ صنف ہے جس نے اس زبان میں صدیوں تک نظم کی کسی دوسری صنف کو زیادہ پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ غزل کا جادو ہی کچھ ایسا ہے کہ اردو والوں کی اکثریت صدیوں اس کے اثر سے باہر نکل کر کسی دوسری صنف شاعری کی طرف دھیان ہی نہ دے سکی۔ حالانکہ مرثیے میں انیسؔ اور دبیرؔ جیسے شعرا بھی اردو میں ہو گذرے ہیں۔ نظیرؔ اکبرآبادی جیسے مقبول عام نظمیہ شاعر بھی اردو میں اپنا زور آزما کر چلے گئے۔ خود غالبؔ نے بھی اچھے خاصے قصائد رقم کیے ہیں لیکن بات رہ رہ کر وہیں آجاتی ہے کہ آتشؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، داغؔ اور بعد میں جگرؔ مرادآبادی اور حسرتؔ موہانی تک جیسوں کی غزل نے اردو نظم کو کبھی پر نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ترقی پسند ادب میں پہلی بار نظم نے پر مارنے شروع کیے۔ سجاد ظہیر حالانکہ باقاعدہ شاعر نہیں تھے لیکن اردو کی نثری نظم میں ان کا نام سب سے پہلے سامنے آتا ہے۔ سردار جعفری فیض احمد فیضؔ اور کیفی اعظمی نے بھی خوب نظمیں کہی ہیں۔ اسی عصر کے ضمن میں ن۔م۔ راشد اور میراجی نے بھی نظم کہی ہے۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے آس پاس معرض وجود میں آنے والی جدیدیت کی تحریک میں تو کسی حد تک نظم کو غزل کے مقابلے میں فوقیت بھی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد تو نظم نے اردو ادب میں اچھے خاصے پاؤں جما لیے۔

بیسویں صدی میں انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے ادب خاص طور سے شاعری نے نئے اردو شاعروں کو خاصا متاثر کیا ہے۔ اس کے علاوہ مارکسی نقطہ نظر، فلسفہ وجودیت، ساختیات اور فرائیڈ کے نفسیاتی نظریے وغیرہ نے بھی اردو شاعر، ادیب کے ذہن کو متاثر کیا ہے۔ لہٰذا نئے فلسفے، نئے خیالات، نئے مضامین، نئی علامتیں، نئے استعارے اور نئے پیکر اپنے اظہار کے لیے آزاد معرا اور نثری نظم کا تقاضہ کرتے ہوئے نظر آئے۔ بے شک اردو ادب کے اس عہد میں نظم نے کھل کر اپنا دامن پھیلایا لیکن غزل بھی کم و بیش تمام تر نئے رجحانات کے ساتھ شانہ بہ شانہ چلتی رہی۔ فیضؔ، فراقؔ، مجروحؔ اور پھر ندا فاضلی شہریارؔ، بشیر بدر، ناصرؔ کاظمی، باقیؔ، کرشن کمار طورؔ اور پریم کمار نظرؔ وغیرہ نئے رجحانات کے ساتھ میدان غزل میں خوب سرگرم عمل رہے ہیں۔

انگریزی ادب کی جو تھوڑی بہت تعلیم ہندوستان میں بی اے تک لازمی طور پر دی جاتی ہے اس کی حد تک ولیم ورڈز ورتھ سے جان کیٹس اور کالرج تک کو میں نے بھی پڑھا ہے۔

میرے ذہن پر پورانک کرداروں کا اثر بھی ہمیشہ سے رہا ہے۔ سکھ مذہب کی بھگتی کویتا کے علاوہ میں نے تلسیؔ، سورداسؔ اور خاص طور پر میرا بائی کا اثر بھی کافی حد تک قبول کیا ہے۔ یاد رہے کہ کبیرؔ، روی داسؔ، نامدیوؔ وغیرہ، سنت کویوں کی کویتا تو گورو گرنتھ صاحب میں پہلے سے شامل ہے جس کا مطالعہ میری مذہبی تعلیمات میں شامل رہا ہے۔

اس طرح میرے شعری سفر کے آغاز سے جہاں مجھ پر ایک طرف غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور داغؔ وغیرہ کا اثر رہا ہے۔ وہیں دوسری طرف مذکورہ تمام نئے پرانے رجحانات کے اثر کے تحت میں نے نظم کا دامن بھی ہمیشہ تھامے رکھا۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی سے جہاں میری غزل ہندوستان بھر کے نامور رسائل و جرائد میں شائع ہونا شروع ہو گئی تھی وہیں میری نظم بھی ''شب خون'' (الہ آباد)، ''شاعر'' (ممبئی)، ''سطور'' (دہلی)، ''الفاظ'' (علی گڑھ) وغیرہ جیسے نامی گرامی رسائل میں خوب چھپ رہی تھی۔

پیش خیمہ (۱۹۸۰ء) سراب در سراب (۱۹۸۴ء) اور خود رنگ (۱۹۹۵ء) نام کے میرے شعری مجموعوں میں غزل کے ساتھ ساتھ میری نظم بھی شامل تھی۔ اس دوران ہندوستان کے قریب قریب ہر حصے میں اپنے کچھ پیش روؤں اور ہمعصروں کے شانہ بہ شانہ میں نے بھی نظم کو مشاعرے میں عام کرنے میں کافی کردار ادا کیا۔ مشاعرے میں داد بے داد سے قطع نظر ہم لوگوں نے سامعین میں رفتہ رفتہ نظم کا مزاج پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے اور اس کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔

نظم معرا آزاد یا نثری نظم میں شعری آہنگ کو برقرار رکھنا قدرے مشکل ہوتا ہے خاص طور سے نثری نظم کو نثر بننے سے روک پانا تو جوئے شیر کے لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ غزل گو شعرا کی موزونیت طبیعت ان کی نثری نظم میں آہنگ برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

میرے نزدیک نظم اور غزل میں فرق محض اتنا ہے کہ یہ دونوں نظم کی الگ الگ اصناف ہیں۔ دراصل غزل

کا ایک شعر بجائے خود ایک مکمل نظم ہوتا ہے۔ باٹنی (Botany) کی زبان میں بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ نظم ایک پھول ہے۔ جبکہ غزل Inflorescence ہے۔ اسی طرح غزل کے شعر اور نظم کی دوسری اصناف میں بھی محض ہیئت کا فرق ہے۔ حالانکہ قصیدہ، مرثیہ، نعت، حمد وغیرہ اصناف میں خیال کی انفرادیت بھی رہتی ہے لیکن رباعی، نظم معرا، آزاد نظم نثری نظم وغیرہ خالص ادبی اصناف میں اکثر و بیشتر محض ہیئت کا ہی تفرقہ ہے۔

میری شاعری کی حد تک تو میرے بس میں ہی نہیں کہ کب کوئی خیال یا کوئی مضمون مجھ پر غزل کے شعر کی صورت میں نازل ہو جائے اور کب نظم کی شکل میں۔ میری غزل اور نظم کے قارئین جانتے ہیں کہ میرے ہاں ہر دو اصناف میں ملتے جلتے مضامین بکثرت دیکھے جا سکتے ہیں۔

میری سوچ پر الگ الگ قسم کے بلکہ کئی بار بہ یک وقت مختلف النوع فلسفے اثر انداز رہے ہیں جہاں ایک طرف میری بنیاد میں سکھ مذہب اور اس تعلق سے بھگتی رس اور تصوف کا اچھا خاصا اثر رہا ہے۔ وہیں دوسری طرف عہد شباب میں اور کسی حد تک بعد میں بھی مارکسی نظریۂ معاشیات کا اثر بھی رہا ہے۔ سارتر کے فلسفۂ وجودیت نے بھی مجھے کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ فرائیڈ کے خوابوں کے علامتی ترجموں اور انسانی نفسیات سے متعلق تجربوں کا میں نے کافی حد تک مطالعہ کیا ہے۔ مذکورہ تمام فلسفوں کا اثر کہیں نہ کہیں میری نظموں میں (اور غزلوں میں بھی) نظر آتا ہے۔

میں ادب میں کسی فلسفے کی بنیادی شمولیت کے حق میں کبھی نہیں رہا۔ بلکہ ادب میں ادب کی بنیادی حیثیت کا ہمیشہ سے قائل رہا ہوں۔ تبلیغی اور اصلاحی ادب میرے نزدیک کبھی اچھے ادب کے ضمرے میں شامل نہیں رہا۔ ہاں ادب اپنی بنیاد میں خالص ادب ہوتے ہوئے اگر کسی فلسفے کے اثرات ضمنی طور پر اپنے اندر رکھتا ہو تو اس میں کچھ برا بھی نہیں۔ یعنی فلسفہ بلاواسطہ اگر خالص ادب میں در آتا ہے تو ٹھیک ہے شرط یہ ہے کہ اس سے ادب کی بنیادی ادبیت مجروح نہیں ہونی چاہیے۔ اپنی نظموں میں میں نے اپنے اس خیال کا علم بلند رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔

میں نے اپنی نظم کو (اور غزل کو بھی) کبھی ادب کے بنیادی ڈھانچے سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ اور نہ میں نے کبھی کسی فلسفے کو اپنی نظم پر غلبہ پانے کی اجازت دی ہے۔ پھر بھی بھگتی رس کا، تصوف کا، فلسفۂ وجودیت کا، فرائیڈ کا اور کہیں کہیں مارکس واد وغیرہ وغیرہ کا اثر میری نظموں میں بلاواسطہ داخل ہو ہی جاتا ہے۔

سکھ مذہب کی بنیادی تعلیم اور سکھ گوروؤں کی گورو گرنتھ صاحب میں شامل شعری تخلیقات کا میری طبیعت کی طرح میری نظموں پر بھی اثر رہا ہے۔ اس بات کا اندازہ اکثر مجھے اس وقت ہوتا ہے جب میں اپنی ایسی کسی نظم کو کسی خاص کیفیت میں کسی خاص ماحول میں پڑھتا ہوں۔

سنت روی داس، کبیر، نامدیو کے بھگتی کاویہ کے علاوہ گورو گوبند سنگھ کے برج (بھاشا) اور فارسی کلام اور گورو گوبند سنگھ کے ایک مرید نند لعل گویا کے فارسی کلام، میرا بائی، سورداس، تلسی داس کا بھی میرے ذہن پر بچپن سے ہی اثر رہا ہے۔ ''ایسا ہی ہوں'' دھیان میں انتر دھیان آتم آنند، تمہاری نظر کے زاویے، ''ہجر بھی اک وصال ہے گویا''، ''طواف اپنا اپنا'' وغیرہ وغیرہ نظموں میں یہ اثرات آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

بے شک میری ادبی نشو و نما جدیدیت کی تحریک کے سائے میں ہوئی ہے لیکن بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے آس پاس اپنا ادبی سفر شروع کرنے والے دوسرے شعرا کی طرح میرے ہاں بھی عصری اثرات کی نشاندہی

جا بجا کی جا سکتی ہے۔ اس حد تک اس جدید تر نسل کو نئے اور عصری اثرات کے امتزاج کی وجہ سے یار لوگوں نے مابعد جدید نسل کا نام بھی دیا ہے۔ میں ہمیشہ سے وابستگی کے ادب کے خلاف رہا ہوں لیکن سماجی امتیازات اور ناانصافی کے خلاف آوازوں کو میری نظموں میں جا بجا در آنے سے میں نے زبردستی روکنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ تمہارا ابیل ہوں ''تمہارے ظلم و ستم'' اور ''نیک خواہشات کے ساتھ تمہارا'' کے علاوہ مندرجہ ذیل دو نظمیں اس ضمن میں دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی۔

غلاموں کے نگر میں
کس لیے پیدا ہوا میں
میرے اندر
لوازم وہ بھی موجود ہیں
آزاد ہونے کے لیے جو ہیں ضروری
کبھی میں سوچتا ہوں
چھلانگ ایسی لگاؤں
کہ اس بستی سے اس بستی میں پہنچوں
مگر ایسا کہاں ہوتا ہے مجھ سے
اپنے کالے رنگ کو
ان گوری بستی والوں میں
کیسے کروں شامل
کہ جو کہتے ہیں
کالے گورے سب ہیں اک برابر
وہ مجھ کو
میرے کالے رنگ سے پہچانتے ہیں (شناخت اک المیہ)

غلامی اپنے اندر کی چھپانے کے لیے
میں اپنے سینے پر لگائے گھومتا ہوں
تختی جس پر لکھا ہے ''آزاد شہری''
مگر جب بے خیالی میں کہیں
ممنوعہ سڑکوں کی طرف میں جا نکلتا ہوں
وہاں یہ تختی پڑھتا ہوں
''نہیں ہے عام یہ شارع''
تو اکثر سوچتا ہوں

اپنے سینے پر لگی تختی اتاروں
توڑ دوں اس کو
کہیں پھینکوں اسے
لیکن غلامی اپنے اندر کی چھپانے کے لیے
مجھ کو لگائے رکھنا پڑتی ہے
یہ تختی اپنے سینے پر (غلامی اپنے اندر کی)

میری باقاعدہ تعلیم میں نفسیات کا پرچہ کبھی شامل نہیں رہا لیکن اپنے طور پر (Non formally) میں نفسیات سے متعلق کتابوں پر خاص طور سے فرائیڈ کے خوابوں کے مطالعات کی تلاش میں رہا کرتا تھا۔ انسانی نفسیات (Working of human mind) کے علاوہ ہند نفسیاتی (Super Concious) مطالعات، یوگ دھیان اور پرانایام وغیرہ میری دلچسپی کے موضوع رہے ہیں۔ میری کئی نظمیں میرے خوابوں سے متعلق ہیں کچھ نظمیں تو میرے خواب ہیں جو میں نے من وعن تحریر کر دئے ہیں۔ فرائیڈ کے اس نقطۂ نظر کا میں قائل ہوں کہ خواب مخصوص علامتی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ''شیکسپیئر میرے خواب میں''، ''فرائیڈ یہ کیسا خواب''، ''چین اس کو کبھی نہیں آتا''، ''کیوں کہ میں سچ نہیں بولتا'' وغیرہ نظموں میں یہ اثرات نمایاں ہیں۔

ہند آریائی اساطیر یعنی پورانک کتھاؤں اور پورانک کرداروں کی میری سوچ پر گہری چھاپ ہے۔ میری ذات قریب قریب ہند آریائی دیومالائی تہذیب کے ساتھ منسلک ہے۔ دیومالائی کردار اور کتھائیں جب بھی علامتی یا استعاراتی سطح پر میری نظموں میں در آتی ہیں اپنی زبان اپنا محاورہ ساتھ لے کر آتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نظم کا مضمون اپنی زبان ساتھ لے کر آتا ہے اور شاعر اگر اس زبان میں بنیادی تبدیلی کرتا ہے تو وہ ادب کے ساتھ بے ایمانی کرتا ہے اور اپنے ساتھ جھوٹ بولتا ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ زندہ زبانوں کو مسلسل ترقی کرتے رہنے کے لیے اپنا بنیادی ڈھانچہ برقرار رکھتے ہوئے دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرتے رہنا چاہیے۔ ہمیں اردو کو عہد جدید کی انگریزی زبان کی طرح پھلتے پھولتے ہوئے دیکھنا ہے۔ اسے عہد قدیم کی سنسکرت نہیں بنانا ہے۔ اس اثناء میں ''میں سرسوتی کا واہن ہوں''، ''یتری اُپما تو ہے بن آئی''، ''رتھ کے پہیئے کو اٹھائے ہوئے'' وغیرہ نظمیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

شاعر اپنے اصل میں مست قلندر فقیر جیسا ہوتا ہے۔ شاعری اس پر یوں نازل ہوتی ہے جیسے کسی سنت پرش کو آکاش وانی ہوتی ہے۔ گورونانک دیو نے اپنی ایک تخلیق کے آغاز میں کہا ہے:

جیسی میں آوے خصم کی وانی تیسڑا کری گیان وے لالو

آج کا شاعر دنیادار پرکار ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر کے تجربات سے وقتاً فوقتاً دوچار ضرور ہوتا ہے۔ عالم سرمستی میں شاعر کے ساتھ ایسے قلندرانہ معاملات اکثر پیش آتے ہیں جو کبھی کبھی نام نہاد مہذب وضابطہ اور باقاعدہ حلقوں میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے۔ پنجابی کے صوفی شاعر حضرت بلھے شاہ اور اردو میں غالب اس سلسلے کی بہترین مثالیں ہیں۔ نئی نظم نئی شاعری میں بھی اندر کے تجربات کہیں نہ کہیں موجود رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ''میری تنہائی میرا بہترین ساتھی''، ''آج صبح''، ''تم نے صبح بخیر کہنے کے لیے''، ''اس بھیڑ بھاڑ بھرے''، ''بری سے بری

سوچ''، نظمیں دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی۔

باہم انسانی رشتے اور ان رشتوں سے پیدا ہونے والے معاملات شعری روایات میں ہمیشہ سے شامل رہے ہیں۔ بالواسطہ، بلاواسطہ یہاں وہاں الجھنا فطرت آدم کا حصہ ہے۔ دوست دشمن واقف ناواقف اپنے پرائے کئی کئی طرح سے ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ بلکہ کئی بار تحریک بھی دیتے ہیں۔ یہ عناصر جب دل شاعر پر نزول کرتے ہیں تو نتیجہ نظمیات میں بھی کہیں نہ کہیں ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ میری نظموں میں بھی ان معاملات کی جھلک ملتی ہے۔ مثلاً میری اہلیہ انو جو میری نظمیں (اور غزلوں) کے سفر میں قدم قدم میرے ساتھ رہی ہیں ان کے قدموں کی آہٹ جگہ جگہ ان نظموں میں سنی جا سکتی ہے۔ میرے شاعر دوست راج کمار چندن کے عجیب وغریب البیلے انداز زندگی نے میری فکر کو بہت کچھ دیا ہے۔ میرے والد میرے بچپن میں مجھے پورانک کتھائیں اور سکھ مذہب کی تواریخ کچھ اس دلچسپ انداز میں سنایا کرتے تھے کہ میرے اور ان کے درمیان ایک الگ قسم کا دانشورانہ رشتہ باپ بیٹے کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوطی سے قائم ہے۔ میری بیٹی روچکا پال کی پیدائش سے ہی اس کی عادات وحرکات میں میری دلچسپی میری نظموں میں منعکس ہوتی رہی ہے۔ مندرجہ ذیل نظم اس سلسلے میں مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

''نرسری کلاس میں پڑھنے والی میری ننھی بیٹی
نوٹ بک کے بجائے دیواروں پر
ہوم ورک کرنا زیادہ پسند کرتی ہے
میں ڈانٹ ڈپٹ کر کے
نوٹ بک پر
اس سے ہوم ورک تو کروالیتا ہوں
مگر دیواروں پر ہوم ورک کرنے
عجیب وغریب تصویریں بنانے
اور نہ جانے کیا کیا لکھنے سے
اسے روک نہیں پاتا
یعنی جتنا میں اسے
نوٹ بکس میں
سمیٹنا چاہتا ہوں
اتنی وہ دیواروں پر پھیلتی جا رہی ہے'' (اپنا اپنا کینوس)

اپریل، مئی ۲۰۰۸ء میں ہندوستان کی ریاست کرناٹک کے ایک ضلع مانڈیا میں مجھے اسمبلی الیکشن کے لیے ہندوستانی الیکشن کمیشن کی طرف سے Observer کے طور پر کام کرنا پڑا۔ وہاں کے ایک مہینے کے قیام کے دوران امیدواروں کے اخراجات کی اوبزرور محترمہ وندنا ساگر (جو انکم ٹیکس کی ایک اعلیٰ افسر ہیں) کے ساتھ اکٹھے کام کرنے کی وجہ سے بہت قریب کا اٹھنا بیٹھنا رہا۔ اس دوران میں وندنا ساگر کی باضابطہ باقاعدہ افسرانہ ذہانت اور پروقار خوبصورت

شخصیت نے میری شعری حس کو زبردست متاثر کیا۔ ''اسی میں تمہاری شان ہے'' نظم میں نے وندنا کی وساطت سے دنیا بھر کی عورت ذات کے نام منسوب کی ہے۔ اس کے علاوہ میری اور کئی نظموں میں ان کی شخصیت کی خوبصورت چھاپ موجود ہے۔ اس ضمن میں ''کیا یہ تمہیں ہو''، ''کوئی کیا کرے''، ''صرف تمہارے احساس نے''، ''تم پری میں آدمی'' وغیرہ وغیرہ نظمیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مذکورہ بالا انسانی رشتے مثبت اثرات کے حامل ہیں جبکہ منفی اثرات رکھنے والے رشتوں کی بھی آدمی کی زندگی میں کمی نہیں ہوتی۔ شاعر کے ہاں منفی اثرات کے حامل رشتے بھی کہیں نہ کہیں شاعری میں ضرور منعکس ہوتے ہیں۔ ''ہاں میں شاعر ہوں''، ''جذبے اور پیمانے''، ''نیک خواہشات کے ساتھ تمہارا''، ''میری نظموں کا المیہ''، ''میں بہت خوش ہوں'' وغیرہ نظمیں اس سلسلے میں دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔

اس مضمون میں جن عوامل وعناصر کا ذکر میں نے کیا ہے شاعری کے محرکات دراصل اس سے کئی کئی گنا زیادہ ہیں۔ شاعر کے تمام تر محرکات کا شمار کرنا بلکہ ان کی مکمل نشاندہی کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ شعریت کے عوام و عناصر و جزویات ومحرکات کیا ہیں، کیا نہیں، شاعر اس بات کو کبھی پوری طرح سے سمجھ ہی نہیں سکتا۔ شعریت کب کس دروازے سے شاعر کے ذہن ودل میں داخلہ حاصل کرتی ہے، اس پر کسی کا قابو نہیں ہے۔ یہی نہیں شعریت کبھی تتلی کی طرح، کبھی اڑتی ہوئی چڑیا کی طرح، کب کہاں سے آکے کس شاخ پر کس پھول پر بیٹھ جائے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ خود میری نظمیں مجھ پر کبھی اڑتے ہوئے پرندے کی طرح تو کبھی کسی رنگین تتلی کی طرح نازل ہوئی ہیں۔ جیسے کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، میری کئی نظمیں تو میرے کچھ ایک خوابوں کی تحریری تصاویر ہیں۔ ظاہر ہے کہ خواب تو سوچ سمجھ کر دیکھا نہیں جاتا۔

میں اور میری غزل

پرتپال سنگھ بیتاب

میرا آبائی تعلق ریاست جموں وکشمیر کے ضلع پونچھ میں عین سرحد (ہندوستانی اور پاکستانی کشمیر کے درمیان قصبے کی حقیقی لکیر) پرواقع ایک گاؤں کھڑی دھرمشال سے ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامی حالات کے دوران میرے والدین مہاجر بن کر پونچھ سے نکل گئے تھے اور پھر کافی عرصے تک ہندوستان کے الگ الگ علاقوں میں بھٹکتے رہے، حالت یہ تھی کہ:

خیمہ لبستی کوئی نہ راس آئی　　　　ہم وہ اجڑے کہ پھر بسے بھی نہیں

اسی رواروی کے عالم میں ۲۶ رجولائی ۱۹۴۹ء کے دن جب میری پیدائش واقع ہوئی تو میرے والدین انبالہ میں تھے۔ (انبالہ ان دنوں پنجاب کا حصہ تھا، آج ہریانہ میں ہے) بچپن پنجاب میں مہاجروں کی طرح گزرا۔ پھر ۶۵-۱۹۶۴ء میں ہمارا خاندان واپس جموں وکشمیر ریاست میں آگیا اور جموں شہر میں آباد ہوگیا۔

جموں شہر میں میری تعلیم ایم۔اے۔، ایل۔ایل۔بی۔ تک مکمل ہوئی اور یہاں سے کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کا امتحان پاس کر کے میں سرکار میں انڈر سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوگیا۔

جموں میں اسی دوران شعر کہنے کا شوق میرے اندر کچھ اس طرح سے پیدا ہوگیا جیسے کوئی پانی کا چشمہ بڑی شدت سے دھرتی کا سینہ چیر کر اچانک پھوٹ پڑتا ہے۔ اصل میں شعریت کا سلسلہ کہیں اندر ہی اندر بچپن سے پنپتا رہا ہے۔ اس کی تحریک مجھے دراصل ان دوہوں سے ملتی رہی ہے جو ہماری مذہبی کتاب گورو گرنتھ صاحب میں موجود ہیں۔ کبیر، روی داس، نامدیو، گورونانک، گورو ارجن دیو اور گورو تیغ بہادر صاحب کے دوہے مجھے بے حد متاثر کرتے رہے ہیں۔ ان دوہوں میں بھگتی رس کا فلسفہ تو موجود ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو غضب کی شعریت ان میں موجود ہے وہ میری شعری حس کو تحریک دیتی رہی ہے۔ عہد وسطیٰ میں بھگت رسنت کویوں نے جو دوہے کہے ہیں ان کا میں اردو فارسی کے کچھ ایک شعروں سے موازنہ کرتا رہا ہوں۔ دو مصرعوں میں ایک مکمل مربوط مضمون کا اظہار جس نفاست سلاست اور بلاغت کے ساتھ ان دونوں اصناف میں ہوتا ہے اس کا جواب نہیں۔

دوہے کو غزل کے مطالعے کی حیثیت سے بھی میں دیکھتا اور سوچتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ دو مصرعوں میں ایک مکمل نظم جس کامیابی سے دوہے اور غزل کے شعر میں کہی جاسکتی ہے اس کی مثال شاید دنیا کی اور کسی صنف شاعری میں نہ ملتی ہوگی۔ میں نے کئی بار یہ بھی سوچا ہے کہ دوہے کے وزن میں غزل بھی کہی جاسکتی ہے، حالانکہ میں ایسا نہ کرسکا لیکن اگر کیا جائے تو یہ ایک دلچسپ تجربہ ہوگا۔ مطالعے میں برابر دوہا اور دوسرے شعروں میں پہلا مصرع قافیہ کے بغیر ہو، یہ غزل کی ایک بہترین ہند عروضی مثال ہوسکتی ہے۔ بہرحال عہد وسطیٰ کے سنت کویوں کے جو دوہے مجھے

شعری اعتبار سے متاثر کرتے رہے ہیں ان میں سے کچھ ایک ذیل میں درج ہیں:

حد حد جائے ہر کوئی ان حد جائے نہ کوئے — حد انحد کے بیچ میں رہا کبیرا سوئے
چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے — دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے
کبرا کھڑا بازار میں سب کی مانگے خیر — نا کاہو سے دوستی نا کاہو سے بیر (کبیر)

میں جانیا دکھ مجھ کو دکھ سبایا جگ — اونچے چڑھ کے دیکھیا گھر گھر ایہا اگ
جے تو عقل لطیف کالے لکھ نہ لیکھ — آپنڑے گریبان میں سرنیواں کر دیکھ
(حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر)

رام گیوراون گیو جاں کو بہہ پریوار — کہہ نانک تھر کچھ نہیں سپنے جیوں سنسار
چنتا تا کی کیجیے جو انہونی ہوئے — اومارگ سنسار کو نانک تھر نہیں کوئے (گورو تیغ بہادر)
آگیا بھئی اکال کی تبھی چلایو پنتھ — سب سکھن کو حکم ہے گورو مانیو گرنتھ (گورو گوبند سنگھ)

مذکورہ بھگت رسنت رصوفی شاعروں میں سب سے پرانے گیارہویں ربارہویں صدی عیسوی کے بابا فرید ہیں جنہیں پنجابی کا پہلا باقاعدہ شاعر مانا جاتا ہے۔ پھر کبیر صاحب ہیں جو چودھویں پندرویں صدی عیسوی میں ہو گذرے ہیں اور جنہیں ہندی کا ایک بہت ہی مستند شاعر مانا جاتا ہے۔ گورو تیغ بہادر صاحب اور گورو گوبند سنگھ (جو آپس میں باپ اور بیٹا تھے) سترہویں اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوئے ہیں اور دونوں کا ذکر ہندی شاعری میں آتا ہے جبکہ سکھ گورو ہونے کے ناطے پنجابی والے انہیں پنجابی شاعر مان کر چلتے ہیں۔

یہاں میں جس بات کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان تینوں شاعروں کی (اور ان کے علاوہ دوسرے سکھ گوروؤں اور روی داس، نامدیو وغیرہ جیسے دوسرے سنت کویوں کی) زبان کا اگر باقاعدہ مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ زبان دراصل اس عہد کی اردو زبان ہے۔ افسوس کہ اردو زبان وادب کے تواریخ دانوں اور محققین کی نظر ان تخلیقات پر نہ جا سکی۔ شاید کسی مصلحت کے تحت یا انجانے میں۔ میرے خیال میں اردو والوں کے لیے اس میدان میں کام کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

دوہے کا تاثر تو میرے ذہن میں پہلے سے ہی موجود تھا۔ عہد شباب تک آتے آتے بیگم اختر، اقبال بانو، فریدہ خانم، کے ایل سہگل، طلعت محمود اور بعد میں مہدی حسن وغیرہ کی غزل گائکی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا۔ دوہے کی طرح کے غزل کے شعر میں میری دلچسپی مجھے سفر کلام میر و مومن و آتش و ناسخ و غالب و داغ تک لے آئی۔ اک نہاں خانہ تھا جو مجھ پر کھل رہا تھا۔ اساتذہ اور بڑے شاعروں کے جو شعر بطور خاص مجھے مسلسل متاثر کرتے آئے ہیں ان میں چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے — رنج و غم جمع کیے لاکھ تو دیوان کیا (میر)
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومن)
رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی ان سے نجات پائے کیوں (غالب)

زیست سے تنگ ہوائے داغؔ تو جیتے کیوں ہو | جان پیاری بھی نہیں جان سے جاتے بھی نہیں
ہوش و حواس و تاب و طباں داغؔ جا چکے | اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا
خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا | جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا (داغؔ)
اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے | مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے (ذوقؔ)
کبھی اے حقیقت منتظر، نظر آ لباس مجاز میں | کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں (اقبالؔ)
در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے | تو فیضؔ دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں
رقص مے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو | سوئے مے خانہ سفیران حرم آتے ہیں (فیضؔ)
یاد کے بے نشاں جزیروں سے | تیری آواز آ رہی ہے ابھی (ناصرؔ کاظمی)

مذکورہ اشعار کے بغور مطالعے سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ شروع سے ہی میری دلچسپی کس قسم کے اشعار میں رہی ہے۔ خاص طور سے اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جن چند اشعار اور دوہوں کا ذکر میں نے یہاں کیا ہے ان میں فکر کی حد تک بھی ایک خاص قسم کی مماثلت پائی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں کچھ فارسی اشعار بھی میری دلچسپی کا مرکز رہے ہیں۔ فارسی کی تعلیم حالانکہ میں نے باقاعدگی سے کبھی حاصل نہیں کی لیکن چند ایک اشعار اردو ترجمے کے ساتھ پڑھنے سننے کی حد تک اس زبان میں میری دلچسپی رہی ہے۔ خاص طور سے سکھ مذہب کی تعلیمات میں شامل گورو گوبند سنگھ صاحب کی اور ان کے ایک خاص مرید نند لعل گویا کی فارسی شاعری بچپن سے پڑھتا سنتا رہا ہوں۔ یوں بھی فارسی زبان کا ہماری زبانوں (خاص طور سے ہندی، اردو، پنجابی) پر اتنا گہرا اثر ہے کہ کبھی کبھار یقین ہی نہیں آتا جب غور و فکر کرنے پر احساس ہوتا ہے کہ فلاں لفظ فارسی الاصل ہے۔ آج کی دنیا کے لسانی ماحول اور روزی روٹی کے مسائل کی وجہ سے انگریزی زبان بے شک ہمارے معاشرے میں گھر کر گئی ہے لیکن ہندوستانی زبانوں پر آج بھی جتنا اثر فارسی زبان کا ہے اتنا انگریزی زبان کا نہیں ہے۔ اتنی امیر زبان جس طرح سے ہمارے معاشرے سے دور ہوتی جا رہی ہے یہ امر بھی باعث فکر و تشویش ہے۔ ایسے چند ایک اشعار جنھوں نے میری تخلیقی سوچ پر اپنے نقش بہت مضبوطی سے قائم کیے ہیں ذیل میں درج ہیں:

چو کار از ہمہ حیلتے در گذشت | حلال است بردن بہ شمشیر دست (گورو گوبند سنگھ)
دین و دنیا در کمندے آں پری رخسار ما | ہر دو عالم قیمتے یک تار موئے یار ما
دل اگر دانا بود اندر کنارش یار ہست | چشم گر بینا بود در ہر طرف دیدار ہست (نند لعل گویا)
تفاوتیست میان شنیدن من و تو | تو بستن در و من فتح باب می شنوم (صائبؔ تبریزی)
بوادئ کہ در آں خضر را عصا خفتست | بہ سینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست (غالبؔ)

مذکورہ قسم کے اشعار، دوہوں اور دوسری نئی پرانی ہندی، پنجابی شاعری کے تاثرات کے پس منظر میں بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کا آغاز ہوتے ہوتے میں نے میدان شعر میں قدم رکھا۔ ابتدائی ۴/۵ برسوں کے دوران اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی شعر کہے۔ لیکن بعد میں دو کشتیوں کا سوار ہونے کا خیال چھوڑ کر صرف اردو ہی میں شعر گوئی جاری رکھنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ حالانکہ یہ بہت کٹھن تھا لیکن حتمی فیصلہ یہ تھا کہ میرے ہم مذہب پنجابی زبان

میں تو شاعری کرتے ہی میں مزہ جب کہ کوئی اردو میں نام پیدا کر سکے۔

آغاز شعر گوئی کے زمانے سے ہی اپنی روایتی تعلیم کے ساتھ ساتھ اشتراکیت، وجودیت، نفسیات وغیرہ میں میری دلچسپی مطالعے کی حد تک رہی ہے۔ ہندوستانی فلسفے (درشن) ہندو دیومالا، بھگتی رس اور تصوف کا پس منظر پہلے سے تھا۔ اتفاق سے اس زمانے میں زیادہ تر ہندوستانی زبانوں کی طرح جدیدیت کی طرز فکر و اسلوب اردو کے ماحول پر بھی اثر انداز تھی۔ کل ملا کر میری شاعری کا آغاز اپنے ہی پس منظر اپنے ہی انداز کے ساتھ ساتھ ہوا۔ جوش ملسیانی کے شاگرد، رشید ساحر سیالکوٹی مرحوم کچھ عرصہ تک میرے اشعار پر اصلاح فرماتے رہے۔ حالانکہ ساحر صاحب داغ گھرانے کی روایات کے پابند تھے اور میں فکر و خیال کی حد تک آزادیوں کا متوالا تھا۔ لیکن ساحر صاحب کی اصلاحات کی بدولت میں عیوب و محاسن شعری سے بخوبی واقف ہو سکا اور غزل کے روایتی رکھ رکھاؤ اور موزونیت تک میری رسائی ممکن ہو سکی۔ بے شک رسومیات لفظیات سے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ ہر خیال اپنی لفظیات ساتھ لے کر آتا ہے اور اس کے ساتھ زیادہ چھیڑ چھاڑ اس کی انفرادیت اور اصلیت کو مجروح کرنے کے مترادف ہوتی ہے۔

میں سکھ مذہب کی تعلیمات کے ساتھ بہت گہرائی سے جڑا ہوا ہوں۔ بچپن سے ہی خدا پر ماتما وا گورو سے متعلق میرے اندر طرح طرح کے سوالات کھڑے ہوتے رہے ہیں۔ ایک طرح سے میرا اور خدا کا مکالمہ بھی ہمیشہ سے جاری و ساری رہا ہے۔ خدا سے میری مراد اس ایک ایشور سے ہے، جس کے بارے میں گورو گوبند سنگھ نے کہا ہے:

آ دانت ایکے اوتارا　　　سوئی گورو سمجھیو ہمارا

اپنی زندگی سے متعلق رہنمائی اور برکات کی تمنا خدا سے مجھے ہمیشہ رہی ہے اس کی چند مثالیں میرے مندرجہ ذیل اشعار میں دیکھی جا سکتی ہیں:

خواہش چاند ستاروں کی اک گٹھری ہے　　　میری چادر آسمان پر پھیلا دے
یخ بستگی محیط ہے فکر و شعور پر　　　ان برف موسموں کو کوئی آفتاب دے
افق نو دے جاودانی دے　　　میرے خوابوں کو زندگانی دے
اگر ہوں راستے پر مطمئن کر　　　اگر بے سمت ہوں راہ سفر دے
میں مستقبل میں جینا چاہتا ہوں　　　گرفت حال اگر آزاد کر دے
نہ دے اونچائی میرے قد کو بے شک　　　مری ہر شاخ کو لیکن ثمر دے

دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے الگ رہنا سب کے ساتھ چلتے ہوئے بھی گویا اپنی الگ راہ چلنا ایک طرح سے میری زندگی کا ایک روحانی جزو رہا ہے، جس کی بنیاد شاید (یا دراصل) سکھ ازم کا لیپتا میں نر لیپتا یعنی (Detatchment in attatchment) کا فلسفہ ہے، ذیل میں میرے کچھ اشعار میرے اس شیوے کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

دنیائے رنگ و بو سے کنارہ نہیں کیا　　　اچھا کیا جو ہم نے دکھاوا نہیں کیا
ہم جسم کو بچا نہ سکے گرد سے مگر　　　یہ تو کیا کہ روح کو میلا نہیں کیا
تن تنہا بھی گامزن ہوں اور　　　ساتھ سب کے رواں دواں بھی ہوں

جنگل اک لانگھنا پڑا بیتاب — ہمیں نسبت تھی اک صنوبر سے
اپنی خاطر ہم نے اک ننھا جزیرہ چن لیا — اور بحر بیکراں کو بیکراں رہنے دیا
میں جسم سے شامل ہوں مگر قافلے والو — جو روح کی پوچھو تو یہ ہلکان بہت ہے

اپنی آنکھوں کے سامنے تہذیبوں کا، ثقافتوں کا، معاشروں کا، بڑے بڑے سیاسی نظاموں کا، مذہبی، اخلاقی اقدار کا زوال دیکھنا بیسویں صدی میں عام سی بات ہوگئی تھی۔ عام آدمی کو تو کئی بار احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک چکی ہے اور کتنے بلند و بالا اشجار آنکھوں کے سامنے گر چکے ہیں لیکن شاعر کا حساس دل بڑی شدت سے ان سب کو محسوس کرتا ہے۔ عام طور پر ایک شاعر کے لیے ان سب میں کچھ کر پانا تو مشکل ہوتا ہے مگر اپنے شعری افکار میں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اس منظر نامے کو شامل کرنا نہیں بھولتا۔ ذیل میں دئے گئے چند اشعار میری اس فکر کا احاطہ کرتے ہیں:

اونچا پہاڑ دفن ہوا گہری کھائی میں — خاموش دیکھتے رہے اپنا زوال ہم
جب اپنی ذات پر ہی بھروسہ نہیں رہا — ہم کو کسی سے بھی کوئی شکوہ نہیں رہا
یہ تو ہونا تھا ڈبونا تھا ہمیں ہر حال میں — اس نے ہم پر ساحلوں کو بھی سمندر کر دیا
دیوار و در کھڑے رہے باہر اسی طرح — اور زلزلہ مکان کے اندر اتر گیا
غم یہ نہیں کہ خیمے ہمارے اکھڑ گئے — آندھی اکھاڑ لے گئی اونچے درخت بھی
ایک ایک کر کے اپنی جڑوں سے جدا ہوئے — کیا کیا بلند تھے جو شجر لے گئی ہوا

سکھ ازم توحید کے فلسفے میں یقین رکھتا ہے، میں بچپن سے اپنی روحانی تعلیمات کے پس منظر میں اس سرو شکتی مان (Omni-protent) اور سرو ویا پک (Omni-present) خدا پر ماتما، واہیگورو (God is God one) کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ اس پر میرے یقین میں کبھی کمی نہیں آئی لیکن اس کے بارے میں طرح طرح سے سوچنا میرے اندر ہمیشہ جاری رہا ہے۔ چند شعر دیکھئے:

مانتا دل سے ہوں اسے بیتاب — سوچتا پھر بھی ہوں خدا کیا ہے
تیغ بھی وہ ہے سپر بھی وہ ہے — وہ جو ہم ایک خدا رکھتے ہیں
وہ نہ ہو کر بھی ہے چہار طرف — ہجر بھی اک وصال ہے گویا
میرا سایہ اور کوئی — اور کسی کا سایہ میں
مچھلی جیسا دھیان ترا — ساگر جیسا گہرا میں
وہ سچا ہے مگر اس کے — سبھی حوالے جھوٹے ہیں
اس کا کوئی رنگ نہیں — سارے رنگ اسی کے ہیں
ہیں زرد و سبز سارے رنگ اسی کے — مگر وہ سب رتوں سے ماورا ہے
تھا اس کی نفی میں بھی کوئی رنگ ثنا کا — منکر بھی رہے ہم تو رہا ہم کو خدا یاد
اس کے قدموں کی چاپ باد نسیم — بلبلیں خوش بیانیاں اس کی

دھوپ اس کی محبتوں کا جوش — بارشیں گل فشانیاں اس کی

آدمی کی زندگی میں جذبات کا بہت بڑا رول ہوتا ہے۔ کبھی مثبت کبھی منفی۔ جذبات کے بہاؤ میں کئی بار آدمی اجتماعی اور انفرادی سطح پر کئی ایسے کام کر جاتا ہے جو کچھ وقت گذر جانے پر باعث شرمندگی بن جاتے ہیں۔ شخصیتوں اور معاشروں کے سامنے ایسے مرحلے بھی آتے ہیں جب مندرجہ ذیل اشعار کے جیسی سوچ پنپنے لگتی ہے:

کچھ دیر وہ پرندہ اڑاتا رہا ہمیں — پھر کیا ہوا کہ بھول گئے اپنی چال ہم
بیتاب جس میں کھوئے رہے ہم تمام عمر — آنکھوں کے سامنے وہ دھواں بھی بکھر گیا
سبز و زریں فصل کی ہم سے تھی جن کو آرزو — ہم نے ان آبی زمینوں کو بھی بنجر کر دیا
اوروں پر اپنی ذات کی ترجیح تو بجا — ہم نے کچھ اپنے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا
ہم بھی اس ہجرتوں کے موسم میں — نکل آئے جنون میں گھر سے
موجوں کے ساتھ دور بہت بہہ گئے تھے ہم — پھر جانے کب چڑھا ہوا دریا اتر گیا

عہد جدید کے معاشرے میں آدمی کی زندگی مسلسل گردشوں، لغزشوں، کاوشوں کے درمیان مصروف سفر رہتی ہے۔ اس بیچ میں جسمانی کثرتوں سے الگ نفسیاتی تجربات زندگی میں عجیب وغریب قسم کا کردار ادا کرتے ہیں اور بعض اوقات تبدیلیاں بھی لاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار اس کیفیت کو پیش کرتے ہیں:

بے سمت سفر اور نہ منزل کا پتہ یاد — گردش ہی کچھ ایسی رہی کچھ بھی نہ رہا یاد
مانوس پاؤں سے ہوا جب راستہ میرا — گردش نے مجھ سے چھین لیا حافظہ مرا
ابھی پہلی تھکان باقی ہے — اور ارادے نئے سفر کے ہیں
پا بہ زنجیر ہم رہے مزدور — زندگی تیرے کارخانے میں
واہمے پالتا ہوں میں بیتاب — اور پرچھائیوں سے لڑتا ہوں
زندگی دیکھ میں تری خاطر — روز کس کس طرح سے مرتا ہوں
مرحلے کامیابیوں کے تھے — ہر قدم اک عذاب میرا تھا

شاعری دراصل شاعر کے مختلف اوقات میں مختلف حالات کے مختلف داخلی و خارجی تجربات کا والہانہ اظہار ہوتی ہے۔ شاعری کسی ایک کیفیت، کسی ایک نظریے، کسی ایک فلسفے کے ساتھ بندھ کر نہیں ہوتی۔ میرے دل میں بارہا یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ مجھے ٹھیک سے سمجھا نہیں جا رہا۔ مجھے ٹھیک سے پہچانا نہیں جا رہا۔ آج کے عہد میں جبکہ دنیا Global Village ہو کر رہ گئی ہے، اپنی پہچان اور پذیرائی کا بحران آدمی کو بڑی شدت سے محسوس ہونا لازمی بات ہے۔ ذیل میں میرے کچھ شعر ہیں جو اس جذبے کا اظہار کرتے ہیں:

منتظر ازل سے ہوں میں کسی کولمبس کا — بیکراں سمندر میں بے نشاں جزیرہ ہوں
پانی راستہ دے گا ایک دن سفینے کو — بے نشاں جزیرے تو انتظار کر میرا
کس طرف سے آیا ہوں رخ ہے اب کدھر میرا — راستوں کے جنگل میں کھو گیا سفر میرا
اس آذروں کے شہر میں پتھر تو میں بھی تھا — اتری کسی نظر میں نہ کوئی ادا میری

تم کسی نام سے پکارو ہمیں — ہم تو پہچان کھو چکے ہیں میاں
دوسروں سے خود اپنے کوچے میں — ہم پتہ اپنا پوچھتے ہیں میاں
مجھ کو جینا نہیں ہے کچھ مشکل — مسئلہ تو مری بقا کا ہے

آج کے دور میں انسان کی زندگی میں بھیڑ اور mob mentality کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔کوئی بھی بات کب بھیڑ کے حوالے ہو جائے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔سیاسی اور جمہوری معاشروں میں بھیڑ سے متعلق آدمی کے ساتھ مختلف قسم کے نفسیاتی تجربات پیش آتے رہے ہیں۔کچھ مثالیں دیکھئے:

سمت کیسی یہاں سفر کیسا — بھیڑ میں ہم بھی چل رہے ہیں میاں
لیے جاتے ہو سوالات کہاں — بھیڑ میں ان کے جوابات کہاں
راستہ کس سے مانگتے ہو میاں — بھیڑ نے کس کی بات مانی ہے
جب دیکھتے ہیں بھیڑ میں قحط الرجال ہم — دیوار و در سے پوچھتے ہیں اپنا حال ہم
جس قدر سب کا ہے یہ اندھا سفر میرا بھی ہے — اس ہجوم بیکراں میں ایک سر میرا بھی ہے

جدوجہد زندگی میں آدمی ہمیشہ پریشان حال ہی نہیں رہتا بلکہ کئی بار تو پیکار کے لمحات سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔کبھی کبھی تو اندر کی مستی آدمی کو نامساعد حالات سے کھل کھیلنے پر آمادہ بھی کرتی ہے۔چند اشعار دیکھئے:

آلام کی زد میں ہے مگر شاد بہت ہے — دل عہد غلامی میں بھی آزاد بہت ہے
کچھ تو ہم پہلے سے ہی آزاد تھے — اور کچھ پرواز میں بھی پر کھلا
لطف پرواز میں نہیں ہوتا — جب مخالف ہوا نہیں ہوتی
پا شکستہ ہوئے جب سے بیتابؔ ہم — راستے سامنے سے گذرنے لگے
پاؤں میرے راستہ خود ہو گئے — ہر قدم پھر اک نیا منظر کھلا
اس دھوپ میں سایہ مجھے درکار تھا بیتابؔ — پھر کیا ہوا میں چل دیا دیوار سے آگے
بال و پر قائم تھے ثابت ہمت پرواز تھی — کچھ زمیں راس آگئی تھی آسماں رہنے دیا
کچھ مزاج اپنا بھی تھا بیتابؔ ان سب سے الگ — بس اکیلے چل دئے ہم کارواں رہنے دیا

خارجی دنیا نے کبھی انفرادی یا سماجی انصاف نہیں کیا۔انسانی تاریخ گواہ ہے کہ خارجی دنیا ہمیشہ سماجی ناانصافی کی مرتکب ہی رہی ہے۔شاعر جب باہر کی دنیا سے اکتا جاتا ہے یا اداس ہو جاتا ہے تو اندر کی (دنیا کی) طرف رجوع کرتا ہے۔اکثر دل شاعر کو محسوس ہوتا ہے کہ اندر کی دنیا دراصل باہر کی دنیا کے مقابلے کئی کئی گنا بلکہ اس سے زیادہ بہت زیادہ بڑی ہے۔عہد وسطیٰ کے مشہور بھکتی کوی سنت روی داس نے تو اپنے اندر ایک ایسا انصاف پسند ملک اور اس کے لیے مناسب معاشرتی نظام ڈھونڈ لیا تھا جس کے ذریعے وہ اس عہد کی لوٹ کھسوٹ پر مبنی ہندوستانی حکومتوں کو آئینہ دکھانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔سنت روی داسؔ کی یہ شعری تخلیق گورو گرنتھ صاحب میں موجود ہے۔لہٰذا اس کے مستند ہونے سے متعلق کوئی دو رائے نہیں۔یہ نظم ذیل میں درج ہے اور اس عہد کی بہترین اردو نظموں میں اس کا شمار ہو سکتا ہے۔(حالانکہ اردو زبان و ادب کے تاریخ دانوں نے کبھی اس پہلو پر غور کرنا ہی شاید مناسب نہیں سمجھا)

بے غم پو رہ شہر کو ناؤ　　دکھ اندوہ نہیں تہہ ٹھاؤ
نہ تشویش خراج نہ مال　　خوف نہ خطا نہ ترس زوال
اب موہے خوب وطن گہہ پائی　　اوہاں خیر سدا میرے بھائی
قائم دائم سدا پا تشاہی　　دوم نہ سیم ایک سوں آہی
آباد ان سدا مشہور　　اوہاں غنی بسیں معمور
تیوں تیوں سیر کریں جیوں بھاوے　　محرم مال نہ کو انکاوے
کہہ روی داس خلاص چمارا　　جو ہم شہری سومیت ہمارا

میری شاعری میں بھی باہر سے مایوس ہونے پر اندر کے سفر سے متعلق اشعار جا بجا ملتے ہیں:

زندگانی ہوگئی گوشہ نشینی میں تمام　　مل تو سکتا تھا مگر سارا جہاں رہنے دیا
اپنی خاموشی کے گنبد میں ہم　　ایک ہنگامہ بپا رکھتے ہیں
دنیا میں ہم تھے تو اپنی یاد نہ تھی　　اندر سفر کیا تو باہر بھول گئے
دیوار و در کھڑے رہے باہر اسی طرح　　اور زلزلہ مکان کے اندر اتر گیا
کچھ اور مرحلے ہیں فقیروں کی راہ کے　　یہ دونوں ایک جیسے ہیں تختہ بھی تخت بھی
دنیا سے الگ ہے ابھی اک ٹکڑا زمیں کا　　بستی ابھی اک اور بسانے کے لیے ہے
رونے کے لیے ہیں جو نہاں خانے الگ ہیں　　یہ سامنے سب جشن ہنسانے کے لیے ہے

بیسویں صدی جہاں قوموں، ملکوں، معاشروں، سیاسی نظاموں کے درمیان تصادم کی صدی تھی وہیں اکیسویں صدی تعمیر و ترقی، سائنس ٹکنالوجی، نئے ایام نئے آفاق کی صدی ہے۔ سائنس چاند پر گھر بنانے کی سوچ رہی ہے۔ شاعری تو سائنس سے آگے کی سوچ ہوتی ہے۔ نئے عہد، نئے حالات، نئے موسموں میں دل شاعر بھی کبھی کبھی آگے ہی آگے کی سوچتا ہے۔ یہ زندگی کی زندہ دلی کی سوچ اکیسویں صدی کے آگے چلتے چلتے اور بھی مضبوط ہونے والی ہے ایسی میری سوچ ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

تدبیر سے آگے کہیں تقدیر سے آگے　　ہے میری نظر خواب سے تعبیر سے آگے
بیتاب ستارے مرے رستے میں کھڑے ہیں　　دو چار قدم منزل تقدیر سے آگے
یہ آبلہ پائی تو مرا عزم سفر ہے　　جانا ہے مجھے وادیٔ پر خار سے آگے
تارے اپنے سفر میں رہتے ہیں　　اور میں اپنی راہ چلتا ہوں
میں دیکھ رہا ہوں تری تصویر کو بے شک　　میں سوچ رہا ہوں تری تصویر سے آگے
ایک پرواز ہے مگر شاہین　　وہ تمہارے پروں سے آگے ہے

عیاری، پرکاری، مکاری، Hypocracy جیسی بدتیں ہمارے معاشرے کے اندر اس قدر گھر کر چکی ہیں کہ ہماری زندگیاں ان عناصر کے بغیر ممکن ہی نہیں رہ گئی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ ان عناصر سے ہمارے معاشرے کو کیسے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ جب اپنے اندر جھانک کر دیکھتا ہوں تو اور بھی مایوس ہو جاتا ہوں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

دنیا تو ریا کار ہے عیار ہے مانا — خود ہم بھی ہیں بیتاب ادھر اور ادھر اور
کیا جوگی سنیاسی کیا بھوگی سنساری — کپڑوں سے باہر ہم سب اک جیسے نکلے
ہم نے ہاتھوں ہاتھ لیا بیتاب جنہیں وہ — پھولوں کی شکلوں والے انگارے نکلے
دونوں جانب سے بچنا فن کاری ہے — دنیا کی تلوار میاں دو دھاری ہے
اندر سجائے رکھتے ہیں گملوں میں کیکٹس — باہر تلاش کرتے ہیں تازہ گلاب ہم

میں جانتا ہوں کہ میری شاعری کے مذکورہ بالا عوامل وعناصر فطری تو ہیں لیکن مکمل نہیں ہیں۔ شعر اور شعریت کے اتنے پہلو ہوتے ہیں کہ ان کا مکمل احاطہ کرنا تو دور کی بات ہے انہیں پوری طرح سمجھ سکنا بھی قریب ناممکن ہے۔ خاص طور سے نئی شاعری کو سمجھنے کے لیے نئے تنقیدی پیمانوں کی ضرورت ہے۔ ذیل میں اپنے کچھ ایسے اشعار درج کر رہا ہوں جنہیں کسی خانے میں رکھنا میرے لیے بہت مشکل ہے شاید ناممکن:

کس نے چرا لیے ہیں زبانوں کے ذائقے — بادام و سیب میں کوئی لذت نہیں رہی
اب جو کسی کا عزم سفر ہی نہیں رہا — اب راستوں میں کوئی صعوبت نہیں رہی
جانے کس کمزور لمحے میں کسی آسیب نے — اندر آ کر مجھ کو اپنے گھر میں بے گھر کر دیا
ہر قدم اس شہر میں بارش تھی سنگ وخشت کی — ہم نے بھی بیتاب اپنے سر کو پتھر کر دیا
صدیاں ہماری راہ کو روکے کھڑی رہیں — اور زندگی گزرتی رہی سال و ماہ میں
پھر اس کے بعد پاؤں ہمارے نہ جم سکے — ٹوٹے زمیں سے ہم تو اڑا لے گئی ہوا
کسی ملبے سے پر نہیں ہوتا — میرے اندر جو خلا رہتا ہے
راستے تو کئی کھلے ہیں میاں — ہمیں کچھ بند ہو چکے ہیں میاں
پیچھے اب کیا ہے غبار رفتہ — دہر میں باغ عدم یاد آیا
اپنی تصویر میں صحرا ہی اگر رکھنا ہے — ہو سکے تو کسی گوشے میں شجر بھی رکھیے
کاغذی پیرہن ہیں خواب مرے — تیز ہے شہر کی ہوا کتنی
وہ پاگل پن ہی تھا شاید ہمارا — جو صحرا میں سمندر دیکھتے تھے
نت نئے رنگ میں نکلتا ہوں — اپنے خوابوں کے ساتھ چلتا ہوں
بستی میں سانپ آنے لگے ہر طرف نظر — اور پھر بسے بسائے ہوئے گھر اجڑ گئے
قبریں تمام آنے لگیں ایک سی نظر — آندھی چلی تو کوئی بھی کتبہ نہیں رہا
ہم نہ تھے کوئی مجنوں ہو گیا مگر بیتاب — بھیڑ سے نکلنے میں جامہ تار تار اپنا
یہ دنیا راہ میں بس آ گئی تھی — ہمیں کچھ اور منظر دیکھنا تھا
ہمعصروں کے قصے سنتا ہوں کیا کیا — آنے والی نسلوں سے شرمندہ ہوں
ہم کو خاموش نہ جانو صاحب — اندر اک شور بپا رہتا ہے

میری غزلوں سے متعلق اکثر کہا جاتا ہے اور شاید کسی حد تک بجا ہی کہا جاتا ہے کہ ان میں تغزل کا عنصر

موجود نہیں ہے۔ لیکن زندگی کے کئی لمحے ایسے بھی رہے ہیں جب میری غزلوں کے شعروں میں کسی نہ کسی دروازے سے تغزل کا عنصر داخلہ حاصل کرتا رہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میری شاعری میں تغزل اور تصوف کے مضامین جا بجا ملحق نظر آتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس کے قدموں کی چاپ بادِ نسیم　　کوئلیں خوش بیانیاں اس کی

تو ندیا بے انت اتھاہ　　اک ننھی سی گاگر میں

میں کہ ایک صحرا ہوں　　ایک آبجو ہے تو

زیور تخیل ہے　　حسن گفتگو ہے تو

ایسا دریا ہے وہ ہوتا ہوں میں جب اس کے قریب　　بن پیے ہی وہ مری پیاس بجھا دیتا ہے

چاہتا جب بھی ہے وہ مجھ سے مخاطب ہونا　　سامنے سے مرے دنیا کو ہٹا دیتا ہے

وہ نہ ہو کر بھی ہے چہار طرف　　ہجر بھی اک وصال ہے گویا

میری غزل کا سفر ہنوز جاری ہے، خوب سے خوب تر کی تلاش ہے، یہ ضرور ہے کہ نئے ہزاریے میں غزل کے شانہ بہ شانہ نظم بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے اور کئی حلقوں میں محسوس کیا جا رہا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے اس عہد کے پیچیدہ مضامین کے لیے نظم کے اظہار و بیان کی آزادی زیادہ موزوں ہے لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم و دائم ہے کہ غزل کا شعر نئی سے نئی بات کے اظہار کے لیے اپنے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرتا جا رہا ہے۔ میں اپنی غزل کی حد تک یہ کہہ سکتا ہوں کہ پچھلی چار دہائیوں سے میرا شعری سفر غزل و نظم ہر دو اصناف میں جاری ہے اور خدا نے چاہا تو رہتے دم تک جاری رہے گا۔ قاری و ناقد سے یہ گذارش ہے کہ وہ میرے اشعار کی افہام و تفہیم اپنے زاویۂ نگاہ سے ضرور کریں لیکن میرے انفرادی و اجتماعی پس منظر کو بھی ایسے میں اگر ملحوظ خاطر رکھیں تو شاید میرے اشعار کی معنویت اور بھی روشن ہو جائے۔

پرتپال سنگھ بیتابؔ سے ایک گفتگو
فکر و فن کے حوالے سے

جاوید انورؔ (وارانسی)

جاوید انورؔ: آج بتاریخ ۶ رجون ۲۰۰۹ء میں جاوید انور پرتپال سنگھ بیتابؔ صاحب کے دولت کدہ چشمہ شاہی ہٹ نمبر ۶ رسرینگر کشمیر میں ان کا ایک انٹرویو ریکارڈ کر رہا ہوں۔ پرتپال صاحب اجازت؟

پرتپال سنگھ بیتابؔ: اجازت کیا ہے۔ آپ تو مالک ہیں۔ شروع کریں۔

جاوید انورؔ: بہت شکریہ! بیتابؔ صاحب آپ اردو زبان و ادب کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ آپ نے اردو نظم نگاری کی تاریخ میں اپنی جدید نظموں کا جو اضافہ کیا ہے، وہ عہد حاضر کے بیش تر نظم نگاروں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تعلق سے سب سے پہلے یہ بتائیں کہ آپ پونچھ جیسے چھوٹے علاقے سے یا یوں کہیں کہ ایک بڑے گاؤں سے نکل کر آپ نے اتنا بڑا ادبی سفر اور بہترین زندگی کا سفر طے کیا۔ اس درمیان آپ کی ادبی تربیت کے جو مراحل رہے ہیں، اس تعلق سے کچھ عرض کریں۔

پرتپال سنگھ بیتابؔ: جاوید انورؔ یہ جو ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ تھا، اس سے ہمارا علاقہ پونچھ جو ایک ریاست تھی، کا بیشتر حصہ پاکستان میں چلا گیا اور ہمارا گاؤں بالکل Line of Control ہو گیا۔ میرے گاؤں کے متعلق بھی اس زمانے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ ہندوستان میں رہے گا یا پاکستان میں۔ تو اس دور میں بڑے بھائی میرے جو امریکہ میں ڈاکٹر ہیں اور ایک بہن کو وہیں ہمارا ننہال جو قریب میں ہے اور بھی رشتہ دار ہیں اب بھی ہیں، چھوڑ کر دوسرے مہاجرین کی طرح میرے والدین بھی ہمیں ساتھ لیے ہوئے ہندوستان کے دوسرے علاقوں مثلاً پنجاب، جموں میں بھٹکتے رہے۔ اس دوران ایک شعر بھی میں نے کہا تھا کہ:

"خیمہ بستی کوئی نہ راس آئی
ہم وہ اجڑے کہ پھر بسے ہی نہیں"

میں تو ۱۹۴۷ء کے تین سال بعد پیدا ہوا۔ تو پونچھ اور پنجاب آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ ہمارا گاؤں بارڈر پر تھا لیکن ہندوستان کا حصہ بنا رہا۔ اور ہماری زمین بھی تھی اور ابھی بھی ہے کافی زمین۔ لیکن میرے والدین بھٹکتے رہے پنجاب سے جموں میں۔ ۱۹۶۵ء میں یہ مستقل ارادہ کیا کہ ہم جموں میں ہی بسیں گے۔ تو اس طرح میرا پڑھائی کا سلسلہ بھی پونچھ اور پنجاب کے ارد گرد گھومتا رہا۔ میں نے ہندی، پنجابی اور اردو تینوں ایک ساتھ پڑھی ہیں۔ عبور تو نہیں کہہ سکتا لیکن میری پکڑ کہہ سکتا ہوں کہ تینوں زبانوں پر یکساں ہے۔ اور انگریزی تو ہم پڑھتے ہی ہیں کہ ہمارے کورس کا حصہ

تھی۔ پونچھ جو ہمارا علاقہ ہے، بڑا زرخیز ہے ادبی اعتبار سے۔ وہاں بول چال کی زبان آج بھی اردو ہے۔ گھر کے اندر تو ہم کچھ بھی بولیں لیکن بازار میں، گاؤں میں ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے کی زبان اردو ہی ہے۔ ٹھاکر پونچھی، چراغ حسن حسرت جو بعد میں لاہور چلے گئے، کرشن چندر، مہندر ناتھ۔ کرشن چندر تو پانچ سال کی عمر میں یہاں آئے ان کے والد پونچھ کے بادشاہ کے ڈاکٹر بن کر ریاست آئے تھے۔ کرشن چندر بی۔ اے۔ تک یہیں رہے۔ مہندر ناتھ تو پیدا ہی یہیں ہوئے۔ میرے دوستوں میں آنند لہر جو کہ آج کے بہت عمدہ افسانہ نگار ہیں، ہم دونوں ہم جماعت تھے۔ ہماری جوڑی تھی کالج کے زمانے میں، آج بھی ہے۔ میں نے پنجابی میں شعر کہے اور میری تحریریں پنجابی کے اہم ادبی رسائل میں شائع ہوئیں۔ لیکن بعد میں پتہ نہیں کیسے یہ فیصلہ کیا کہ میں دونوں زبانوں میں شعر کہنا جاری نہیں رکھ سکتا اور میں نے پنجابی میں شعر کہنا ترک کر دیا اور پوری طرح اردو کا ہو کر رہ گیا۔ سب سے پہلے میری غزل "شاعر" میں شائع ہوئی۔ اعجاز صدیقی مرحوم اس کے مدیر تھے۔ اس وقت میں طالب علم تھا۔ اس کے بعد کا سارا منظر نامہ آپ کے سامنے ہے۔

جاوید انور: بیتاب صاحب، جب آپ کی تخلیق اپنے آپ کو منوا رہی تھی تو وہ وقت جدیدیت کے عروج اور ترقی پسندی کے زوال کا دور تھا۔ اور آپ کی شاعری جو علائم و استعارے اور کنایے وغیرہ سے بھری ہوئی ہے تو اس تبدیل ہوتے ہوئے رجحان کا بھی اثر تھا آپ کے تخلیقی شعور پر؟

پرتپال سنگھ بیتاب: میں آپ کو مزیدار بات بتاؤں کہ میں طالب علمی کے زمانے سے نظم، غزل اور نثری نظم کہتا ہوں۔ چھوٹے موٹے مشاعروں میں بھی جہاں رسائی ہو جاتی تھی، میں غزل کے علاوہ نظم بھی پڑھتا تھا۔ ایک دن آنند لہر صاحب میرے پاس "شب خون" لے کر آئے اور کہنے لگے کہ یار بیتاب! لگتا ہے کہ اس رسالے میں آپ کی نظمیں اور میرے افسانے چھپ جائیں گے۔ میں نے کہا یار یہ اتنا بڑا رسالہ ہے۔ یہ کہاں ہمیں اور آپ کو چھاپے گا۔ انھوں نے کہا مجھے پورا یقین ہے۔ تو ہم نے ڈرتے ڈرتے پانچ سات نظمیں اور آنند لہر نے اپنے افسانے بھیجے اور ان کو فاروقی صاحب نے شائع کیا اور ایک طویل خط لکھا۔ چند نکات بھی بتائے۔ تو عرض یہ کرنا ہے کہ ہر دور کی اپنی حسیت ہوتی ہے جسے ہم عصری حسیت کہتے ہیں۔ تو "شب خون" کو جب میں نے دیکھا بھی نہیں تھا تب سے میں نثری نظمیں کہہ رہا تھا۔ سجاد ظہیر کی نیلم کی وادی سے متعلق نظمیں جو نثری نظمیں تھیں، کسی طرح میرے ہاتھ آ گئیں اور میں سمجھتا ہوں کہ سجاد ظہیر جن کو ترقی پسند تحریک کا بانی کہا جاتا ہے، نثری نظم کا بانی بھی انھیں تسلیم کیا جانا چاہیے اردو میں۔ میراجی اور ن۔م۔ راشد کا دور اس کے بعد کا ہے۔ یہ نظمیں چالیس کی دہائی کی کہی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ گلزار کی مختصر کتاب "جانم" نے بھی مجھے بہت متاثر کیا۔ فرائڈ اور یونگ خاص کر فرائڈ نے خواب اور علامت کے تعلق سے جو نظریہ پیش کیا ہے، اس کا مجھ پر گہرا اثر ہے۔

جاوید انور: آپ کی ادبی تربیت میں اگر کسی خاص ادیب و شاعر کا کردار بہت اہم رہا ہو تو عرض کریں۔

پرتپال سنگھ بیتاب: جوش ملسیانی صاحب کے ایک شاگرد تھے مرحوم ساحر سیالکوٹی۔ تو غزل کی حد تک میں نے سات سال تک ان سے مشورۂ سخن کیا۔ زبان کی باریکیاں، عیوب و محاسن، متروکات وغیرہ کے معاملے میں استاد بہت

سخت تھے۔ اصل میں یہ داغ کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ جالندھر میں رہتے تھے۔ میں ان کو ڈاک سے بھی تخلیقات ارسال کرتا تھا اور وقتاً فوقتاً جایا بھی کرتا تھا ان سے ملاقات کو جموں سے۔ علامہ اخلاق دہلوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے ''فن شاعری'' وہ کتاب جتنی چھوٹی ہے، اتنی ہی مفید ہے۔ تقطیع کرنا اتنی آسانی کے ساتھ بتلایا ہے انھوں نے کہ کوئی نومسلم بھی ادب کا، تھوڑی کوشش کے بعد اس سے پوری طرح استفادہ کر سکتا ہے۔ تو یہ سب غزل کی حد تک ساحر سیالکوٹی صاحب کا عطیہ ہے۔ نظم کے تعلق سے میرے اوپر گرو گرنتھ صاحب کا بڑا اثر ہے۔ گرو گرنتھ صاحب میں اشعار ہی ہیں۔ بابا فرید شکر گنج، گرونانک دیو، رویداس، نامدیو، ان لوگوں کا کلام ہے گرو گرنتھ صاحب میں۔ تو یہ تو ہماری مذہبی کتاب ہے جسے ہم بار بار پڑھتے ہیں لیکن آپ یقین کریں کہ میں اس میں بھی بہت حد تک شاعری ہی دیکھتا تھا۔ تو کل ملا کر میری شعری تربیت میں ان تمام عناصر وعوامل کا دخل ہے۔

جاوید انور: آپ کی نظموں کی ایک بڑی پہچان، اس کا ارتکاز، ایجاز واختصار، تہہ داری اور جامعیت ہے۔ لیکن بعض نظمیں جو نسبتاً طویل ہیں، میں بیانیہ عناصر وضاحت وصراحت کی بنیاد پر اپنے اس مرتبے سے کچھ دوری اختیار کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ سوال آپ سے یہ ہے کہ اپنی مختلف نظموں میں بیانیہ کو برتنے کی کوئی منطقی ترتیب آپ کے ذہن میں رہتی ہے؟

پرتپال سنگھ بیتاب: شاعری کسی منطقی ترتیب کے تحت نہیں کی جاتی، تجربے اور مسلسل مشق سے کلام میں پختگی ضرور آتی ہے، مگر سچی شاعری کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ آپ نے شاعری کے جن عوامل کا ذکر کیا ہے وہ دراصل نقادوں کا خاصہ ہیں نہ کہ تخلیق کاروں کا۔ شاعر اپنے اندر کی بات کو شاعری کا جامہ پہناتا ہے۔ لیکن کوئی سچا شاعر اچھا شاعر تکنیکی سطح پر شاعری نہیں کرتا۔ شعری تخلیقات کے تکنیکی عوامل اور ان کے نکتے (جو شاعر کے یہاں فطری حیثیت رکھتے ہیں) ابھارنا نقاد کا کام ہوتا ہے۔ میری نظمیں میرے ان خیالات جذبات اور مضامین پر مشتمل ہیں جن کا میری غزلوں کے شعروں میں سماپانا شاید ممکن نہیں تھا۔ یا یوں کہیے کہ جن کے اظہار کے لیے میری حد تک غزل کا شعر نہیں بلکہ نظم کا پیرایہ ہی موزوں تھا۔ ایک شعر سنیے:

آدمی راستے بدلتا ہے
فلسفہ ساتھ ساتھ چلتا ہے

جاوید انور: آپ کی بعض کیا بیشتر نظموں میں بہترین افسانوں جن کی خصوصیت ارتکاز، ایجاز و اختصار تہہ داری اور جامعیت ہوتی ہے سے بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ تو جس نہج پر آپ کی نظموں میں قدر مشترق محسوس ہوتی ہیں، ان میں ہیئت کے علاوہ تفریق کے دوسرے ذرائع آپ کی نظر میں کیا ہیں؟

پرتپال سنگھ بیتاب: نظم دراصل کسی بنیادی خیال کے ارد گرد گھومتا ہوا ایک لفظی ڈھانچہ ہوتی ہے۔ یہ بنیادی خیال کبھی کسی فلسفیانہ بات، کبھی کسی علامتی یا استعاراتی پیکر کبھی کسی سیدھی سپاٹ تو کبھی کسی علامتی واقعاتی بات پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ میری نظموں میں کوئی بنیادی بات یا کوئی بنیادی خیال یا کوئی بنیادی واقعہ جس طرح اندر سے آتا ہے۔ اسی طرح میں اسے صفحۂ قرطاس پر اتار دیتا ہوں۔ کئی مرتبہ میری نظمیں میرے کسی خواب یا خواب میں رونما ہونے والے واقعہ پر مشتمل ہوتی ہیں، میں فرائیڈ کے اس نظریے سے اتفاق رکھتا ہوں کہ خواب میں نظر آنے والی اشیاء، واقعے

اور باتیں اپنے اندر علامتی معانی کی حامل ہوتی ہیں۔

جاوید انور: نئی نظموں کے حوالے سے یہ مفروضہ عام ہے کہ اس کی دنیا تخیلی اور جذباتی ہے جبکہ بیانیہ سے ٹھوس واقعیت اور زمینی جذبات کا تصور ابھرتا ہے۔ تو آپ اپنی نظموں کے حوالے سے بتائیں کہ جدید نظم کا صداقت اور ٹھوس واقعیت سے کتنا تعلق ہے اور ہو سکتا ہے؟

پرتپال سنگھ بیتاب: نئی نظم کیا شاعری کی کوئی صنف تخیل اور جذبات کے عمل دخل کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہ کوئی خواہ مخواہ کا مفروضہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ جدیدیت کے ابتدائی دور میں نظم کسی قدر ٹھوس واقعیت سے دور ہو گئی تھی لیکن بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ابھر کر سامنے آنے والی نئی نسل نے نظم میں جدید حسیت کے ساتھ ساتھ عصری حسیت کی بنا بھی ڈالی۔ یہیں سے جدیدیت کے بعد کی پہلی نئی نسل اپنا نیا سفر شروع کرتی ہے۔

جاوید انور: نظم کی زبان۔ جس کو ہم شعری زبان بھی کہہ سکتے ہیں، کی بڑائی اس کی جمالیات اور تاثیر میں ہے۔ اگر یہ نہیں تو موضوع کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو، نظم کی حیثیت ایک عام سطح سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ یعنی نظم کی ساخت واقعہ در واقعہ یا کڑی در کڑی یا ایک ہی واقعہ پر مرکوز ہوتی ہے۔ جس میں بیانیہ کا عنصر لازمی طور پر شامل ہوتا ہے۔ اگر ہم بیانیہ کے اس تفاعل کو (مکمل بیانیہ کو نہیں) الگ کر دیں تو نظم کا وجود باقی رہے گا۔ یعنی کیا نظم جو ہے، وہ اصل معنوں میں نظم رہے گی؟

پرتپال سنگھ بیتاب: نظم کوئی ایسی عمارت نہیں ہوتی جس کی کسی ایک دیوار سے کوئی مخصوص اینٹ نکال لی جائے تو وہ ڈھے ڈھیری ہو جائے گی۔ نظم میں، شاعری میں کوئی ریاضی اصول کوئی فارمولا کوئی Hypothesis نہیں چلتا۔ شعریت کے عوامل کچھ بھی ہو سکتے ہیں اور شعریت کسی بھی مخصوص عنصر کے بغیر مکمل ہو سکتی ہے۔ ہمارے ہاں نقادوں نے نظم یا شعریت کو بھی تنقید جیسی کوئی تکنیکی چیز بنا دینے کی بہت کوششیں کی ہیں، خدا کا شکر ہے کہ شعریت ابھی تک ان فارمولوں سے بچی ہوئی ہے۔ نظم کی فطری اصلیت کو شاعر ہی سمجھ سکتا ہے یا وہ نقاد جو خود بھی شاعر ہو۔

جاوید انور: نظم کی معروضی حیثیت کا تعین آپ کس طرح کریں گے یا کرتے ہیں؟ کیا اس کی فہم کے لیے معنی کے متن کے خود یافتہ معنی ہی کافی ہوں گے یا ہیں یا سوانحی یا اخلاقی اور تاریخی حوالے کی مدد بھی کسی قدر ضروری ہے؟

پرتپال سنگھ بیتاب: ایک شاعر تخلیق کے عمل میں کسی مخصوص شے سے صرف نظر کرتا ہے نہ کسی مخصوص شے کو ملحوظ رکھتا ہے۔ شعریت ایک فطری عمل ہے۔ اس میں مخصوص عوامل و عناصر کی شمولیت یا غیر موجودگی فطری اور لاشعوری ہوتی ہے نہ کہ شعوری۔ میری نظموں میں عصری اثرات بھی فطری اور لاشعوری سطح پر در آتے ہیں۔ اگر ہم کسی مخصوص نظریے یا فلسفے کے زیر اثر ان عناصر کو نظم میں در آنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں تو گویا اپنی نظم کو Corrupt کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جاوید انور: جمیل جالبی صاحب اور دیگر چند سنجیدہ ناقدین کا خیال ہے کہ چونکہ موجودہ دور کے ہنگامے اس بات کی مہلت نہیں دیتے کہ شاعری پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ اس لیے آج کے شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ قاری کی اہمیت کو دل سے مانے اور انٹلکچول (Intellectual) اور ڈل (Dull) شاعری سے گریز کرے۔

لیکن معاملہ کافی حد تک اس کے برعکس ہے۔ انٹلکچول اور ڈل شاعری زیادہ ہو رہی ہے اور قاری جنھیں ہم خاص طور سے عام قاری سے تعبیر کرتے ہیں، اس قسم کی شاعری کی ہی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ آپ کی نظر میں اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

پرتپال سنگھ بیتاب: قاری یا سامع کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرتا، لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ موجودہ دور کے ہنگامے اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ شاعری پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ جو لوگ شاعری پر سنجیدگی سے غور نہیں کر سکتے انہیں شاعری پڑھنے یا سننے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ فلمی نغمے ہیں نا؟ مغربی موسیقی ہے۔ لچر قسم کا ناچ گانا ہے، یہ سب سنجیدگی سے غور کیے بغیر بھی ممکن ہے۔ بھیا اچھی شاعری تو سنجیدگی سے غور کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ دانش ورانہ افہام و تفہیم کا تقاضا کرتی ہے۔ ایسا ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ آنے والے ادوار میں بھی ہوتا رہے گا، اور پھر شاعر کو بھی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے اندر کی بات بغیر کسی لاگ لپیٹ کے باہر لا سکے۔ شاعر بے چارے کی حالت پہلے ہی بقول میر ایسی ہوتی ہے کہ:

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
رنج و غم جمع کیے لاکھ تو دیوان کیا

جاوید انور: آپ نے اپنی نظموں کی تخلیق میں اپنے قارئین کا بھی خیال رکھا ہے؟ مثلاً نظم کا قاری، بہت اعلیٰ ذہن کا بھی ہو سکتا ہے اور سطحی ذہن کا بھی۔

پرتپال سنگھ بیتاب: اصل میں تخلیقات جتنی مشکل سے صفحۂ قرطاس پر آتی ہیں، اس سے زیادہ سنجیدگی اور عرق ریزی کا اپنے قارئین سے تقاضا کرتی ہیں۔ جب تک قاری کسی بھی فن پارے کے کم از کم کسی ایک پہلو کی تہہ تک نہ پہنچ جائے، وہ مطالعے کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اور یہی معاملہ ناقدین کا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری بیش تر تنقیدی اثاثہ چوں چوں کا مربہ بن کے رہ گئی ہے۔ دوسری بات اعلیٰ اور ادنیٰ قاری کی ذہنی سطح کی۔ تو میرے خیال میں اس طرح کی کوئی حد فاصل مقرر نہیں کی جا سکتی ہے کہ فلاں تخلیق اعلیٰ ذہن کے لیے اور فلاں تخلیق ادنیٰ ذہن کے لیے۔ آپ چاہیں تو اسے شاعر کی مجبوری بھی کہہ سکتے ہیں۔

جاوید انور: اچھی نظمیہ شاعری کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاعری کی سماجی افادیت بھی ہوتی ہے۔ لیکن خود شاعر کے لیے اس کی اپنی شاعری میں کوئی سماجی افادیت نہیں ہونی چاہیے۔ کیا شاعر پر اس قسم کا کوئی حکم مسلط کرنا مناسب ہے؟

پرتپال سنگھ بیتاب: شاعر پر کسی قسم کا کوئی حکم مسلط نہیں کیا جانا چاہیے، کسی طائر کے بال و پر باندھ کے یا اس کے پاؤں میں زنجیر پہنا کر آپ اس سے امید کریں کہ وہ آسمان در آسمان اڑان بھرے، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اقبال نے شاید ایسے ہی کسی موقع پر سوچا ہوگا:

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

شاعری کی سماجی افادیت سے متعلق متعدد بحثیں ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ میرا تو خیال ہے کہ شاعری جیسی بھی ہو

اس کی کچھ نہ کچھ سماجی افادیت ضرور ہوتی ہے۔ ہر قسم کی شاعری سماج کے کسی نہ کسی طبقے کی تسکین کا باعث ضرور بنتی ہے، تسکین بجائے خود افادیت کے دائرے میں آجاتی ہے۔

جاوید انور: نظم کی شاعری میں پیکروں (Images) کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ یعنی کہ شاعر اپنے داخلی یا خارجی مظاہر کی ایسی تصویر پیش کرے جو زندگی کے رنگ، جذبہ اور تاثیر کے ساتھ ساتھ اصل تصویر سے زیادہ واضح، زیادہ اثر کرنے والی اور زیادہ خوبصورت ہو۔ اس سلسلے میں استعارہ کے بغیر تو ایک قدم بھی نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اگر کسی نظم میں استعارہ کا اہتمام بالارادہ نہ کیا جائے تو کیا وہ نظم اپنی معنویت برقرار رکھ پائے گی؟

پرتپال سنگھ بیتاب: بالارادہ اہتمام استعارہ کا ہونا چاہیے نہ علامت کا نہ اساطیری یا کسی دوسرے پیکر کا رشاعری رسوئی میں پکائی جانے والی کوئی ہانڈی نہیں ہے جس کے لیے بالارادہ مخصوص قسم کا اہتمام کیا جائے۔ شاعر اپنے تخلیقی عمل سے باخبر تو ہوتا ہے لیکن کسی خاص قسم کے اہتمام کے ساتھ شاعری نہیں کرتا، جیسی کسی شاعر کو اللہ کی طرف سے توفیق عطا ہوتی ہے ویسی ہی وہ شعری تصویر پیش کرتا ہے۔

جاوید انور: کیا ہم کسی ایسی نظم جس کے ٹکڑوں کو ملا دینے بھر سے کوئی نثری تحریر وجود میں آجائے اس کو اصل معنوں میں نظم تسلیم کر سکتے ہیں؟

پرتپال سنگھ بیتاب: کوئی نظم اصل معنوں میں نظم ہے یا نہیں اس بات کا فیصلہ کسی نظم کو (Prima Facia) دیکھنے پر ہی کیا جا سکتا ہے، کوئی نثری نظم بھی بہترین نظموں میں شامل کی جا سکتی ہے اور کوئی پابند نظم بھی تیسرے چوتھے پانچویں یا نچلے سے نچلے درجے کی ہو سکتی ہے۔ غزل کا جادو جب تک ہم اردو والوں کو اپنی قید سے رہائی نہیں بخشے گا ہمارے ہاں نظم کا مزاج ہی پیدا نہیں ہو سکے گا۔ جب بھی ایسا ہو گیا ان سوالوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہ جائے گی۔

جاوید انور: آپ کی نظمیہ شاعری میں بلاغت کو ناپنے کا کوئی پیمانہ وضع کیا جا سکتا ہے؟ مثلاً بلاغت کے کس Scale پر آپ یا آپ کا قاری یہ کہنے کا حقدار ہو سکتا ہے کہ فلاں نظم بلاغت کی بنیاد پر اول درجے یا دوم درجے کی قدر کی حامل ہے؟

پرتپال سنگھ بیتاب: میں اس مفروضے کو ہی سرے سے خارج کرتا ہوں۔ الگ الگ قسم کے قاری نظم کو (یا شاعری کو) اپنے اپنے انداز سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نظم کا ہر قاری بلاغت کے اپنے پیمانے رکھتا ہے جو اس کے اپنے مزاج سے میل کھاتے ہیں کسی کے لیے کوئی خاص نظم زیادہ بلیغ ہوتی ہے تو کسی کے لیے کم، میری نظموں سے متعلق مجھے جو آرا موصول ہوتی رہتی ہیں (کم سے کم) ان آرا کی حد تک تو یہ بات بالکل صحیح ہے۔

جاوید انور: کیا ہم کسی نظم کی دو اکائیوں میں بلاغت کی سطح پر مماثلت یا مغائرت کا تعین کر سکتے ہیں؟

پرتپال سنگھ بیتاب: یہ نقادوں کے گورکھ دھندے ہیں، بے چارہ شاعر کیا جانے؟

جاوید انور: کیا ہم کسی نظم میں بلاغت کی یکساں قدر و قیمت کا تعین کر سکتے ہیں مثلاً علامت یا استعارہ شعر کی بلاغت میں اضافہ کرتا ہے۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی نظم میں جس میں علامت یا استعارہ کا اہتمام ہو وہ بلیغ ہی ہوگی۔ جس میں وزن کی یکسانیت پائی جائے۔ اس میں بلاغت کی نوعیت بھی یکساں ہوگی؟

پرتپال سنگھ بیتاب: علامت، استعارہ، اشارہ، کنایہ، شاعری کی بلاغت میں بے شک اضافہ کرتے ہیں، لیکن

علامت یا استعارے کے بغیر شاعری میں بلاغت ممکن ہی نہیں، میں ایسا بھی نہیں مانتا۔ وزن کا معاملہ یہ ہے کہ طبیعت اگر موزوں ہے تو غزل کا شعر اپنی بھرپور موزونیت کے ساتھ شاعر پر نازل ہوتا ہے، نظم میں البتہ معاملہ دوسرا ہے۔ خاص طور سے نئی نظم میں کئی بار بحر و وزن کے لوازمات کو پورا کرنے کے لیے تقدیم و تاخیر، زوایر، نوک پلک سنوارنے وغیرہ کے نام پر تصنع کا سہارا شاعر کو لینا پڑتا ہے، نظم کا، پابند نظم سے معرا آزاد اور پھر نثری نظم کا سفر اسی امر کا مرہون منت ہے۔ آج کی نئی نثری نظم میں شاعر اپنی بات صاف ستھری، سیدھی سادی حشو وزوایدو تقدیم و تاخیر سے پاک زبان میں کہہ دیتا ہے۔

جاوید انور: جدید نظمیہ شاعری میں بلاغت، بیان، بدیع، عروض اور ایسے ہی دیگر ذرائع کی کیا اہمیت ہے؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ جس کلام میں تشبیہ یا وزن یا قافیہ نہ ہوگا اس کے بلیغ ہونے کا کوئی امکان نہیں؟

پرتپال سنگھ بیتاب: آپ میرے تازہ مجموعہ ''نظم اکیسویں صدی'' کا مطالعہ کریں۔ اس میں میرے نظمیہ سفر کے تدریج ارتقاء کا سلسلہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ پہلی نظموں میں عروض وغیرہ کا پورا اہتمام دکھائی دیتا ہے۔ پھر عبوری نوعیت کی نظمیں ہیں اور پھر مکمل نثری نظم ہے۔ آہنگ کا احساس تمام نظموں میں رہتا ہے، بلاغت بدیع وغیرہ کے بارے میں فیصلہ آپ خود کرلیں۔ میرے خیال میں نئی نظم کا ارتقاء آپ کو ''نظم اکیسویں صدی'' میں مل جائے گا۔

جاوید انور: سہل ممتنع جو نظمیہ شاعری کیا کسی بھی فن پارے میں بلاغت کی ایک اصطلاح تصور کی جاتی ہے اور اس کے لغوی معنی یہ ہیں کہ بیان و بدیع کے استعمال کے بغیر بھی کلام میں بلاغت کی اعلیٰ بنیاد قائم ہوسکتی ہے۔ نظمیہ شاعری میں ایسا کن بنیادوں پر کہا جاسکتا ہے؟

پرتپال سنگھ بیتاب: میری غزلوں کے متعدد اشعار کے بارے میں کئی لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ سہل ممتنع کے دائرے میں آتے ہیں، حالانکہ میری نظموں کے بارے میں ایسی کوئی آراء سامنے نہیں آئی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میری بہت سی نظمیں بھی سہل ممتنع کے دائرے میں آتی ہیں۔ ہمارے نقادوں کو چاہیے کہ وہ نئی نظم کو کھلے دل سے قبول کریں۔ صرف اور صرف اسی صورت میں نئی نظم کا مکمل احاطہ ممکن ہے۔

جاوید انور: جدید نظمیہ شاعری کے تعلق سے اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح اس کے موضوع کا زیادہ تر تصورات پر دار و مدار ہوتا ہے اسی طرح مرتبۂ کلام میں بھی ایک تصور ہے۔ جس کلام میں دوسروں تک پہنچنے کی جتنی صلاحیت ہوگی وہ اتنا ہی بلیغ ہوگا۔ کیا اس طرح اس کا رشتہ سیدھے سیدھے Eshtablishment سے نہیں جڑ جاتا؟

پرتپال سنگھ بیتاب: میں یہ نہیں مانتا کہ جس کلام میں دوسروں تک پہنچنے کی جس قدر صلاحیت ہوگی وہ اتنا ہی بلیغ ہوگا۔ میرے خیال میں بلاغت ہر قاری یا سامع کی اپنی صلاحیت اور شعر فہمی کی مرہون منت ہے۔ الگ الگ نظمیں الگ الگ قاری پر الگ الگ درجۂ بلاغت کے ساتھ نزول کرتی ہیں۔ اگر ہم فلسفے کے مطالعے کے لیے ذہن و دل کی صلاحیتوں کا استعمال کرسکتے ہیں۔ اگر ہم گیتا گرنتھ وید پوران کو سمجھنے کے لیے اپنے مطالعے کا کینوس وسیع سے وسیع تر کر سکتے ہیں تو شعر فہمی میں ایسا کرنے سے گریز کیوں؟ Establishment سے تو شاعری کو جڑنا ہی نہیں چاہیے۔ شعریت تو فقر کا نام ہے۔ آزادی کا نام ہے۔ بے باکی کا نام ہے۔ باغیانہ پن کا نام ہے۔ ایک شعر سنیے:

آلام کی زد میں ہے مگر شاد بہت ہے

جاوید انور: آپ نے اپنی نظموں میں جن الفاظ کا استعمال کیا ہے ان میں بیش تر کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ روایتی اور مروجہ الفاظ، اصطلاحات اور محاورے سے یکسر مختلف ہیں اور ان کی اہمیت و افادیت آپ کی نظمیہ شاعری میں زیادہ کھل کر سامنے آئی ہے۔ تو آپ ان الفاظ کو بلاغت کے کس دائرۂ کار سے منسلک کریں گے؟

پرتپال سنگھ بیتاب: میری شاعری کے ابتدائی دور میں طبیعت میں ایک باغیانہ پن تھا ہر روایت اور روایت سے متعلق ہر چیز سے گویا کوفت ہوتی تھی۔ کچھ نیا کچھ الگ کرنے کی دھن رہتی تھی، نئے لفظ، نئی بات، نئی زبان، نئی علامت، نیا استعارہ، نیا خیال، نیا محاورہ، نئی اصطلاح کا جنون تھا۔ بلاغت کی یا فصاحت کی فکر کسے تھی؟ روایت سے احتراز کا ایک پاگل پن تھا۔ یہ تو بہت دیر بعد معلوم ہوا کہ خود ہمارا اور ہماری شاعری کا تعلق ایک روایت سے ہے، جس کا نام جدیدیت ہے۔

آج ایک عمر گذر جانے پر محسوس ہو رہا ہے جیسے میں خود کوئی روایت ہو کے رہ گیا ہوں اور آنے والی نئی نسلیں بھی روایت سے منسوب ہر چیز سے گریزپا ہیں۔

جاوید انور: آپ نے اپنی نظموں میں الفاظ و اصطلاحات کے سلسلے میں مستند اہل زبان کی پیروی نہیں کی۔ اس کی کیا وجوہات ہیں؟

پرتپال سنگھ بیتاب: کسی حد تک اس سوال کا جواب پچھلے سوال کے جواب میں آ چکا ہے۔ میں ریاست جموں و کشمیر کے علاقہ پونچھ سے تعلق رکھتا ہوں۔ بے شک اس علاقے کا تعلق اردو زبان و ادب سے بہت گہرا رہا ہے لیکن پھر بھی یہ وہ علاقہ نہیں جہاں نام نہاد اہل زبان رہتے ہوں، حالانکہ ریاست جموں و کشمیر ہندوستان کی واحد ریاست ہے جہاں کے ہندو راجاؤں نے ایک زمانے میں یہاں کی سرکاری زبان اردو قائم کی تھی جو آج تک قائم ہے۔ اردو ہماری ریاست کے تینوں خطوں یعنی جموں، کشمیر اور لداخ کے درمیان رابطے کی زبان ہے۔ اس طرح سے اردو ریاست میں Ligua franca کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر بھی ہم لوگ اہل زبان نہیں کہلاتے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آخر یہ اہل زبان ہے کس مخلوق کا نام؟ کیا یہ وہ لوگ، میں جو پیلی بھیت، بریلی کے آس پاس رہتے ہیں اور تماشا کو تماسا اور شاید کو ساید کہتے ہیں؟ یا یہ رام پور مراد آباد کے وہ مسلمان دوکاندار ہیں جن کی دوکانوں پر بورڈ دیوناگری لپی میں لکھے ہوئے ہیں۔ میں نے رام پور وغیرہ علاقوں کی کئی دیواروں پر دیوناگری کے بہت بڑے بڑے حروف میں "الحاج حکیم........." لکھا ہوا دیکھا ہے، یوپی بہار کے کئی ایک مسلم گھرانوں میں میں نے بھوجپوری، سینتھالی، میتھلی وغیرہ زبانوں کا چلن دیکھا ہے۔

جاوید انور: آپ کی بیش تر نظموں میں اہل زبان اور اعلیٰ درجات کے پارکھ ہونے کے پختہ ثبوت تو ملتے ہیں لیکن بہت کم عام پڑھنے والوں کے ذہن و وجدان کا خیال رکھا گیا ہے۔ کیا آپ اعلیٰ معیاری ادبی سطح پر عمومی ذہنوں کے حقوق کو تسلیم نہیں کرتے؟

پرتپال سنگھ بیتاب: عام پڑھنے والوں سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟ میرے خیال میں ادب کو پڑھنے والا ہر شخص ادب کا عام قاری ہے۔ ادب پڑھنے والے خواص تو نقاد ان و محققان ہوتے ہیں۔ میری نظموں میں اشارے، کنائے،

علامت استعارے، اساطیر وغیرہ کا عمل دخل تو ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ غیر محقق یا غیر نقاد قاری میری نظموں کو اپنے ذہن و وجدان سے پرے کی کوئی چیز سمجھتا ہے۔ ادب کی تفہیم میں دانش کا تھوڑا بہت عنصر تو لازمی ہے۔ ادب کے عام قاری کو معمولی ذہن کا قاری کہنا اس کی توہین کرنے کے مترادف ہے۔

جاوید انور: آپ نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے صنف نظم کو ہی کیوں چنا؟ آپ دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کر سکتے تھے؟

پرتپال سنگھ بیتاب: میں شروع سے نظم کے ساتھ ساتھ غزل بھی کہتا رہا ہوں "پیش خیمہ" "سراب در سراب" اور "خود رنگ" میرے ایسے مجموعے ہیں جن میں غزل اور نظم ہر دو اصناف موجود ہیں۔ اس کے علاوہ "موج ریگ" میری غزلوں کا مجموعہ ہے جس کے لیے Central Institute of Indian Language Mysore نے سال ۰۵-۲۰۰۴ء کے "بھاشا بھارتی سمان" سے مجھے نوازا ہے۔ "نظم اکیسویں صدی" البتہ میری نظموں کا انتخاب ہے۔

جاوید انور: آپ نے اردو نظمیہ شاعری کی اس قدر خدمت کی ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے اردو ادب کا حق ادا کر دیا ہے؟

پرتپال سنگھ بیتاب: "نظم اکیسویں صدی" کو ترتیب دیتے وقت میں سوچا کرتا تھا کہ میرے لیے "نظم اکیسویں صدی" سے آگے شاید کچھ نہیں ہے۔ لیکن "نظم اکیسویں صدی" ابھی اشاعت کے مراحل سے گذر رہی تھی جب میری نئی نظموں میں ایک بنیادی تبدیلی رونما ہونے لگی۔ پہلے سے بالکل الگ قسم کی نظمیں معرضِ وجود میں آنے لگیں۔ یہ نظمیں جب کتابی صورت میں منظر عام پر آئیں گی تو میرے نظمیہ سفر کا ایک بالکل نیا رنگ، نیا مرحلہ، نیا پہلو پیش کریں گی۔ "نقطۂ نو گریز" کے نام سے یہ نظمیں زیر ترتیب ہیں۔

جاوید انور: بیتاب صاحب، ہماری نظم کا جو روایتی سلسلہ ہے نذیر اکبر آبادی سے ہوتا ہوا میرا جی، ن۔م۔ راشد، اختر الایمان وغیرہ کے بعد تک کا۔ ان کے معیار کو دیکھتے ہوئے آج جو نظم کی بیش تر شاعری ہو رہی ہے، اس سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

پرتپال سنگھ بیتاب: دیکھئے آج جو بھی شاعری ہو رہی ہے، اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو جدیدیت کے دور میں نظم کہہ رہے تھے، اس کے بعد کہہ رہے تھے اور نئی نسل والے بھی۔ تو ان سب کو دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے نئے لکھنے والے کی ایک بہت اچھی پود ہمارے سامنے آ رہی ہے۔ میرا تو تجربہ یہ ہے کہ ہم میں جو سب سے زیادہ نئے لکھنے والے ہیں، وہی سب سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ اس لیے کہ ان کے پاس جتنا روایت سے لے کر اب تک کا ادبی اثاثہ موجود ہے، ہمارے پاس نہیں تھا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ اردو شاعری کا بہترین حصہ اکیسویں صدی میں تخلیق کیا جائے گا کیونکہ آنے والی صدی میں ہر طرح کی تکنیک اور علمیت ہے جو نئی نسل اپنے ساتھ لے کر آ رہی ہے۔ تو جب وہ ان سب کو اپنے ذہن میں رکھ کر کہتے ہیں تو ہم سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ تو میرا ایسا خیال ہے کہ آنے والے دور میں ہو سکتا ہے کہ اپنی پیچیدگی کے باعث ہر بات غزل کے شعر میں نہ سما سکے، غزل کا شعر تنگ ہو جائے۔ جن کے یہاں موزونیت ہوگی، بڑی شاعری ہوگی، ان کے یہاں غزل میں بھی آجائے گا۔ لیکن عام معاملہ وہی ہوگا کہ نظمیں زیادہ ہوں گی معیار کے اعتبار سے غزل کی نسبت۔ اور آنے والی نسلیں ہم سے زیادہ سمجھ دار ہوں گی نظم کہنے اور سمجھنے

میں۔ تو میں نئی نسل سے بہت پر امید ہوں۔

جاوید انور: آخری سوال بیتاب صاحب۔ آپ نو واردان ادب کو جو کہ نظمیہ شاعری میں طبع آزمائی کر رہے ہیں بہترین نظمیہ شاعری کی ضمن میں کچھ مشورہ دینا چاہیں گے۔

پرتپال سنگھ بیتاب: آگے آنے والی نسلیں تعلیم یافتہ، عقل مند، ہوشیار اور وسیع تر مطالعے کی حامل ہوں گی۔ ان کا ادب سائنسی عہد کا ادب ہوگا۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ پیش رفت ضروری ہے مگر اردو کی روایت یعنی غالب و میر و مومن و ذوق و داغ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ زبان و ادب کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے ان اساتذہ کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

جاوید انور: بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔

پرتھپال سنگھ بیتاب

جموں

جسم لباس اور میں

جب جسم میں دم تھا
لباس کیسا ہے
یہ فکر ہی نہ تھی
جسم کا اپنا مزاج تھا
ایک نخرہ تھا
مست ہاتھی کی سی چال تھی
اب جسم لاغر ہے
بڑھیا سے بڑھیا
نئے سے نئے انداز کے
شوخ سے شوخ رنگوں کے
خوبصورت لباس میں
جسم کو سجا کر نکلتا ہوں
لباس کی مدد سے
وہی انداز وہی مزاج
وہی دم خم
جسم میں پیدا کرنے کی کوشش میں رہتا ہوں
سامنے والوں کی نظر پر
نظر رکھتا ہوں
کہ ان کا دھیان
میرے لباس پر مرکوز رہے
میرے جسم پر نہیں
جو میرے لباس کے اندر پوشیدہ ہے

میم صاحب کا کتا

بڑی حویلی والی میم صاحب کا
کتا بڑا خوبصورت ہے
جو بھی دیکھے فدا ہو جائے
میم صاحب اس کے گلے میں
خوبصورت پٹہ باندھ کر رکھتی ہیں
جب بھی باہر جاتی ہیں
پٹے میں مضبوط زنجیر باندھ کر
اسے ساتھ لے جاتی ہیں
زنجیر کو اپنے ہاتھوں میں
اس طرح کس کر رکھتی ہیں
کہ وہ راہ چلتے ہوئے
ادھر ادھر منہ نہ مار سکے
لیکن میم صاحب کا کتا جو بہت خوبصورت ہے
موقع پا کر ادھر ادھر
منہ مار ہی لیتا ہے
میم صاحب اس کی اس بری عادت سے بخوبی واقف ہیں
پھر بھی وہ زنجیر کو حسب عادت
کس کر پکڑے رکھتی ہیں / اور ہر ممکن کوشش کرتی ہیں
کہ راہ چلتے ہوئے وہ
ادھر ادھر بالکل منہ نہ مارے
لیکن کتا / بڑی حویلی والی میم صاحب کا کتا
جو بہت خوبصورت ہے
گلے میں بندھی ہوئی
کس کر پکڑی ہوئی زنجیر کے باوجود
موقع پا کر
ادھر ادھر منہ مار ہی لیتا ہے

خواب جواں خواب

جسم لاغر ہو چکا تھا
خواب مگر جوان تھے
میں بستر مرگ پر منتقل ہو گیا
خواب بدستور جوان تھے
میں انتقال کر گیا
خواب جوان کے جوان رہے
زندہ و جاوید رہے
جسم چتا میں جل گیا
خواب جو ابھی جوان تھے راکھ میں مل گئے
میری راکھ دریا میں بہا دی گئی
خواب جواں خواب
راکھ کے ساتھ بہہ کر
بکھر گئے
پانی میں ہوا میں
بنجر اور زرخیز زمینوں میں
سمندر میں
سمندر سے اٹھتے ہوئے بخارات میں
میدانوں میں برستی ہوئی بارش میں
پہاڑوں پر گرنے والی
اور گر کر جمنے والی برف میں
اور پھر برف کے پگھلنے پر
معرض وجود میں آنے والے
جھرنوں میں آبشاروں میں
دھرتی کا سینہ چیر کر
پھوٹ نکلنے والے چشموں میں

اب میں مہاجر نہیں ہوں

گردش کے تھپیڑوں
مسلسل ٹھوکروں لغزشوں کے درمیاں
اس بات کا ہوش ہی کہاں تھا
یہ تو میں اک ذرا تھک کر
ستانے بیٹھا تو یاد آیا
کہ میں اپنے اصل سے اکھڑ کر
اپنی زمین سے اجڑ کر
یہاں وہاں کہاں کہاں بھٹک رہا ہوں
لیکن پھر کچھ دیر کے بعد خیال آیا
کہ یہ میرا سفر میری زندگی میرا سب کچھ
اب میں اسی کا ہوں
فقط اسی کا
اب یہی میرا اصل ہے یہی میری نسل ہے
یہی میری جڑ ہے یہی میری زمین ہے
اب میں ایک یاد کے ساتھ کہاں تک جیوں گا
اب میں زندگی کے ساتھ جیوں گا
بھرپور جیوں گا

پانی کو غصہ کیوں آتا ہے

دور دور پھیلے ہوئے جزیروں کو
ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے کے لیے
ہم نے مٹی ڈال ڈال کر
پانی کو اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور کر کے
اپنے لیے زمین تیار کر لی
پانی جو اپنی جگہ چھوڑ کر
دوسری جگہوں میں سمانے کی کوشش میں ہے
کبھی کبھار وہاں سے واپس دھکیلے جانے پر
اپنی پہلے والی جگہ کی طرف
واپس ٹھاٹھ مارتا ہے
کبھی موج و تلاطم کبھی سونامی
کبھی دیر دیر تک نہ ختم ہونے والی
بارش کی صورت میں
دیکھا جائے
تو پانی کا غصہ بھی جائز ہے

من بیراگ بھیا

مائی ری
میرا اجاڑوں کی طرف
جانے کو جی چاہتا ہے
میں جانتا ہوں
اردو کی اٹھتیس حرفی
اور پنجابی کی پینتیس اکھری
یہیں ہے بستی میں
مائی ری میں یہ بھی جانتا ہوں
کہ وہاں اجاڑوں میں کچھ بھی نہیں
سوائے ریت کے ٹیلوں کے
سوائے کیکر ببول اور کنٹیلی تھوہر کے
مائی ری پھر بھی مجھے لگتا ہے
جیسے وہاں اجاڑوں میں
کوئی نیا حرف کوئی نیا الف
میرے انتظار میں ہے
مائی ری مائی
اب میرا یہاں
دل نہیں لگتا

احساس اور احساس کے درمیان

آسمان میں رہتا تھا
آسمانی کام کرتا تھا
زمین اور زمینی کاموں کو تو / میں ہیچ سمجھتا تھا
کبھی کبھار کسی خاص کام کے لیے
مجھے زمین کے نزدیک آنا بھی پڑتا
تو زیادہ سے زیادہ / میں اونچی اونچی عمارات کے
اوپر اوپر سے ہی گذر جاتا
ایک دن اچانک، مجھے احساس ہوا
کہ دراصل میں خاکی ہوں
اور اپنے آسمانی روزمرہ کی وجہ سے
اپنی فطری اور زمینی ضروریات سے
محروم رہا ہوں / پھر مجھے یہ بھی احساس ہوا
کہ میں اب بھی ایک آم آدمی کی زندگی گذار سکتا ہوں
اگر میں زمین پر اتر آؤں
لہٰذا میں نے آسمانی زندگی چھوڑ کر
ایک آم زمینی زندگی بسر کرنا شروع کر دی
لیکن ایک بار پھر مجھے احساس ہوا
کہ مسلسل آسمانی سفر کے دوران
دراصل میں اپنی بیش تر زمینی قوتیں کھو چکا ہوں
یا شاید بھول چکا ہوں / ادھر کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں
واپس آسمان کو لوٹ جاؤں
لیکن پھر سوچتا ہوں / کہیں ایسا نہ ہو
کہ اب آسمان کو لوٹ جاؤں
اور وہاں جا کے معلوم ہو
کہ ایک عرصہ زمین پر رہنے کی وجہ سے
میں اپنی آسمانی قوتیں بھی کھو چکا ہوں
یا شاید بھول چکا ہوں

یہ میں اور یہ میرا دھیان

جب تم میرے حق میں
سزائے موت کا حکم سنا رہے تھے
میرا دھیان کہیں اور تھا
جب تمہارے حکم سے
مجھے پھانسی دی جا رہی تھی
میرا دھیان اس وقت بھی کہیں اور تھا
آج ایک دنیا کے باشندے
بلکہ کئی دنیاؤں کے باشندے
میرے پاس آ کر
تمہارے خلاف بہت کچھ کہتے ہیں
خاص طور سے یہ
کہ تم نے مجھے سزائے موت دے کر
بہت بڑی غلطی کی ہے بلکہ گناہ کیا ہے
لیکن تمہارے خلاف ان تمام باتوں کے درمیان
میرا دھیان کہیں اور ہوتا ہے
یہ میرا دھیان اور یہ میں
ہم دونوں ایسے ہی ہیں

ڈاکٹر زبیر فاروق اردو کے پہلے صاحب دیوان عرب شاعر تو ہیں ہی انہوں نے انگریزی میں بھی ردیف اور قافیے کے ساتھ غزلیں کہی ہیں۔ اس کے علاوہ طنزیہ اور مزاحیہ صنف میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی انہی ادبی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک اردو غزل، ایک انگریزی غزل اور ایک طنزیہ، مزاحیہ نظم ایک ساتھ شائع کی جا رہی ہیں۔ (جاوید انور)

ڈاکٹر زبیر فاروق

(دبئی)

غزل

ہر لفظ ہی روتا تھا تحریر کے اندر سے
دل ایک دھڑکتا تھا تصویر کے اندر سے
اک درد تھا ماضی کا ہر ایک طرف پھیلا
یہ کون تھا جو بولا تعمیر کے اندر سے
مظلوم کی چیخوں نے راتوں کو جگا رکھا
فریاد نکل آئی زنجیر کے اندز سے
اک خوف کا پہرہ تھا ہر ایک کے ہونٹوں پہ
لاوا سا ابل آیا تقریر کے اندر سے
فاروق ہے لرزاں کیوں ہر عضو تن قاتل
یہ کیسی صدا آئی شمشیر کے اندر سے

Ghazal

How could I ever even think of deceiving you
I could not ever even dream of leaving you
My mind would be distrustful of you at times
But my hearts always been their beleaving you
I couldn't atten you till even my last breath
I spent but my whole life retrieving you
whilst together I didn't ever know you worth
Then why am I know forever been grieving you
My only ever accomplishment in my life Farooq
Were the moments in life I have had achieving you

بن بلائے مہمان اور میزبان میں مقالمہ

(اندھیری رات میں مسلح چور آنگن میں کود جاتا ہے اور گھر کے مالک کی کنپٹی پر پسٹل رکھ دیتا ہے۔ اس کے بعد کا مقالمہ ملاحظہ فرمائیں)

مہمان (چور)

پسٹل موت کا جادہ ہے
تیرا کیا ارادہ ہے

میزبان

مانگو جو بھی چاہتے ہو
میرا ظرف کشادہ ہے

(چور ادھر ادھر تلاشی لیتا ہے)

میزبان

زر تو میرے پاس نہیں
میرا گھر تو سادہ ہے
سونا مجھ پر قرض رہا
تجھ سے میرا وعدہ ہے

(چور بچھی ہوئی چادر لے جانے کی کوشش کرتا ہے)

میزبان

اس چادر کو رہنے دو
یہ تو میرا لبادہ ہے

(چور تصویروں کو دیکھتا ہے کہ کوئی مونا لیسا وغیرہ کی طرح قیمتی تصویر مل جائے)

میزبان

یہ تصویر بھی رہنے دو
یہ تو میرا دادا ہے
لے دے کر یہ پونجی ہے
یہ دو بوتل بادہ ہے
لو کچھ غم بھی لے جاؤ
میرے پاس یہ زیادہ ہے
تجھ کو چھوکر دیکھوں تو
تو نر ہے کہ مادہ ہے

(چور ادھر ادھر دیکھتا ہوا مایوسی سے جانے لگتا ہے)

میزبان

پھر آنا کہ خدمت ہو
یہ خادم آمادہ ہے

(چور کے مایوس چلے جانے کے بعد میزبان مسکراتے ہوئے کہتا ہے)

دیکھنے میں ڈاکٹر فاروق
کتنا سیدھا سادہ ہے

کرشن کمار طور
دھرمشالہ

غزل

سراغ راحب طرز دگر کو دیکھتے ہیں
اک آئینے میں چراغ قمر کو دیکھتے ہیں
ہمیں بھی رکھنا ہے مٹی کو اپنی مٹھی میں
سفر کو دیکھ کے زاد سفر کو دیکھتے ہیں
ہماری جاں تری وابستگی سے روشن ہے
ہنر کو دیکھنے والے ہنر کو دیکھتے ہیں
کہاں کے وہ تھے جنھوں نے کیا سروں کو قلم
کہاں کے ہم ہیں جو تیغ و تبر کو دیکھتے ہیں
بنا ہوا ہے یہ اب دہر وجہ حیرانی
کہ جن کے پاؤں نہیں ہیں وہ سر کو دیکھتے ہیں
ہیں ایک وہ جنہیں خوش آتی ہے یہ ویرانی
اور ایک ہم ہیں کہ دیوار و در کو دیکھتے ہیں
یہ بے دلی ہے کہ ہے رنج نارسائی طور
نظر میں گردش حد نظر کو دیکھتے ہیں

خالد سہیل
کناڈا

غزل

رشتوں ناتوں کے قدم تھک تھک کے بوجھل ہوگئے
سرد تھے موسم یہاں جذبات بھی شل ہو گئے
خاندانوں کے سروں پر کچھ عجیب آسیب تھے
درد دل کے سب مسیحا خود ہی پاگل ہو گئے
کیا بھیانک خواب تھے آغوش مادر میں نہاں
لوریا سنتے ہوئے بچے بھی بے کل ہو گئے
رفتہ رفتہ زندگی اس دور میں داخل ہوئی
رتجگوں کے خوف شاموں کو مسلسل ہوگئے
خواہشوں کے چار سو بکھرے ہوئے بادل سہیل
اک ہوا ایسی چلی نظروں سے اوجھل ہوگئے

یعقوب تصورؔ

ابوظبی

غزل

نہ رہ پائیں ذرا بھی خوش گماں سے
یہ آئینے ہٹیں تو درمیاں سے
یہاں حد ہے وہاں ہے بے کرانی
زمیں کا ربط ہی کیا آسماں سے
افق کے پار ساحل سے لگا دیں
ہوائیں لڑ رہیں ہیں بادباں سے
فضا سر سبز کرنا چاہتی ہے
بہادروں کا تعلق ہے خزاں سے
نظر بھی ترجمانی کر نہ پائے
نہ ہو اظہار کی خواہش زباں سے
کہیں تسکین کی چھاؤں نہیں ہے
بنے تو ہر طرف ہیں سائباں سے
ہو استدلال مستحکم تو اکثر
نہیں کا رابطہ ہوتا ہے ہاں سے

غزل

منزل ہے گرانبارئ منظر میں اکیلی
آوارہ کرن دشت مقدر میں اکیلی
اک قاز کی اڑتی ہوئی مسموم فضا میں
اک ماہئ بے آب سمندر میں اکیلی
رنگینئ منظر پہ مصور اتر آیا
تصویر حراساں ہے کھلے گھر میں اکیلی
تنہائی کی املاک تو ورثہ میں ملی ہے
رہتی ہے سدا روح بھی پیکر میں اکیلی
انبوہ کہ ہے در پئے آزار ہمہ دم
رہ جائے گی ہر ذات ہی محشر میں اکیلی
ظلمات کی آندھی لیے آسیب کے سائے
قندیل ہے لٹکی ہوئی اک در میں اکیلی
گردش میں تصورؔ ہے، بلا محو تماشا
الجھی ہے زمیں اپنے ہی محور میں اکیلی

بی۔ایس۔جین جوہر

میرٹھ

غزل

تم پڑھتے رہو مجھ کو میں لکھتا چلا جاؤں
بازار مجھے مانگے میں بکتا چلا جاؤں
شہروں میں مرے چرچے، گلیوں میں مری باتیں
دیکھے نہ کوئی مجھ کو میں دکھتا چلا جاؤں
الفاظ مرے منہ سے جو نکلیں وہ موزوں ہوں
اشعار کی بھٹی میں یوں سکتا چلا جاؤں
میں پھول ہوں جنگل کا، کی کس نے آبیاری
کانٹوں سے گھرا ہو کر بھی کھلتا چلا جاؤں
برسوں سے گریزاں ہوں، مدت سے نہیں دیکھا
پڑتے ہو راستے میں تو ملتا چلا جاؤں
مڑنا تو نہیں آتا میں ٹوٹ ہی سکتا ہوں
عزت سے کوئی بولے تو جھکتا چلا جاؤں
دو چار گھڑی بیٹھیں، تن من کی کریں باتیں
کچھ وقت ٹھہر جائے، کچھ رکتا چلا جاؤں
آکاش کا پنچھی ہوں، اڑنا ہی مرا جیون
طوفاں بھی اگر روکے میں اڑتا چلا جاؤں

مسلم شہزآد

ویسٹ چمپارن

غزل

یہ نشانی، رہ گذر میں آبلہ پائی کی ہے
دوسرے لفظوں میں جبراً کارفرمائی کی ہے
آفرینش سے ہے دل میں بر نہیں آئی مگر
وہ جو خواہش آسماں پہ خامہ فرسائی کی ہے
کتنی شوریدہ سری مدغم ہے مشت خاک میں
اور کتنی تاب اس میں دشت پیمائی کی ہے
قرض یادوں کا ادا ہوتا نہیں یہ اور بات
ورنہ آنکھوں میں مسلسل جاگ بھر پائی کی ہے
آ کھڑا ہوں ایسے چوراہے پہ کہ کھلتا نہیں
کس طرف کو جانے والی راہ سچائی کی ہے
ورنہ بجھنے کو کہاں تھے اک طرف سے سب دیے
یہ شرارت تو سراسر باد ہرجائی کی ہے
کچھ نہیں شہزآد میرے ساتھ اب اس کے سوا
سلسلہ یادوں کا ہے اور شام تنہائی کی ہے

ڈاکٹر ناظم جعفری

وارانسی

غزل

دھڑکنیں نبض کی کہتی ہیں لہو زندہ ہے
ایک طوفان ابھی تک سر جو زندہ ہے
اپنے حالات کا احساس نہیں ہے تجھ کو
مجھ کو حیرت ہے کہ اس دور میں تو زندہ ہے
جڑ سے اکھڑے ہوئے پودے مری پہچان نہیں
گیلی مٹی میں تقاضائے نمو زندہ ہے
مرے چہرے سے ٹپکتا ہے پسینہ لیکن
گیلے بازو یہ بتاتے ہیں وضو زندہ ہے
چاہنے والے ستائش پہ ہوئے آمادہ
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے غلو زندہ ہے
کوئی پیوند نہیں ملتا کفن میں لیکن
میرے بوسیدہ لباسوں میں رفو زندہ ہے
اپنی فطرت نہ بدلنی تھی نہ بدلی ناظم
ہم ہیں مرجھائے ہوئے پھول پہ بو زندہ ہے

غزل

لے گا خوشی سے کون خزانہ تو ہے نہیں
آنسو ہمارا موتی کا دانہ تو ہے نہیں
انسانیت کے زخم پہ نغمہ بکھیر دے
میری کہانی تیرا فسانہ تو ہے نہیں
کرتا میں کیا خموش رہا سن کے داستاں
اب اس کے پاس کوئی بہانہ تو ہے نہیں
ویرانیاں ہیں کون پذیرائی اب کرے
محلوں میں کوئی صاحب خانہ تو ہے نہیں
کس طرح کوئی اپنا موافق کرے اسے
بگڑی ہوئی ہوا کا ٹھکانہ تو ہے نہیں
دے کر زبان جان ہتھیلی پہ رکھ سکوں
اب ایسا دوستی کا زمانہ تو ہے نہیں
تیر و ثنا کی مجھ کو ضرورت تو ہے مگر
ناظم میں کیا کروں گا نشانہ تو ہے نہیں

عباس داناؔ

بروڈا

غزل

اگر صورت تمہاری اس قدر پیاری نہیں ہوتی
محبت کرنے کی ہم کو بھی بیماری نہیں ہوتی
ہوس کی آگ میں کتنے بدن جل کر جھلس جاتے
محبت میں اگر شرط وفاداری نہیں ہوتی
چرا لیتی ہے وہ پھولوں کے سارے رنگ اور خوشبو
چمن میں پھر بھی تتلی کی گرفتاری نہیں ہوتی
جگر بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو تو غم کا حق ادا ہوگا
فقط آنسو بہا لینے سے غم خواری نہیں ہوتی
نہیں معلوم انہیں! کیسے بزرگوں کا ادب کرنا
جوانی کے نشے میں یہ سمجھداری نہیں ہوتی
ہمارا یہ لب و لہجہ ہمارے فن کا شاہد ہے
ہمارے جیسے لوگوں سے اداکاری نہیں ہوتی
یہ پھولوں کی طرح سے نرم اور نازک سی ہوتی ہیں
حسیں یادیں کسی کے دل پہ بھی بھاری نہیں ہوتی
میں خود بھی وقت کے ہاتھوں میں کب سے بک گیا ہوتا
مرے کردار میں داناؔ جو خداری نہیں ہوتی

غزل

چاشنی لفظوں میں اور شعروں میں لذت چاہیے
جو غزل سنتے ہیں ان کو بھی لطافت چاہیے
سوچنے کی بات ہے! پر حوصلے کی داد دو
ایک قطرے کو سمندر پہ حکومت چاہیے
دوستوں سے ملنا جلنا بھی ضروری ہے بہت
کاروبار زندگی سے تھوری فرصت چاہیے
چاک داماں لے کے پھرنا شہر میں اچھا نہیں
پیار کی دنیا میں بھی آداب وحشت چاہیے
گھر پہ دشمن بھی اگر آئے تو عزت دے اسے
کم سے کم انساں میں اتنی تو شرافت چاہیے
بس دعا کرنے سے ہی توبہ نہیں ہوتی قبول
شرط ہے آنکھوں میں بھی اشک ندامت چاہیے
ان کے گھر پہ جانا داناؔ بے سبب اچھا نہیں
ان سے ملنے کا بہانہ خوبصورت چاہیے

سوہن راہی
یو۔کے۔

غزل

اک رنگ روشنی کی تہوں میں اتار کر
خاموش ہوگیا کوئی مجھ کو پکار کر
کٹتی نہیں ہے آنسوؤں میں دن گزار کر
جینا جو ہے تو زندگی پر اعتبار کر
اب روز و شب کے دشت میں جینا محال ہے
کیوں چھپ گیا وہ یاد کا سورج ابھار کر
اے خاک گور تو مجھے اتنا نہیں پکار
میرا سفر طویل ہے اب انتظار کر
بے حس ترا وجود، اور پژمردہ زندگی
صحرائے دل میں پیدا نیا انتشار کر
مرنے کے بعد آئے گا وہ آئے گا ضرور
دامان دل نہ اور تو اب تار تار کر

غزل

کہانی تھا کہانی لکھ رہا ہوں
میں اپنی بے زبانی لکھ رہا ہوں
میں الٹی سیدھی بانی لکھ رہا ہوں
دلوں کی آگ پانی لکھ رہا ہوں
غزل اور گیت کے رنگوں کو لے کر
تری جادو بیانی لکھ رہا ہوں
میں ان خوابوں کہ جن سے پھول مہکیں
انہیں راتوں کی رانی لکھ رہا ہوں
جو فصل درد دل سیراب رکھتے
وہی آنکھوں کا پانی لکھ رہا ہوں
میں زندہ ہوں ترے رحم و کرم پر
تری ہر مہربانی لکھ رہا ہوں
سیاہی اشک، خامہ دل، ورق سانس
محبت کے میں معنی لکھ رہا ہوں
کوئی پڑھتا نہیں راہی میں پھر بھی
کتھا اپنی پرانی لکھ رہا ہوں

احمد شناس

جموں

غزل

زندگی کا ہر حسیں منظر خیالی ہوگیا
آئینہ بھی خوشنما چہروں سے خالی ہوگیا

اس نے پورے چاند کی صورت تراشا تھا مجھے
میں سیاہ راتوں میں کرنوں کا سوالی ہوگیا

آئینوں کے بیچ اس نے رکھ دیے کتنے سوال
ساعت اظہار میں وہ بھی خیالی ہوگیا

زندگی کی صبح میری رات اس کے پاس ہے
کچھ یقینی ہے یہاں کچھ احتمالی ہوگیا

اس نے مجھ کو میری آنکھوں سے چھپا کر رکھ دیا
میں حقیقت سے زیادہ احتمالی ہوگیا

کب عمارت سے نکل کر اس نے دیکھا تھا خدا
آدمی دیر و حرم کا لا ابالی ہوگیا

کوئی رانجھا تھا حقیقت میں نہ کوئی ہیر تھی
سارا قصہ ہی محبت کا خیالی ہوگیا

نوجوانوں کا قبیلہ اس کے پیچھے چل پڑا
جرم کر کے بھاگنے والا مثالی ہوگیا

گھر کا اعلیٰ ذہن دولت کا نمائندہ ہوا
جو ذرا کمزور تھا وہ یرغمالی ہوگیا

حسن اس کا آشکارا ہوگیا احمد شناس
درد میرا پتہ پتہ، ڈالی ڈالی ہوگیا

غزل

میرے بھی نادیدہ کتنے چہرے ہیں
تو نے بھی انسان چھپا کر رکھے ہیں

مٹی کھاتے اور فلک پر رہتے ہیں
اس دنیا میں ایسے بھی کچھ کنگلے ہیں

حاجت کے عنوان میں اللہ والے ہیں
ورنہ انساں، انسانوں کے پیاسے ہیں

ہر ذرے میں قدرت ہے شہ پاروں کی
ہر قطرے میں ساگر اوندھے رکھے ہیں

سورج کیا کیا رنگ دکھاتا رہتا ہے
کیا کیا منظر اس پردے کے پیچھے ہیں

اب نغموں کے دیپک کون جلائے گا
اب بنجارے پکے گھر میں رہتے ہیں

رات کو گھر میں آگ ضروری ہوتی ہے
ورنہ بچے یخ بستہ ہو جاتے ہیں

میں نے بھی کب پوری دنیا دیکھی ہے
تو نے بھی کب سارے درپن کھولے ہیں

تو بھی میری تاک میں چھپ کر بیٹھا ہے
میں نے بھی تاخیر کے حربے سیکھے ہیں

باہر انسانوں سے نفرت ہے لیکن
گھر میں ڈھیروں بچے پیدا کرتے ہیں

موسم سے اب میرا اتنا رشتہ ہے
کتنی دھوپ ہے، کتنے بادل برسے ہیں

رشتوں کا آشوب انہیں کھا جائے گا
ہم سے کتنے دور ہمارے بچے ہیں

میں خود اپنے آپ میں ہوں بیگانہ سا
بستی کے انسان بھی میرے جیسے ہیں

ان دیکھے موسم کی چرچا ہے احمد
پیڑوں پر انجان پرندے بیٹھے ہیں

حفیظ انجم کریم نگری

کریم نگر

غزل

مجھے خوش دیکھ کر دشمن بھی حیراں
یہاں کا کنس اور راون بھی حیراں

کہاں سے آگیا کوڑا یہ کرکٹ
مرے گھر کا سجیلا پن بھی حیراں

حویلی جگمگا اٹھے گی کل سے
خبر سن کر ہوا آنگن بھی حیراں

سراپا آپ کا خوشبو ہی خوشبو
ادھر صحرا ادھر گلشن بھی حیراں

گھنا جنگل ہے، کنیا پھول چنتی
ہوا تھا دیکھ کر راجن بھی حیراں

پپیہا کیوں نہیں ملہار گاتا
یہ دیکھا تو ہوا ساون بھی حیراں

مجھے مرنا نہیں آیا ابھی تک
اسی اک بات پر جیون بھی حیراں

مرے چہرے پہ دیمک رینگتی ہے
مجھے دیکھا، ہوا درپن بھی حیراں

کھلی زخموں کی انجم چاندنی ہے
شبستاں میں مرا ساجن بھی حیراں

ڈاکٹر ایس۔اے۔ایچ۔رضوی کیف

لکھنؤ

غزل

میں اپنے ٹوٹے ہوئے جسم کے حصار میں تھا
سنبھالے کون مجھے کس کے اختیار میں تھا

نہ آرزو کی مہک ہے نہ زندگی کی کشش
فضائے درد جہاں تھی میں اس دیار میں تھا

ہزاروں آئینے بکھرے تھے راہ میں لیکن
مرا ہی کرب چمکتے ہوئے غبار میں تھا

ملے بغیر ہی وہ شخص آکے لوٹ گیا
میں مدتوں سے یہاں جس کے انتظار میں تھا

میں اپنے آپ کو اس سے بچا کے رکھ نہ سکا
مرا مکان دہکتے ہوئے شرار میں تھا

زمانہ بانٹ رہا تھا سبھی کو سوغاتیں
ہمارا نام وہاں کیف کس شمار میں تھا

ڈاکٹر فریاد آزر

نئی دہلی

غزل

جہاں کے واسطے سامان عبرت کر رہے ہیں
ہم اپنے نفس کی ایسی اطاعت کر رہے ہیں

کسی کو ایک ہی سجدے میں جنت مل گئی ہے
مگر کچھ لوگ صدیوں سے عبادت کر رہے ہیں

ابھی فرصت نہیں مرنے کی ان لوگوں کو شاید
ابھی کچھ لوگ جینے کی حماقت کر رہے ہیں

حقیقت اس قدر سنگین ہوتی جا رہی ہے
نگاہوں سے سنہرے خواب ہجرت کر رہے ہیں

بھروسہ اٹھ گیا جنت سے کیا اہل زمیں کا
اسی دنیا میں ہی تعمیر جنت کر رہے ہیں

ہمارے صبر کا انداز بدلا جا رہا ہے
تو کیا ہم اپنے قاتل کی حمایت کر رہے ہیں

بزرگوں کی کبھی خدمت نہ کر پائے تھے آزر
سو اپنے آپ کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں

غزل

اس تماشے کا سبب ورنہ کہاں باقی ہے
اب بھی کچھ لوگ ہیں زندہ کہ جہاں باقی ہے

اہل صحرا ابھی بڑھے آتے ہیں شہروں کی طرف
سانس لینے کو جہاں صرف دھول باقی ہے

ڈھونڈتی رہتی ہے ہر لمحہ نگاہ دہشت
اور کس شہر مسلماں میں اماں باقی ہے

زندگی عمر کے اس موڑ پہ ٹھہری ہے جہاں
سود ناپید ہوا صرف زیاں باقی ہے

دل کسی حال میں مایوس نہیں ہے اس سے
لاکھ ہو جائے یقیں ختم، گماں باقی ہے

مار کر بھی مرے قاتل کو تسلی نہ ہوئی
میں ہوا ختم تو کیوں نام و نشاں باقی ہے

لاکھ آزر رہیں تجدید غزل سے لپٹے
آج بھی میر کا انداز بیاں باقی ہے

ایسی خوشیاں تو کتابوں میں ملیں گی آزر
ختم اب گھر کا تصور ہے، مکاں باقی ہے

اطہر رضوی
شاہجہاں پور

غزل

کیسی ریت بنا رکھی ہے لوگوں نے اس گاوں میں
کوئی سدا ہے دھوپ میں بیٹھا کوئی ہمیشہ چھاوں میں
بات سے باتیں نکلیں جیسے ایک دیا سے سو دیپک
دیپک دیپک ہووے اجالا کیا رکھا ہے باتوں میں
جس منزل کی خاطر نکلے تھے وہ کب کی آ پہنچی
لیکن اب تک آگے چلنے کی خواہش ہے پاوں میں
منزل کی سرحد جب آئی کوئی کسی کا یار نہ تھا
کتنے ساتھی بن بیٹھے تھے اندھی بھٹکی راہوں میں
انٹرنیٹ کے پروردہ سب دانشور بن بیٹھے ہیں
شہر میں اب پہچان ہے مشکل دانا اور نادانوں میں
خوشنودی کے پھول لیے وہ میٹھی باتیں کرتے ہیں
گونگے بہرے لوگ کھڑے ہیں ان کے سننے والوں میں
بیتے لمحے گزری راتیں وصل شناسا ایک جسد
اب ہم کس کو کیا بتلائیں کیا رکھا ہے یادوں میں
موسم موسم وہ اپنے محبوب بدلتے رہتے ہیں
جانے کل تک کون نظر آئے گا ان کی بانہوں میں
فرقوں میں نفرت پھیلاو چپکے بیٹھے خون بہاو
حربہ جو انگریزوں کا تھا اپنایا ملاوں نے
شازیہ کا ہے تم روتی ہو یہ مردوں کی بستی ہے
ایسی دکھی بپتائیں تو ہوتی ہیں ہر گاوں میں
دنیا بھر کے چاہنے والوں کی جب اک فہرست بنے
نام ہمارا شامل کرنا غالب کے متوالوں میں

ڈاکٹر عبرتؔ بہرائچی
بہرائچ

غزل

ہمارے گھر میں محبت تھی اختلاف نہ تھا
کسی کی سوچ کا لیکن کوئی گراف نہ تھا
گریز کرتے ہیں کیوں لوگ آج ملنے سے
تمام شہر میں میرے کوئی خلاف نہ تھا
تعلقات میں آتی کہاں سے ہمواری
مری طرف سے ترا دل بھی اتنا صاف نہ تھا
ہماری بات پہ اس کا خموش ہو جانا
یہ اعتراف تھا اس کا یہ انحراف نہ تھا
جو آج خود کو بتاتا ہے وقت کا نقاد
میاں درست کبھی اس کا شین قاف نہ تھا
زمیں سے چاند پہ جانا وہاں سے لوٹ آنا
یہ اس کا فعل عبث تھا یہ اکتشاف نہ تھا
خدا نے اپنی کریمی سے مجھ کو بخش دیا
کوئی گناہ مرا قابل معاف نہ تھا
کہاں سے جوش ابھرتا دلوں میں اے عبرتؔ
تمہارا کوئی بھی نعرہ فلک شگاف نہ تھا

جعفر ساہنی

(عادل منصوری کے نام)

غزل

مشکل میں پڑ گیا وہ ستاروں کی چال سے
بیٹھا ہے تن کو ڈھانک کے جو گرم شال سے

لازم تھا احترام سو چپ چاپ سے رہے
واقف تھے ورنہ آپ کے ہم خستہ حال سے

امید ایسی ان سے متانت کی تھی نہیں
"بچے بگڑ گئے ہیں بہت دیکھ بھال سے"

دم خم تو کچھ نہیں تھا حقیقت کے نام پر
گھبرا گیا جہان ہماری مجال سے

چادر پہ آسمان کی بکھری تھی چاندنی
آراستہ زمین تھی اس کے جمال سے

تم شہر جا رہے ہو تو جاؤ مگر وہاں
ارماں ملیں گے دیکھنا بے حد نڈھال سے

لذت تھی فکر میں جو قدامت کی راہ پر
مجروح ہو کے رہ گئی روشن خیال سے

خاموشیوں کے خول میں ہو کر کے گم شدہ
رکھنا کبھی نہ ساہنیؔ رشتہ ملال سے

انجم عرفانی

بلرام پور

غزل

دیکھتے ہی رہ گئے سب رائیگاں ہوتا ہوا
سارا منظر اور پس منظر دھواں ہوتا ہوا

اس طرح تھے آبلہ پا دشت میں محو خرام
فرش گل پر چہل قدمی کا گماں ہوتا ہوا

بن گیا کوہ گراں سا ایک انجانا تناؤ
اور اچانک میرے اس کے درمیاں ہوتا ہوا

درس اخلاص و وفا جاری رہا تو ایک دن
دیکھنا اس بوریے کو آستاں ہوتا ہوا

لالہ زاروں، جوئباروں، گلعذاروں کا ہجوم
اک بہشت نو کی صورت خاکداں ہوتا ہوا

ہوگئی افسردہ خود شام بہاراں دیکھ کر
عندلیبان چمن کو نوحہ خواں ہوتا ہوا

کب رہی ہے میرے اپنے بس میں یہ خاک بدن
دیکھتے رہنا ہے بس اس کا زیاں ہوتا ہوا

نیند سے بوجھل ہیں پلکیں شل ہوئے اعضا تمام
ایک گہری دھند میں گم یہ جہاں ہوتا ہوا

مہربانی دست شفقت کی ہوئی ہے ملتفت
اور یہ اطراف انجمؔ کہکشاں ہوتا ہوا

ڈاکٹر محبوب راہی

اکولہ

غزل

جو ہیں ناگفتہ موضوعات ان پر کہنے والا ہوں
جو سچ ہے بر سر محراب و منبر کہنے والا ہوں
اگر وہ اپنے اندر ظرف کی گہرائی رکھتا ہے
تو قطرے کو بھی بے شک میں سمندر کہنے والا ہوں
جو ان کے ہجر میں میرے دل و جاں پر گزرتی ہے
مدینہ پھر در آقا ﷺ پہ جا کر کہنے والا ہوں
وہ مجھ کو غالبؔ و مومنؔ سے بہتر کہنے والا ہے
میں اس کو میرؔ اور سوداؔ سے برتر کہنے والا ہوں
مجھے وہ حامل نقد و بصیرت کہنے والا ہے
اسے بحر سخن کا میں شناور کہنے والا ہوں
سہارا دیں گی بالآخر انھیں بیساکھیاں کب تک
بھلا کب تک میں بونوں کو قدآور کہنے والا ہوں
شعور امتیاز خیر و شر کی رہنمائی میں
جو رہبر ہے اسی کو اب میں رہبر کہنے والا ہوں
سخن کے مبتدی سے بھی جو ہے یکسر نابلد راہیؔ
اسے کس طرح آخر میں سخنور کہنے والا ہوں

الف احمد برق

بنگلور

غزل

اے مقصد حیات ذرا سامنے تو آ
کیوں ہے پس ممات ذرا سامنے تو آ
تجھ کو بھی پار کرنے کا ہے مجھ میں حوصلہ
بحر تفکرات ذرا سامنے تو آ
تیری ہی جستجو ہے مری زیست کو یہاں
زاد رہ نجات ذرا سامنے تو آ
کس کی نوازشوں نے مجھے سرخرو کیا
مائل بہ التفات ذرا سامنے تو آ
تجھ سے ہیں نابلد تری اپنی ہی خامیاں
پروردۂ صفات ذرا سامنے تو آ
ہیں فرض منصبی ترے شکوہ بہ لب یہاں
پابند واجبات ذرا سامنے تو آ

سردار آصف

مراد آباد

غزل

ہے پریشان مری آنکھ، یہ منظر کیا ہے
جھیل میں چاند اگر ہے تو فلک پر کیا ہے
مسکرانا اسے سکھلایا کسی آزر نے
ورنہ اس کی بھی کیا اوقات ہے، پتھر کیا ہے
کیا ملا پڑھ کے مجھے، میرے بزرگوں کو پڑھو
خود بتا دو گے ندی کیا ہے، سمندر کیا ہے
یہ صفت ویسے میسر نہیں ہوتی سب کو
دشت راس آئے جسے اس کے لیے گھر کیا ہے
کیا کہوں شعر مجھے لفظ نہیں ملتے ہیں
کیا بتاؤں کہ مرے ذہن میں پیکر کیا ہے
یہ زمیں خود ہی بنائے ہے مجھے اپنا بوجھ
پوچھ کر دیکھو خلا سے مرے اندر کیا ہے

غزل

تنکوں نے سر اٹھائے تو حیرت ہوئی ہے کیوں
سوچے فلک زمیں پہ بغاوت ہوئی ہے کیوں
اس مسئلے پہ کیوں نہیں ہوتی ہے گفتگو
ناپید بستیوں سے شرافت ہوئی ہے کیوں
آئی ہے کیا کہیں سے کوئی پھر بری خبر
بے وقت مسجدوں میں عبادت ہوئی ہے کیوں
میں شہر ہوں، کسی سے مری تھی برائی کیا
میں کیا بتاؤں میری یہ حالت ہوئی ہے کیوں
دھوکے سے نیزا پیٹھ پہ دشمن کی لگ گیا
میں جانتا ہوں مجھ کو ندامت ہوئی ہے کیوں
دنیا سے میں نے ربط ہی رکھا نہیں کبھی
دنیا کو پھر بھی مجھ سے شکایت ہوئی ہے کیوں

سید نور الٰہی ناطق

کٹک

غزل

جس کی دیواریں نہیں ایسا مکاں رکھتا ہوں میں
اپنے سر پہ چھت کے بدلے آسماں رکھتا ہوں میں

اپنے پرکھوں کی چٹائی کا امیں ہوں آج تک
پشت پر روشن اسی کے کچھ نشاں رکھتا ہوں میں

آج کل کی دوستی کا کیا بھروسہ ہے میاں!
اس لیے کچھ فاصلے بھی درمیاں رکھتا ہوں میں

اپنے باہر ہے سمندر کی خموشی دور تک
اپنے اندر مستقل موج رواں رکھتا ہوں میں

میرے بچوں کو رہے تہذیب کا ہر دم خیال
اپنے گھر میں اس لیے اردو زباں رکھتا ہوں میں

جس کو سن کے خواب سے بیدار ہوں ناطق سبھی
اپنے ہر اک لفظ میں صوت اذاں رکھتا ہوں میں

ع.ق. صابر بریلوی

ہبلی

غزل

جو کچھ بھی گرجتا ہے وہ برسا نہیں جاتا
آب رواں کے شور کو پکڑا نہیں جاتا

برسے یہ پانی اتنا کہ خوشیاں منائیں سب
دریا میں، سمندر میں بھی اترا نہیں جاتا

کیچڑ بھی گھر کے سامنے بے حد تو ہے مگر
باہر بھی جاکے آنے کو چھوڑا نہیں جاتا

بارش میں بھیگنے کا مزہ اور ہے لیکن
کپڑوں کو دھوپ میں بھی سکھایا نہیں جاتا

کاغذ کی ناؤ اچھلتی مچلتی ہوئی نکلی
بچوں کے مستیوں کو بھی کچلا نہیں جاتا

آہ شام سرد سرد، ہواؤں پہ ناز ہے
ہو آگ سامنے تو بجھایا نہیں جاتا

وسیم ملک

سورت

غزل

اے بھنور تیری طرح بے باک ہو جائیں گے ہم
ساتھ میں رہ کر ترے تیراک ہو جائیں گے ہم
دیکھ موجوں کے حوالے اس طرح مت کر ہمیں
ورنہ اے ساحل تیرے سفاک ہو جائیں گے ہم
شاخ سے کٹ کر الگ ہونے کا ہم کو غم نہیں
پھول ہیں خوشبو لٹا کر خاک ہو جائیں گے ہم
ہم کبوتر کی طرح شفاف ہیں معصوم ہیں
تو ستائے گا تو پھر چالاک ہو جائیں گے ہم
اوڑھ لیں گے یہ زمیں چادر کی طرح ایک دن
ایک دن مٹی تری خوراک ہو جائیں گے ہم
صبح ہوتے ہی امیدیں تھپکیاں دیں گی ہمیں
شام ہوتے ہی بہت نمناک ہو جائیں گے ہم
آگ تو گلزار بن جاتی ہے راہ شوق میں
تم سمجھتے تھے کہ جل کر راکھ ہو جائیں گے ہم
زندگی رسی پہ چلتا اک مداری ہے وسیمؔ
کیا پتہ ہے کب سپرد خاک ہو جائیں گے ہم

حافظ کرناٹکی

شموگہ

غزل

شب بھر کے حالات پڑھو
صبح کو اخبارات پڑھو
قطرے قطرے میں ہے سبق
دھوپ لکھو برسات پڑھو
ہمدردی کی آنکھوں سے
اوروں کے صدمات پڑھو
فرصت کے ہر لمحے میں
اپنی ہی اوقات پڑھو
چاند میں ڈھل کر اے حافظؔ
رات کے دل کی بات پڑھو

ڈاکٹر قمر رئیس بہرائچی
بہرائچ

غزل

اپنی مٹی سے کبھی دور تو جا کر دیکھیں
وقت رخصت ذرا اشکوں کو چھپا کر دیکھیں

انگنت سر تری دستار سے محروم ہوئے
زندگی کیا تری دہلیز پہ جا کر دیکھیں

پیرہن کیسے بدلتی ہیں ہوائیں اپنا
گھر کے نزدیک کوئی پیڑ لگا کر دیکھیں

حوصلہ لمحوں میں ہو جائے گا معلوم، اگر
سر اٹھائے ہوئے لشکر کو ڈرا کر دیکھیں

آدمی ہے کہ پرندہ ہے کہ ہے اور کوئی
شور تھم جائے تو صحرا میں یہ جا کر دیکھیں

رات کے ماتھے پہ تصویر بنی ہے کس کی
ریت کے ذروں کو قندیل بنا کر دیکھیں

اپنی فنکاری کا احساس بھی ہو جائے گا
آئینہ آپ بھی اک بار اٹھا کر دیکھیں

ڈاکٹر نیاز سلطان پوری
سلطان پور

غزلیں

نظر سے ہو کے وہ دل میں اترنا چاہتا ہے
پھر اس کے بعد لہو میں بکھرنا چاہتا ہے

جو روشنی و محبت کا استعارہ تھا
اسی پرند کے وہ پر کترنا چاہتا ہے

نگار خانے سے کہیے ذرا سنبھل کے رہے
وہ آئینے کے مقابل سنورنا چاہتا ہے

زمیں سے کٹ کے خلا میں رہا جو محو سفر
وہی ستارہ زمیں پہ اترنا چاہتا ہے

خبر ملی ہے مجھے ساکنان صحرا سے
وہ آہو چشم ادھر سے گزرنا چاہتا ہے

خبر بھی ہے کہ تمہارا نیازؔ شعلہ نوا
حدود جسم سے باہر بکھرنا چاہتا ہے

☆

پھوس کی چوپال کچا گھر بہت اچھا لگا
مجھ کو اپنے گاؤں کا منظر بہت اچھا لگا

شام کو گھر کی منڈیروں پر وہ کوؤں کی صدا
رات بھر کتوں کا شور و شر بہت اچھا لگا

لہلہاتا دھان کے کھیتوں کا وہ برسات میں
چیت میں کھلیاں کا منظر بہت اچھا لگا

دوپہر میں نوجوانوں کا کبڈی کھیلنا
صبح دم بچوں کا شور و شر بہت اچھا لگا

کن رسیدہ قصہ گو کے پاس جاڑوں میں نیازؔ
بیٹھنا چوپال میں اکثر بہت اچھا لگا

ڈاکٹر اسلم حبیب
مالیر کوٹلہ

غزل

کوئی گلاب یہاں پر کھلا کے دیکھتے ہیں
چلو خرابۂ جاں کو سجا کے دیکھتے ہیں
جہاں کو بھول کے، تم کو بھلا کے دیکھتے ہیں
اب اپنے آپ کو دل سے لگا کے دیکھتے ہیں
بہت دنوں سے کوئی بات کام کی نہ ہوئی
چلو فلک کو زمیں پر بچھا کے دیکھتے ہیں
کبھی کسی کا بھی احساں نہیں لیا ہم نے
اب اپنے سر پہ یہ احساں اٹھا کے دیکھتے ہیں
بگڑ گئے تھے جسے سن کے وقت کے تیور
جہاں کو بات وہی پھر سنا کے دیکھتے ہیں
نظر نظر تو کئی بار پڑھ چکے اس کو
غزل کو آج ذرا گنگنا کے دیکھتے ہیں
زمانہ ہم پہ بہت دیر ہنس لیا اسلم
چلو اب اس کی ہنسی بھی اڑا کے دیکھتے ہیں

غزل

تہذیب زندگی کی ادا آئے گی ضرور
کھولو گے کھڑکیاں تو ہوا آئے گی ضرور
جینے کے فن میں اور نکھر جانا چاہیے
ہم جانتے ہیں یارو قضا آئے گی ضرور
کھلنے کی ٹھان لی ہے تو دل میں یقیں رکھو
صحن چمن میں باد صبا آئے گی ضرور
آسانیوں کا دور ہے دشواریوں کے بعد
اس دھوپ گھر میں کوئی گھٹا آئے گی ضرور
موسم ملامتوں کا بہت دیر تک نہیں
سر پر سلامتی کی فضا آئے گی ضرور
گلیوں سے جب بھی گذریں گی کچھ آہٹیں نئی
کتوں کے بھونکنے کی صدا آئے گی ضرور

آسی رام پوری
نئی دلی

غزلیں

جو ہوتا میں کسی قابل تو یہ منظر بدل دیتا
جبین وقت کے بگڑے ہوئے تیور بدل دیتا

اگر کچھ زور چلتا میرا بھی اس دور ہستی میں
امیروں سے غریبوں کے میں یہ چھپر بدل دیتا

مری باتیں اگر سنتا سمندر پار بھی کوئی
تو پھر چنگیزیت کے آج یہ تیور بدل دیتا

حقیقت کی جہاں پہ دھجیاں اڑتی ہیں رہ رہ کر
اگر میں بھی وہاں ہوتا تو یہ منظر بدل دیتا

اگر انسان کو کچھ بھی سکوں ملتا زمانے میں
تو یہ انسان سورج چاند کا محور بدل دیتا

ہمارا قافلہ خود متحد ہوتا تو اے آسی
یہاں جتنے بھی ہیں بگڑے ہوئے رہبر بدل دیتا

☆

جمیل وگل ادا گل رخ حسیں دلدار مانگے ہے
نہیں ہے پیار کے قابل مگر دل پیار مانگے ہے

عروج حسن کو آخر یہ کس نے حوصلہ بخشا
کہ اب دست حنائی قتل کو تلوار مانگے ہے

ہمارے گھر پہ خدمت گار تھا جو عہد ماضی میں
اب اس کا حوصلہ دیکھو کہ وہ دستار مانگے ہے

شرافت تھی، عدالت تھی، کبھی میں بھائی چارہ تھا
زمانہ آج پھر ہم سے وہی کردار مانگے ہے

سکون زیست کھو بیٹھے وطن کے واسطے آسی
نہیں معلوم یہ سرکار کیا اقرار مانگے ہے

ضیاءالدین شمسی رامپوری
رامپور

غزل

ہم کو کیوں ستاتی ہے زیست کی یہ تنہائی
سامنے وہ بیٹھے ہیں جیسے بے شناسائی

میرے قتل ناحق پر شور ہے بپا کیسا
کس کو غم ہوا اتنا آنکھ کس کی بھر آئی

بے رخی کا اک عالم ہم نے یہ بھی دیکھا ہے
آنکھ اشک سے پر تھی از رہ پذیرائی

آئینہ جو دیکھو گے، خود پہ ترس کھاؤ گے
واہ اے غم دوراں، تیری یہ مسیحائی

پاؤں ہو گئے زخمی گرچہ راہ الفت میں
آرزو تھی ملنے کی، آرزو یہ بر آئی

دوست بن گئے دشمن، کیسا یہ زمانہ ہے
میری حق نوائی سے ان کی جاں پہ بن آئی

تھے محافظ گلشن، در تباہیٔ گلشن
تجربوں نے ہم کو اب بات یہ ہے سمجھائی

زلزلے ہوں طوفاں ہوں، بے سبب نہیں آتے
جھانک لو گریباں میں، اپنی کار فرمائی

گلستاں کے جلنے سے مضطرب نہ ہو یارو
سو چمن کھلیں گے اب خاک سے صدا آئی

ماں کی عظمتیں حق نے خود ہی یوں بیاں کی ہیں
خلد مل گئی تو نے، ماں کی گر دعا پائی

شمسی ایک شاعر ہے آ گیا یقیں اس کو
شعر سنتے سنتے جب آنکھ اس کی بھر آئی

اشفاق عادل

پٹنہ

غزل

تمام شہر میں بس اک اسی کا چرچا تھا
وہ خوش مزاج مگر دل جلا بھی کتنا تھا
سمجھ رہا تھا جسے مجھ سے مختلف ہوگا
قریب جا کے جو دیکھا تو میرے جیسا تھا
کسی بھی موڑ پہ ٹھہرا نہ پائے شوق اس کا
عجیب شخص تھا ہر دم سفر میں رہتا تھا
گذر گیا ہے بغل سے کوئی خموش مگر
نفس نفس کو مرے دے گیا شرارہ تھا
اب اس جگہ پہ لہو کے ہزار چھینٹے ہیں
کبوتروں کا جہاں پر سفید جوڑا تھا
کسی طرح نہ ہوئی ختم دوریٔ منزل
قدم قدم پہ فریب طلب کا سایا تھا
میں چپ رہوں بھی تو ہر شخص کو سنائی دوں
مری خموشی کو اعجاز اس نے بخشا تھا
لرز رہا ہے بہت آج میرا برگ بدن
مرے وجود کے ساحل پہ کوئی اترا تھا
مری نوا میں عجب شعلگی سی تھی عادل
یہ بے خودی میں کسے میں پکار بیٹھا تھا

مدہوش بلگرامی

ہردوئی

غزل

کیوں کوئی بات فیل کرتے ہو
ذہن و دل کو علیل کرتے ہو
چوٹ ہر بار تم کو پہنچے گی
پتھروں سے اپیل کرتے ہو
چند لفظوں میں وہ سمجھ لے گا
کس لیے خط طویل کرتے ہو
ہم نے بس انگلیاں اٹھائی تھیں
پیش کیسی دلیل کرتے ہو
حشر میں چہرہ کیا دکھاؤ گے
تم عبادت میں ڈھیل کرتے ہو
بھیک دینا نہیں تو مت دیجے
کیوں کسی کو ذلیل کرتے ہو
مال و زر کب کسی کا ہو کے رہا
اپنے دل کو بخیل کرتے ہو
پیڑ سب خشک ہو گئے مدہوش
پھر بھی ذکر جمیل کرتے ہو

حبیب سیفی آغاپوری

نئی دہلی

غزل

توازن کر دیا رب نے خوشی کے ساتھ غم دے کر
جہاں سے وہ ہوئے رخصت مرے سینے پہ دم دے کر

تمہارے حق میں ہے بہتر اسی پر اکتفا کر لو
خدا نے بھیجا تھا اس کو جہاں میں عمر کم دے کر

ادا کر پاؤں میں یا رب فریضہ آبیاری کا
حوالے کر گئے ہیں کچھ وہ یادوں کو جنم دے کر

چلے ہیں تیز قدموں سے ادھر وہ اجل کی جانب
ادھر دوراہے پر چھوڑا عجب کچھ پیچ وخم دے کر

کری تلقین جینے کی جہاں میں ساتھ خوشیوں کے
مگر بے لوث چاہت کا فقط اپنی بھرم دے کر

فراغت ہے نہیں حاصل خیال وخواب سے جن کے
صحیفے زیست کے لکھوں، گئے ہیں وہ قلم دے کر

عشاق کشتواڑی

کشتواڑ

غزل

آرزو کی کوکھ سے جب آرزو پیدا ہوئی
تب کہیں مابعد اس کے جستجو پیدا ہوئی

منکشف یہ راز جب اعصاب پہ طاری ہوا
خود بخود ہی سوچ کی پھر آبجو پیدا ہوئی

لذت ہیجان سے پھر ہوش کا دفتر کھلا
اور پھر تحریر ایسی خوب رو پیدا ہوئی

ہر قدم میرا قریب گام تھا پھر گامزن
خشک سوچوں کی فضا میں پھر نمو پیدا ہوئی

کیا مناظر خواب شیریں کے تھے میرے روبہ رو
پھر وہی بھولی سی دنیا دو بہ دو پیدا ہوئی

میں ابھی تک آشنائے لذت محفل نہ تھا
آپ کے ہی در پہ آکر جستجو پیدا ہوئی

فکر و دانش کا یہ چہرہ رو بہ رو ہے آپ کے
آپ کی صحبت سے اس میں ہاؤ ہو پیدا ہوئی

گرد اس پہ گردش ایام کیا ڈالے گی پھر
گفتگو میں خود بخود جب تم سے تو پیدا ہوئی

بعد کاوش جب متاع شعر سے رشتہ ہوا
تب کہیں عشاق جوئے تند خو پیدا ہوئی

عمران راقمؔ

کولکاتہ

غزل

نوک قلم دوات سیاہی خلاف تھی
کاغذ کی جو ہوئی وہ تباہی خلاف تھی

قانون ہی خرید لیا دشمنوں نے کیا
منصف خلاف ساری گواہی خلاف تھی

تالاب میں وہ بھول گیا جال پھینک کر
غفلت کی حد یہ دیکھ کے ماہی خلاف تھی

اک ایک کر کے سوکھ گئے روشنی کے پھول
ہر سمت گلستاں کے ہوا ہی خلاف تھی

جینے کی ضد میں دیر سے عقدہ یہی کھلا
اس زندگی کے بیچ دوا ہی خلاف تھی

کس کس کو بے گناہی کا دیتا ثبوت میں
تقدیر میں تو اپنے قضا ہی خلاف تھی

کس طرح بیچ دیتا میں اپنے ضمیر کو
اپنے مزاج کے تو انا ہی خلاف تھی

بالو پہ رکھ دیا تھا کہ اس میں ہو تازگی
راقمؔ کے اس عمل پہ صراحی خلاف تھی

ڈاکٹر نعیم ساحلؔ

الہ آباد

غزل

راہ سفر میں مجھ کو دعا دے کے دیکھتے
کچھ تو مری وفا کا صلہ دے کے دیکھتے

کیسے نہ ہوتے ہم بھی زمانے میں کامیاب
اچھی ہمیں بھی آب و ہوا دے کے دیکھتے

کس درجہ چاہتا ہوں یہ ہو جاتا انکشاف
اک اور زخم آپ نیا دے کے دیکھتے

بکتے نہ بار بار وہ بازار حرص میں
خود کو جو ایک بار سزا دے کے دیکھتے

دیتا ہے ہر کسی کو خدا ہی شفا مگر
بیمار کو تو آپ دعا دے کے دیکھتے

آ جاتا ایک پل میں ہی ہوش و حواس میں
'گیسوئے عنبریں کی ہوا دے کے دیکھتے'

ان کو کسی بھی حال میں دیتا نہ ڈوبنے
ساحلؔ اگر وہ مجھ کو صدا دے کے دیکھتے

ظفر صدیقی

پٹنہ

غزل

شعلگی کیوں یہ جل کے لہجے میں
آنچ رکھیے سنبھل کے لہجے میں

گفتگو کر نہ کل کے لہجے میں
تازگی رکھ غزل کے لہجے میں

کان دیوار کے بھی ہوتے ہیں
بولئے آپ ہلکے لہجے میں

سادگی اپنی کھا گئی دھوکا
اس نے کی بات چھل کے لہجے میں

ذکر جب بھی کیا ستاروں کا
چاند آیا نکل کے لہجے میں

ان کا طرز کلام کیا کہئے
شہد آتا ہے ڈھل کے لہجے میں

آؤ اب احتجاج کرتے ہیں
خامشی کو بدل کے لہجے میں

تو ہے مفلس ظفر تو ڈر کیسا
بول اہل دول کے لہجے میں

ریاض احمد خمار

بنگلور

غزل

شبنم صفت تھا آگ کا دریا ہوا ہوں میں
ہاں حادثوں کی گود کا پالا ہوا ہوں میں

یہ بھی ہے سچ کہ آج مسائل کی دھوپ میں
کپڑوں کی طرح تار پہ لٹکا ہوا ہوں میں

پھیلوں تو ہوں میں ایک سمندر بلا شبہ
دراصل اپنے آپ میں سمٹا ہوا ہوں میں

جوڑیں گے ریزہ ریزہ مجھے آپ کس طرح
فرش زمیں پہ ٹوٹ کے بکھرا ہوا ہوں میں

تاریکیوں میں روح کی اترے گی چاندنی
دل کے افق پہ چاند سا ابھرا ہوا ہوں میں

دیکھوں جدھر جدھر بھی مناظر ہیں خوں چکاں
حیراں ہوں کس دیار میں آیا ہوا ہوں میں

کرتے ہیں صبح گھر سے روانہ خمار یوں
جیسے محاز جنگ پہ نکلا ہوا ہوں میں

ڈاکٹر ضمیر احمد ضمیر

الہ آباد

غزل

ورق ورق پہ لفظ لفظ بے نقاب دیکھ کر
خرد کی آنکھ بند ہے کھلی کتاب دیکھ کر
اڑی اڑی سی نیند میں حسین خواب دیکھ کر
دلیل آب دے گیا کوئی سراب دیکھ کر
نوازش سحر نے اوس کو بھی یوں سجا دیا
گہر گہر کا رنگ اڑا ہے آب و تاب دیکھ کر
کروگے سجدہ گھوم پھر کے تم اسی زمیں پر
جھکاؤ سر ابھی بلند آفتاب دیکھ کر
یہ اعتراف ہے مجھے نہیں ہوں اتنا باہنر
کہ اپنا رخ بدل دوں میں ہوا خراب دیکھ کر
جواب تو نہ دے سکے گا دے گا تم کو گالیاں
سوال مت کرو کسی کو لاجواب دیکھ کر
ضمیر چاہتے ہیں آپ شرح زندگی اگر
نفس نفس شمار کیجیے حباب دیکھ کر

احمد کمال حشمی

کانکی نارہ

غزل

اپنی شریانوں میں تیزاب لیے پھرتے ہیں
ہم ہمیشہ دل بے تاب لیے پھرتے ہیں
ہم وہ میکش ہیں نشہ جن کے مقدر میں نہیں
مے کے پیالے میں بھی خوناب لیے پھرتے ہیں
کسی روز ان میں سے دو چار تو پورے ہوں گے
ہم نگاہوں میں کئی خواب لیے پھرتے ہیں
یہ عجب طرفہ تماشہ ہے کہ کاغذ کے بدن
آگ کے خوف سے تالاب لیے پھرتے ہیں
ہم تو دیوانے ہیں پی لیتے ہیں زہراب مگر
دوسروں کے لیے شہداب لیے پھرتے ہیں
ہم کو ہر حال میں رہنا ہے اسی دنیا میں
ہم کبھی آگ، کبھی آب لیے پھرتے ہیں
غم جاناں، غم ذات اور غم دنیا بھی ہے
ہم قلی ہیں، کئی اسباب لیے پھرتے ہیں
ہم دیئے ہیں نہ ستارے ہیں نہ جگنو ہیں کمالؔ
ہم تو سورج ہیں تب و تاب لیے پھرتے ہیں

افروز عالم

کویت

غزل

گردش ہے مرے ساتھ پتہ دے رہا ہوں میں

ہر دل کو محبت سے صدا دے رہا ہوں میں

نشتر کی طرح ذہن میں چبھنے لگی ہے اب

جینے کی سورشوں کو سزا دے رہا ہوں میں

ہر شب کے چراغوں میں بہر کیف ہوں زندہ

چپ چاپ ہی کرے کو ضیاء دے رہا ہوں میں

جو دشمن جاں ہے اسی کافر کی طلب ہے

یوں شوق چراغاں کو ہوا دے رہا ہوں میں

ہے کون پس آرزو بیٹھا اسے بھی ڈھونڈ

لفظوں میں اپنے اس کا پتا دے رہا ہوں میں

ہے وقت کی گردش میں بدلتا ہوا عالم

آہنگ نیا سوچنے کا دے رہا ہوں میں

غزل

آپ سے انس ہوا چاہتا ہے

پھر کوئی باب کھلا چاہتا ہے

میرے احباب میں اعلان کرو

اب کوئی میرا ہوا چاہتا ہے

عقل بھی جدت و ندرت مانگے

دل یہ انداز جدا چاہتا ہے

نام کیا ایسی ادا کا رکھیں

سانس رکنے کی ادا چاہتا ہے

ہم نئی دوستی کے قائل تھے

کوئی دشمن کا پتہ چاہتا ہے

کیسے اس شام کو ہم کہہ دیں سحر

ہر نفس سر پہ ردا چاہتا ہے

اک عالم کو کھٹکتا ہے جو

وہ بھی جینے کی دعا چاہتا ہے

ملک زادہ جاوید

نوئیڈا

غزلیں

لوگوں پر اپکار نہ کر
غم کا کاروبار نہ کر
دولت کے پیچھے مت بھاگ
اپنے کو بازار نہ کر
دھوپ کی نظریں ہیں ہم پر
خود کو سایہ دار نہ کر
بچوں پر مت رعب جما
پھولوں کو تو خار نہ کر
آنکھوں سے دل میں نہ اتر
خوابوں کی بھرمار نہ کر
لفظوں کی پرتیں مت کھول
مفلس کو بیمار نہ کر

☆

غزلوں کو سنجیدہ کر
کھارا پانی میٹھا کر
بھیڑ بہت ہے رستے میں
فرصت اوڑھ کے نکلا کر
کھل جاتے ہیں راز کئی
لفظوں سے مت کھیلا کر
اپنی اک تصویر لگا
البم کو گلدستہ کر
اپنے لہجہ سے جاوید
تاریکی میں اجالا کر

م۔لئیق انصاری

رائے بریلی

غزل

آگیا ہے اب دلِ صد چاک سے ہوتا ہوا
ایک آنسو دیدۂ نمناک سے ہوتا ہوا
جسم خوں آلود میرا دیکھ کہ پوچھو نہ کچھ
آ رہا ہوں بستیٔ سفاک سے ہوتا ہوا
جس کو صدیوں قبل شنکر بے خودی میں پی گئے
آگیا وہ جسم تک تریاک سے ہوتا ہوا
منزلِ انسانیت تک آج آخر آگیا
خاک کا پتلا غبارِ خاک سے ہوتا ہوا
عالمِ وارفتگی میں آج دیوانہ ترا
تجھ تک آیا ہے خس و خاشاک سے ہوتا ہوا
آخرش آکر مری غزلوں کی زینت بن گیا
میرا لہجہ وسعتِ افلاک سے ہوتا ہوا
دشت و صحرا ہی نہیں منزل پہ اپنی میں لئیق
آگیا ہوں منزلِ ادراک سے ہوتا ہوا

شفق سوپوری

سری نگر

غزل

میں خس بدوش ہوں پیچھے شرر ہے چار قدم
کہ مجھ سے دور زوال وضرر ہے چار قدم
یہاں بعضف، وہاں تازگی سے طے نہ ہوا
سنا تھا دشت وفا کا سفر ہے چار قدم
ذرا بھی کوچۂ محبوب سے نہیں اٹھتے
اگرچہ دور ہمارا بھی گھر ہے چار قدم
غبار خاک فنا ہے ہماری ارض جنوں
کہ اس میں سلسلہ خشک وتر ہے چار قدم
میری نظر میں ہے اک چور راستہ وہ بھی
جہاں سے محور شمس و قمر ہے چار قدم
مگر کسی کو ہو دیدار خستگاں کا خیال
چمن سے وادئ خار و حجر ہے چار قدم
تمہیں جو چلنے تھے وہ دو قدم بھی چلتا ہوں
مرا بہ سوئے تعلق سفر ہے چار قدم

شفیق مراد

جرمنی

غزل

درد میں ڈوبی ہوئی اک داستاں کا اقتباس
اُسکے چہرے پر لکھا ہے کس جہاں کا اقتباس
خود ہی آجانا دریچہ درد کا تم کھول کر
خود ہی لکھنا صفحۂ دِل پر زباں کا اقتباس
ہجرتوں میں ہجر کا ساماں ہوا جب وہ ملا
نارسائی ہی رہی عمرِ رواں کا اقتباس
تھے کتابِ زندگی پر نام دونوں کے لکھے
بن گیا میں داستاں وہ داستاں کا اقتباس
کر رہا ہے خود کو وہ منسوب میرے نام سے
لکھ رہا ہے عشق کے بارِ گراں کا اقتباس
میں لب ساحل کھڑا سنتا رہا موجوں کا شور
اور وہ لکھتا ہی گیا میرے گماں کا اقتباس
اِک سفینہ چاہتوں کا اُسکی آنکھوں میں رواں
وقت کے صحرا میں ہے وہ سائباں کا اقتباس
اُسکا چہرہ چودھویں کے چاند کا عکاس ہے
اُسکا آنچل ہے چمکتی کہکشاں کا اقتباس
رس بھری کی بات سن کر سوچتا ہی رہ گیا
ہے یہی حسنِ بیاں یا ہے بیاں کا اقتباس
وقت کی پرواز میں اُڑتے رہیں گے ساتھ ساتھ
ہے یہ روحوں کا سفر تو پھر کہاں کا اقتباس
بن گیا ہوں میں بھی اپنے دور کا شاہیں مراد
میری ہر پرواز میں ہے آسماں کا اقتباس

جمشید انصاری

قطر

غزل

نہ جانے کون اتنا ڈر گیا ہے
ہر اک بستی کو خائف کر گیا ہے
بھلا کیسے میں اس کو بھول جاؤں
کہ ذہن و دل میں جو گھر کر گیا ہے
بڑھاپے میں نہیں جس کا سہارا
سمجھئے جیتے جی وہ مر گیا ہے
بڑی امید تھی آنکھوں میں اس کی
ترے در سے جو چشم تر گیا ہے
چھلک جائیں نہ اب آنکھوں سے آنسو
کہ یہ کشکول بھی اب بھر گیا ہے
بڑا خوش بخت ہوگا آدمی وہ
کہ راہ حق میں جس کا سر گیا ہے
وفا کی بھیک اور اس بے وفا سے؟
ارے جمشید کس در پر گیا ہے

شوکت علی ناز

قطر

غزل

ہنر مجھے بھی عطا ہو جو ماہروں کی طرح
پیروؤں لفظوں کے موتی میں شاعروں کی طرح
سخن کدے سے مئے حرف وصوت پینی ہے
ادب فضاؤں میں اڑنا ہے طائروں کی طرح
متاع حسن کی خیرات لے کے اٹھیں گے
تمہارے در پہ پڑے ہیں مجاوروں کی طرح
غم حیات، غم یار اور غم دنیا
یہ زیست کرنا پڑی مجھ کو دائروں کی طرح
خیال یار میں اتنا نہ غرق ہو جاؤں
کہ پوجنے لگوں اس کو میں کافروں کی طرح
دل و دماغ میں تیرے میں ایسے بس جاؤں
مجھے بھی یاد رکھے تو محاوروں کی طرح
قیام کرتے نہیں ناز دھڑکنوں میں میری
وہ دل سرائے میں آتے ہیں زائروں کی طرح

قاضی فراز احمد

رتنہ گری

غزل

زندگی ہے ہوا پہ چلتی ہے
جیسے آہٹ صدا پہ چلتی ہے

راستے سے بھی راستے نکلے
دوستی بس وفا پہ چلتی ہے

آپ چلتے نہیں تو کیا حاصل
عمر اپنی ادا پہ چلتی ہے

حکمرانی گناہگاروں کی
صرف اپنی خطا پہ چلتی ہے

آپ کشتی کی رکھ دیں پتواریں
یہ مخالف ہوا پہ چلتی ہے

ذوق چلتا ہے لے کے قدریں بھی
اور شہرت ریا پہ چلتی ہے

کوئی عالم عمل نہ ہے عامل
بندگی اب دعا پہ چلتی ہے

جس پہ چلتا ہے بس اسی پر بس
جابری ہے خطا پہ چلتی ہے

ہم نے دیکھا فراز یہ منظر
اب ہوا بھی روا پہ چلتی ہے

نعیم اختر جرأت

وارانسی

غزل

آپ کرنے چلے ہیں سر دنیا
خاک ہو جائے گی مگر دنیا

کس طرح کرتی ہے بسر دنیا
اڑ گیا ہوش دیکھ کر دنیا

آپ ہشیار ہیں یہ اچھا ہے
بھلے ہے مت و بے خبر دنیا

بیج بویا گیا تھا دہشت کا
چکھ رہی آج بھی ثمر دنیا

جیت کر بھی تو ہار جائے گا
کیوں لگاتا ہے داؤں پر دنیا

ایک دنیا ہمارے اور ہے
ہے وہی سب سے معتبر دنیا

خواب میں جب بھی چیخ سنتے ہیں
ڈھونڈتے ہیں ادھر ادھر دنیا

کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا اس کا بھلا
بات سنتی مری اگر دنیا

رنگ و روغن اتر گیا اس کا
بے مرمت ہے بیشتر دنیا

بھوک سے، جنگ سے لڑو جرأت
چاہیے گر تمہیں دیگر دنیا

مظفر حسین مظفر

مظفر پور

غزل

وطن کے حق میں کریں ہم سلامتی کی دعا
فلک سے رنگ اثر لائے زندگی کی دعا
رہے چمن میں بہاروں کی دلکشی باقی
کلی کلی کی زباں پر ہے تازگی کی دعا
چھپا ہوا ہے ہر اک آستین میں خنجر
اسیر ظلم کریں ترک دشمنی کی دعا
وفا کا شہر اندھیروں میں ڈوب جائے گا
جنون عشق میں کرتا ہوں روشنی کی دعا
یہ انقلاب تمدن عجیب ہے یارو
خیال و خواب کی باتیں ہیں، دوستی کی دعا
میں ان کی شعلہ بیانی تو روز سنتا ہوں
مگر ہے لب پہ مرے اب بھی دلبری کی دعا
یہ انقلاب زمانہ نہیں تو پھر کیا ہے
امیر شہر کرے خود تونگری کی دعا
نظر نظر میں مظفر ہیں جنگ کے آثار
اٹھاؤ ہاتھ کریں امن و آشتی کی دعا

اشفاق قلق

قطر

غزل

خیال و خواب کا دل میں جہان رہنے دے
ذرا سی دیر سہی خوش گمان رہنے دے
نہ جانے کس گھڑی ملت کے کام آجائے
حویلیوں میں تو کچھ نوجوان رہنے دے
سماعتوں پر مری بھی گراں گزرتا ہے
ادھر بھی رکھتے ہیں دیوار کان، رہنے دے
ہر ایک بات پہ لبیک مت کہا کرنا
زمانہ رہتا ہے گر بدگمان رہنے دے
فقیہ وقت بڑا اعتماد تھا تجھ پر
قضا کے وقت بھی جھوٹا بیان رہنے دے
یہ کہہ کے اٹھ گیا دہلیز سے کوئی سائل
امیر شہر! تری جھوٹی شان رہنے دے
تساہلی تری پرواز میں مخل ہوگی
ضرورتوں کی بدن پر تکان رہنے دے
خدائے پاک پہ کامل یقین ہے مجھ کو
تو ماننا جو نہیں ہے نہ مان، رہنے دے

عامر اعظمی

العین

غزل

پوچھتے ہیں سمت سب سے راستہ چلتے ہوئے
کتنے احمق لوگ ہیں قبلہ نما رکھتے ہوئے ۔
معجزہ خود میں نے دیکھا آج کتنا صاف صاف
اک عنایت کی نظر سے جی اٹھے مرتے ہوئے
ہے مدد ہم کو میسر لقمۂ تر ہم نہیں
روک سکتے ہیں قدم دشمن کے ہم بڑھتے ہوئے
سارا عالم ہی تماشائی بنا بیٹھا رہا
اک مکاں کیا، شہر تک دیکھا کیے جلتے ہوئے
دشمنوں سے جنگ جیتی ہم نے عامر بارہا
بارہا ہارے ہیں اپنے آپ سے لڑتے ہوئے

غزل

مئے محبت کی جو پیا ہی نہیں
یوں سمجھ لو کہ وہ جیا ہی نہیں
میری سانسوں میں تیری خوشبو ہے
اس سے اتنا کبھی کہا ہی نہیں
حال دل اس کو ہم سنا دیتے
کیا کریں حوصلہ ہوا ہی نہیں
لذت عشق اس کو کیا معلوم
جو محبت کبھی کیا ہی نہیں
دل کو سمجھائیں کس طرح آخر
ایسا ضدی ہے جانتا ہی نہیں
اس کی محفل سے کیسے اٹھ جائیں
دل ہمارا ابھی بھرا ہی نہیں
ایک در کے سوا کبھی عامر
سر ہمارا کہیں جھکا ہی نہیں

سعید رحمانی
اڑیسہ

غزل

غزل گفتگو کر رہی ہے غزل سے
تو چہرے پہ اس کے کھلے ہیں کنول سے

جو پنجے لڑاتا ہے بڑھ کر اجل سے
حیات اس کو ملتی ہے امرت کے جل سے

مجھے چین کی نیند آتی ہے اس میں
مری جھونپڑی ہے بھلی اک محل سے

وزارت کی کرسی جو پاتے نہیں ہیں
اٹھاتے ہیں وہ فائدہ دل بدل سے

ذرا مسکرا کر ہمیں دیکھ لیجے
پتہ دل کا چلتا ہے ماتھے کے بل سے

ضروری ہے رستہ کوئی اور ڈھونڈیں
کہاں بات بنتی ہے جنگ و جدل سے

چراغ عمل جس نے رکھا ہے روشن
درخشاں ہے آج اس کا تاریک کل سے

ارادہ سعید اپنا چونکہ اٹل ہے
مجھے راہ ملتی ہے دشت و جبل سے

ڈاکٹر قمر الزماں
دھن باد

غزلیں

رہتے تھے پاس پاس مگر دور ہی رہے
میرے لیے تو جیسے کہ تم حور ہی رہے

آیا نہ ایک بال بھی یوں تو گرفت میں
پھر بھی اسیر زلف ہم مشہور ہی رہے

ملتے تھے یوں تو روز ہی، ہوتی تھی گفتگو
لیکن وہ تم کہ شعلہ فشاں طور ہی رہے

قربت نصیب ہو نہ سکی بزم میں کبھی
بس ہم خیال خام میں مسرور ہی رہے

دیکھا کیے زماں ہمیں گوشے سے چشم کے
وسط نگاہ ناز میں ناسور ہی رہے

☆

عالم کو سارے شہر نے اجہل سمجھ لیا
اندھوں کو عقل کے مگر اول سمجھ لیا

کیا کہیے اس کو شغل تغافل کہ سادگی
کالک لگا کے آنکھ میں کاجل سمجھ لیا

جو ذہن میں بھرا تھا کہ لائیں گے انقلاب
کوے کی کائیں کائیں کو ہلچل سمجھ لیا

پٹی پڑھائی یاروں نے کچھ ایسی خاص کر
اچھے بھلے مقام کو دلدل سمجھ لیا

بندر نے اتفاق سے دیکھا جو چڑیا گھر
سوچا زماں نہ جوش میں جنگل سمجھ لیا

ریاض بنارسی
وارانسی

غزل

یہ آج کون سے عالم میں ڈھل گئی دنیا
گماں سے بھی کہیں آگے نکل گئی دنیا

بڑا غرور تھا ہم کو کہ یہ ہماری ہے
کھنک پہ سکوں کی آخر پھسل گئی دنیا

وفا خلوص و محبت کا ذکر رہنے دو
کہ اک ہمیں نہیں بدلے بدل گئی دنیا

ہمارے پیار میں اتنا تو رکھ رکھاؤ رہا
کہ گرتے گرتے ہمارے سنبھل گئی دنیا

حقیقتوں کا حقیقت میں اک نشاں بھی نہیں
خیال و خواب میں اس طرح ڈھل گئی دنیا

لگادی کس نے یہ نفرت کی آگ دل میں ریاض
حسین چہروں پہ بھی خون مل گئی دنیا

غزل

بے سمت بے تعین منزل رواں ہوں میں
مدت سے سوچتا ہوں کہ آخر کہاں ہوں میں

ہر شخص اپنی مرضی کا عنون دے گیا
سب کو لگی جو اپنی وہی داستاں ہوں میں

ہے میرے ساتھ ساتھ دعاؤں کا اک ہجوم
تنہا ہوں رہ گزر میں مگر کارواں ہوں میں

رستہ دکھائیں گے تمہیں نقش قدم مرے
تم تو سر فلک ہو سر لامکاں ہوں میں

میری اداسیوں پہ نہ تم تبصرہ کرو
جس کی بہار تم ہو وہی گلستاں ہوں میں

یارو کی گفتگو کے یہ تیور ہیں اے ریاض
جیسے ہر ایک کو ہے یقیں بے زباں ہوں میں

فرازؔ ادہی

اعظم گڑھ

غزل

سامنے سے مسکرا کر جو گیا
وہ مری آنکھوں میں کانٹے بو گیا
میں نکل کر خواہشوں کی بھیڑ سے
ذہن کی تنہائیوں میں کھو گیا
اک مسافر عمر بھر چلنے کے بعد
موت کی چوکھٹ پہ آکر سو گیا
اب تمہاری کوششیں بیکار ہیں
ڈھونڈتے ہو تم جسے، وہ تو گیا
ہم سے تو مانوس تھا، وہ اس قدر
جاتے جاتے خوں کے آنسو رو گیا
ہجرتوں کی رت ابھی آئی نہیں
کون پھر، اس گاؤں سے، دیکھو گیا
حوصلوں کو میں نے جب آواز دی
کام جو مشکل تھا، آساں ہوگیا
ختم اب ذوق تماشائی کرو
شاخ سے اڑ کر پرندہ، لو! گیا
آنکھ سے آنسو برس کر اے فرازؔ!!
زخم دل کی ہر نشانی دھو گیا

شائستہ جمال

بھوپال

غزلیں

زندگی کو ہے زندگی کی تلاش
ہے اندھیرے میں روشنی کی تلاش
غم زمانے کے سامنے آئے
اک قیامت رہی خوشی کی تلاش
کبھی ڈھونڈے نہیں ملا کوئی
کبھی آساں ہوئی کسی کی تلاش
ان کو رہتی ہے عیش سے نسبت
اور مجھ کو مری کمی کی تلاش
وقت جو کہہ گیا ہے شائستہؔ
کر رہی ہوں میں آگہی کی تلاش

☆

کچھ اس طرح سے زمانہ بدلتا رہتا ہے
دل و دماغ میں سناٹا چلتا رہتا ہے
بدلتے وقت کا احساس ہوشمندی ہے
ہماری عمر کا سورج بھی ڈھلتا رہتا ہے
کوئی ضروری نہیں دل ہمیشہ سخت رہے
وفا کی آنچ سے وہ بھی پگھلتا رہتا ہے
اگر ہے صاحب ایماں گناہ کرنے پر
خدا کے خوف سے اکثر دہلتا رہتا ہے
جسے تمیز ہے شائستہؔ نیک و بد کیا ہے
وہ اپنا ہاتھ ندامت سے ملتا رہتا ہے

فرحت فرزانہ
لنڈن

غزل

کیسا ہے میرے شہر میں یہ خوف اور ہراس
دھرتی ہے سوگوار تو ہر شخص ہے اُداس
کیوں دشمنی کی آگ میں جلتے ہیں میرے لوگ
کیوں امن و آشتی انہیں آتا نہیں ہے راس
اِک نفرتوں کا زہر ہے رِشتوں کے درمیاں
رِشتوں میں اب نہیں ہے وہ پہلی سی اِک مٹھاس
چلتے ہیں ہم زمین پر اِک ڈر لئے ہوئے
رکھا ہوا نہ بم ہو کہیں راستوں کے پاس
ہے دوست آستین میں خنجر لیے ہوئے
اب دوستی بھی دوست کو آتی نہیں ہے راس
دِل میں ہمارے پیار کی فرحتؔ نہیں رہی
پہنا ہر ایک شخص نے نفرت کا ہے لباس

فرزانہ نیناں
نوٹنگھم

غزل

ترے چھونے سے صندل ہوگئی ہوں
سلگنے سے مکمل ہوگئی ہوں
ذرا پیاسے لبوں کی اے اداسی
مجھے تو دیکھ چھاگل ہوگئی ہوں
بدن نے اوڑھ لی ہے شال اس کی
ملائم، نرم، مخمل ہوگئی ہوں
دھنسی جاتی ہے مجھ میں زندگانی
میں اک چشمہ تھی دلدل ہوگئی ہوں
کسی کے عکس میں کھوئی ہوں ایسی
خود آئینے سے اوجھل ہوگئی ہوں
رکھا ہے چاند اونچائی پہ اتنا
تمناؤں سے پاگل ہوگئی ہوں
کرشمہ اک تعلق کا ہے نیناںؔ
کہ میں صحرا سے جل تھل ہوگئی ہوں

پروفیسر رام پرکاش گوئیل

بریلی

غزل

جو نظر نظر سے ملا سکے، مجھے اس نظر کی تلاش ہے
مرا خواب سچ میں بدل سکے، مجھے اس بشر کی تلاش ہے
مری زندگی کے سکھ اور دکھ، یہ تو رات دن کی طرح سے ہیں
جہاں رنج و غم میں نہ فرق ہو، مجھے اس سحر کی تلاش ہے
مجھے لگ رہا ہے کہ ناخدا نہیں اپنے ہوش و حواس میں
میری پار کشتی لگا سکے، اسی باہنر کی تلاش ہے
کیا عجب سیاسی یہ دور ہے، ہوئے لوگ اس میں ہیں بدگماں
جہاں دوست بن کے رہیں سبھی، مجھے اس نگر کی تلاش ہے
کئی موڑ آئے حیات میں، کبھی سکھ ملا کبھی دکھ ملا
جہاں سکھ اور دکھ لگیں ایک سے، اسی رہ گذر کی تلاش ہے
ہوئے مجھ سے کتنے گناہ ہیں، نہیں ان کا کوئی حساب ہے
جو معاف پھر بھی مجھے کرے، اسی دیدہ ور کی تلاش ہے
نہ خوشی کی اب ہے خوشی مجھے، نہیں غم کا کوئی بھی غم مجھے
جو بتائے مجھ کو مرا مرض، اسی چارہ گر کی تلاش ہے
نہیں جانتا ہوں قافیہ، نہ ردیف سے مرا واسطہ
مرے فکر و فن کو نکھار دے، اسی باہنر کی تلاش ہے
میں بھٹک رہا ہوں اے سوز اب، کبھی اسکے در کبھی اسکے در
جو ملا سکے مجھے مجھ سے ہی، اسی راہبر کی تلاش ہے

ग़ज़ल

जो नजर नजर से मिला सके,
मुझे उस नजर की तलाश है
मेरा ख़्वाब सच में बदल सके,
मुझे उस बशर की तलाश है
मेरी जिन्दगी के सुख और दुख,
ये तो रात दिन की तरह से हैं
जहाँ रंजो-गम में फ़र्क हो,
मुझे उस सहर की तलाश है
मुझे लग रहा है कि नाख़ुदा
नहीं अपने होशो-हवास में
मेरी पार कश्ती लगा सके,
उसी बाहुनर की तलाश है
क्या अजब सियासी ये दौर है,
हुए लोग इसमें हैं बदगुमाँ
जहाँ दोस्त बन के रहें सभी,
मुझे उस नगर की तलाश है
कई मोड़ आये हयात में,
कभी सुख मिला कभी दुख मिला
जहाँ सुख और दुख लगें एक से,
उसी रहगुजर की तलाश है
हुए मुझसे कितने गुनाह हैं,
नहीं उनका कोई हिसाब है,
जो मआफ़ फिर भी मुझे करे,
उसी दीदावर की तलाश है
न ख़ुशी की अब है ख़ुशी मुझे,
नहीं ग़म का कोई भी ग़म मुझे
जो बताये मुझको मेरा मरज़,
उसी चारागर की तलाश है
नहीं जानता हूँ काफ़िया,
न रदीफ़ से मेरा वास्ता
मेरे फ़िक्रो-फ़न को निखार दे,
उसी बाहुनर की तलाश है
मैं भटक रहा हूँ ऐ 'सोज़' अब,
कभी इसके दर कभी उसके दर
जो मिला सके मुझे मुझसे ही,
उसी राहबर की तलाश है

میکشؔ امروہوی

کمال احمد صدیقی (نئی دہلی)

امروہہ اس علاقے کی ایک اہم بستی جسے روہیل کھنڈ کہتے ہیں۔ بجنور سے امروہہ تک مشرقی علوم اور رشد و ہدایت کے مراکز ابھرے اور ان کا راستہ لکھنؤ میں رشد و ہدایت کے عظیم مرکز فرنگی محل سے بہت گہرا رہا۔ سادات گھرانے دین مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی زبانوں کی خدمت و فروغ کے ساتھ اردو علم و ادب خصوصاً شاعری کی نوک پلک سنوارتے رہے۔ تفصیل میں جاؤں تو کئی دفتر ہو جائیں گے۔ اس وقت صرف دو نام لینا کافی ہوگا۔ مصحفی اور قائم چاند پوری۔

مصحفی نے چھ معرکۃ الآرا تذکرے لکھے اور ان کی چھ دیوان اردو میں ہیں۔ مصحفی کو اپنی تنگ دستی کی وجہ سے اپنے شعر بھی بیچنا پڑے۔ پہلے مشاعرے طرحی ہوتے تھے۔ ہر طرح میں وہ سیکڑوں شعر کہتے تھے اور چند پیسوں میں، آنوں میں انہیں ایک ایک شعر فروخت کر دیتے تھے۔ بچے کچے شعر اپنے لیے رکھ لیتے تھے۔ یہ معشیت اور تنگ دستی کی مار تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے خدائے سخن میر تقی سے زیادہ شعر لکھے۔ مصحفی اس اعتبار سے اردو کے سب سے بڑے پرگو شاعر تھے۔

خدائے سخن میر نے پہلے آپ بیتی لکھی ہے لیکن فارسی میں اور اس کا امروہہ ہی کے فرزند نثار احمد فاروقی نے اردو میں ترجمہ کیا۔ پہلا ترجمہ لفظی زیادہ تھا لیکن دوسرے ترجمے میں انھوں نے اس کی تلافی کر لی۔ بامحاورہ رواں ترجمہ کر دیا۔

محمد حسین آزاد نے اردو کے نصاب سے یعنی طبقات کے اعتبار سے تذکرۂ آب حیات لکھا جو بیانیا کہانیوں کے سلسلوں پر مبنی ہے۔ یہ کہانیاں دل آویز ہیں۔ لیکن حقیقت کا خون ہو جاتا ہے۔ چند شخصیتوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ ان میں سرفہرست اردو کی دو بہت اہم شخصیتیں ہیں۔ نظیر اکبر آبادی اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی۔ مصحفی کی زبان کے امروہہ کی بات انھوں نے لکھی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ایسی زیادتی ہے جس سے مصحفی کی شخصیت ادبی اور علمی شخصیت کو تو کوئی گزند نہیں پہنچا البتہ محمد حسین آزاد کا کارنامہ داغدار ہو گیا۔ تذکرہ نگار کی حیثیت سے مصحفی ہی کا رتبہ سب سے اعلیٰ اور رافع ہے۔ مصحفی کے اسی امروہہ سے بیسویں صدی میں رئیس امروہوی اور جون ایلیا کے بعد شاعر کے اعتبار سے جو نام ابھرا وہ ہے میکش امروہوی کا۔

میکش ماضی اور اپنے عہد کے سرمایہ سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ہر صاحب طرز شاعر کے فن کے نمایاں پہلوؤں سے پوری طرح واقف ہیں۔ ہو سکتا ہے ابتدائی مشق کے زمانے میں انھوں نے کچھ کے انداز کی پیروی بھی کی ہو لیکن میں نے جو ان کا کلام سنا یا ان کی بیاضوں میں دیکھا ہے اس میں ان کا اپنا انفرادی رنگ ہے۔ اعلیٰ انسانی قدروں کے ساتھ ان کے کلام میں ان کا اپنا انفرادی رنگ بھی ہے۔ اور اس نے ان کو اپنے ہم عصروں میں ان کی اپنی

پہچان بھی دی ہے۔

رئیس اور جون ایلیا کے بڑے بھائی کمال امروہوی کی طرح میکش کو بھی معشیت کا جبر بمبئی کی فلمی دنیا میں لے گیا۔ مجھے معلوم ہے لیکن میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ مصحفی کی طرح میکش کو بھی ممبئی کے دو فلمی گیت کاروں کے ہاتھ اپنا کلام بیچنا پڑا۔ مکھڑا استھائی گیت کار دیتے تھے اور میکش انترے لکھتے تھے۔ اس سے ان کو دو وقت کی روٹی ملی۔ فاقوں کا سامنا نہ کرنا پڑا لیکن اس سے ان کو ایک بڑا فائدہ بھی ہوا۔

اردو غزل جو بڑی حد تک خاص طور سے جو شاعروں کے دھرے پر آگئی تھی اور ادبی صنف کے بجائے کچھ اور ہوگئی تھی۔ اور دوسری طرف مضامین محدود مضامین کی تکرار کی وجہ سے ادبی صنف کے بجائے مشاعری صنف ہوگئی تھی۔ اور کچھ نام نہاد جدیدیوں کی وجہ سے زبان، معنی اور علوم سے رشتہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے ترسیل سے بھی دور ہوگئی تھی۔ اس کی قباحتوں سے میکش دور رہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کی کنبے کی روایت بھی تھی۔ ان کے والد بائیں بازو کی تحریک کے ایک فعال کارکن تھے اور ان کے خیالات میکش نے جذب کیے تھے۔ والدہ کی علالت کی وجہ سے انہیں اپنا جما ہوا پیشہ چھوڑ کر امروہہ آنا پڑا اور پھر انھوں نے دوبارہ بمبئی کا رخ نہیں کیا۔

میں انجمن ترقی پسند تحریک کا ایک سرگرم رکن تھا۔ وہیں میری شاعری کی ابتدا بھی غزل ہی سے ہوئی تھی لیکن آزاد نظم میرا میدان فن ٹھہرا۔ لکھنؤ میں ڈاکٹر علیم، ڈاکٹر رشید جہاں، سید احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، مجاز محمد حسن سے ذہنی قربتیں رہیں۔ تیس برس کشمیر میں رہا۔ ریڈیو کشمیر جب آل انڈیا ریڈیو میں ضم ہوا تو چند برسوں بعد ڈائرکٹوریٹ جنرل آل انڈیا ریڈیو میں اردو سروسز اور یووانی سروسز کا ڈپٹی چیف پروڈیوسر مقرر ہوا۔ میکش سے اس وقت ملاقات ہوئی جب ریڈیو سے سبکدوش ہونے کے بعد دلی میں سرکاری کوٹھی چھوڑنا پڑی اور صاحب آباد میں جا بسا۔ میکش بھی صاحب آباد میں تھے۔ پہلی ملاقات سے آج تک ان کو پر خلوص بے ریا پایا۔

بے ریائی ان کی شاعری کا سب سے اہم پہلو ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان کا وصف باقی رہے گا۔

میکش امروہوی

امروہہ

غزل

بتائیں کیا تمہیں ہجر و وصال تھے کیا کیا
محبتوں کے دلوں پر ملال تھے کیا کیا
اسی طرف سے یہ جگنو نکل کے آئے تھے
ہمارے گھر کے عقب میں ہلال تھے کیا کیا
یہ پھول، چاند، ستارے، ندی، ہوا، خوشبو
بتائیں کیا تمہیں اس کی مثال تھے کیا کیا
جواب سن کے تمہارا ہوئی نہ جنبش لب
وگرنہ دل میں ہمارے سوال تھے کیا کیا
میں کیسے اپنی تباہی کی داستاں لکھتا
حویلیوں کو خبر ہے زوال تھے کیا کیا
وہ جس کو آئینہ دیکھے ہوئے زمانہ ہوا
سمجھ رہا ہے کہ شیشے میں بال تھے کیا کیا
یونہی تو معتقد میر ہو گئے میکش
کہ ان کے شعر و سخن میں کمال تھے کیا کیا

غزل

کشتی کے واسطے یہ سہارے ہی رہ گئے
دریا اتر گیا تو کنارے ہی رہ گئے
پہلی سی چھیڑ چھاڑ تو ممکن نہیں ہے اب
دونوں طرف سے صرف اشارے ہی رہ گئے
اپنی انا کی لاش اٹھانے کے واسطے
تیری گلی میں وقت کے مارے ہی رہ گئے
مضمون دوستوں نے اڑائے بہت مگر
جو شعر تھے ہمارے، ہمارے ہی رہ گئے
میکش نہ راس آئی محبت کی زندگی
اس کاروبار میں تو خسارے ہی رہ گئے

غزل

کہیں سفر ہے مرا عنقریب لہجے میں
میں بات کرتا ہوں ہجرت نصیب لہجے میں

بس ایک بار کسی سمت مڑ کے دیکھا تھا
پکارتی تھی جہالت خطیب لہجے میں

کوئی بھی بات تعلق کو توڑ دیتی ہے
کبھی بھی بات نہ کرنا عجیب لہجے میں

اسی لیے تو میں سچ بولنے سے ڈرتا ہوں
لٹک رہی ہے ابھی تک صلیب لہجے میں

شکم کی آگ انہیں بے زبان کر دے گی
چنیں گے پھول کہاں تک غریب لہجے میں

غزل

وضو کب ٹوٹتا ہے خود کو زیر آب کرنے سے
کوئی چھوٹا نہیں ہوتا کبھی آداب کرنے سے

ہمارے گھر کے ہر کونے میں ہیں تاریکیاں اب بھی
اجالا ہی نہیں ہوتا تجھے مہتاب کرنے سے

تمہارے حکم سے ظل الٰہی کچھ نہیں ہوتا
غریبی تو نہیں جاتی بدن کمخواب کرنے سے

وقار تشنگی کا ہم بھرم ایسے بھی رکھتے ہیں
کہ یہ دریا بھی ڈرتا ہے ہمیں سیراب کرنے سے

ہمارے گھر میں سورج ہے پڑوسی کی طرف سایا
سزا یہ بھی ملی آخر شجر شاداب کرنے سے

غزل

یہی غم ہے حصار ذات میں کوئی نہ آئے گا
ہمارے دن ہماری رات میں کوئی نہ آئے گا

دوپٹے سے پکڑ لیتی ہیں ان کو لڑکیاں اکثر
یہ جگنو ہیں ہمارے ہاتھ میں کوئی نہ آئے گا

ادھر سے تیرے آنے کی بہت امید رہتی تھی
کہ اب ترک تعلقات میں کوئی نہ آئے گا

ہمیں تنہا سفر کرنا پڑے گا عمر بھر یونہی
ہمیں معلوم تھا کہ ساتھ میں کوئی نہ آئے گا

تم اپنے گھر کی ٹوٹی چھت کے نیچے بھیگتے رہنا
کہ بارش تیز ہے برسات میں کوئی نہ آئے گا

ہمارے بعد تم سارے چراغوں کو بجھا دینا
تماشہ دیکھنے بارات میں کوئی نہ آئے گا

اگر ممکن ہو تو دل میں چھپا کر جال سا بن دے
یہاں دشمن ہماری گھات میں کوئی نہ آئے گا

غزل

تاریکیوں کو اپنی مٹا بھی نہ سکا میں
جگنو کی طرح بن کے دکھا بھی نہ سکا میں

رکھنا تھا مجھے ترک تعلق کا بھرم بھی
ویسے تو تجھے دل سے بھلا بھی نہ سکا میں

پیاسا ہی رہا گاؤں کی مٹی کا مقدر
بارش کی طرح ٹوٹ کے آ بھی نہ سکا میں

رستا ہی رہا تجھ سے تعلق کا نبھانا
اے جان تجھے اپنا بنا بھی نہ سکا میں

لپٹے رہے تجھ سے میرے حالات کے سائے
سینے سے ترے غم کو لگا بھی نہ سکا میں

غزل

کام کے لگتے ہیں اکثر اپنی بے کاری کے دن
یاد جب آتے ہیں الفت کی شجر کاوی کے دن
کوئی دشمن بھی یہاں پر خیمہ زن ہوتا نہ تھا
ایسے کاٹے ہم نے ترے دل میں سرداری کے دن
اب سحر ہونے سے پہلے خود ہی کھل جاتی ہیں یہ
پہلے آنکھوں کو کہاں آتے تھے بیداری کے دن
گاؤں کی کچی سی چھت پر ٹوٹتی سانسوں کے ساتھ
یاد کر کے سو گیا تھا کوئی لاچاری کے دن
اس نے ایک سکہ اچھالا تھا کبھی میدان میں
پھر پلٹ کر ہی کہاں آئے میری باری کے دن
وقت کی ٹھوکر مٹا دیتی ہے سب نقش و نگار
بیت جاتے ہیں یہاں سب کی اداکاری کے دن
تم بھی کچھ دن کے سخنور ہو یہاں میکش میاں
دھوپ چھاؤں کی طرح ہوتے ہیں فنکاری کے دن

غزل

خوشی میں بھی یونہی اکثر تیرا غم یاد رہتا ہے
مجھے تو عید کے دن بھی محرم یاد رہتا ہے
میں اکثر اپنے دل کی دل نوازی کرنے لگتا ہوں
ترے بخشے ہوئے زخموں کا مرہم یاد رہتا ہے
بہت مجبور ہوکر میں بھلا بیٹھا نشیمن کو
پرندوں کو بھی شاخ گل کا موسم یاد رہتا ہے
کبھی اتنا کسی کو ٹوٹ کر چاہا نہیں جاتا
کہاں کوئی کسی کو اتنا جانم یاد رہتا ہے
مجھے تو تتلیوں کی اب نگہبانی بھی لازم ہے
تجھے تو پھول کا چہرہ ہی شبنم یاد رہتا ہے

غزل

میرے لب پر یونہی جینے کی دعا ہے شاید
تجھ سے ایک رشتۂ امید وفا ہے شاید
کچھ نہ کچھ تجھ سے توقعات ہوئی ہیں پیہم
کچھ نہ کچھ میرے مقدر میں لکھا ہے شاید
کچھ گلابوں کی سی خوشبو ہے مرے ہاتھوں میں
میں نے کل رات ترا جسم چھوا ہے شاید
گذرے وقتوں کا کوئی زخم ابھر آیا ہے
آج کی رات بہت سرد ہوا ہے شاید
پھر نہ لکھے گئے القاب محبت اس سے
یہ ادا بھی تو محبت کی ادا ہے شاید

غزل

گھر سے نکل کے ذہن کو آرام مل گیا
سورج کی تیز دھوپ میں جب کام مل گیا
کس نے مجھے پکار کے چہرہ چھپا لیا
بازار میں یہ کون سر شام مل گیا
تجھ سے بچھڑ کے شہرتیں اچھی نہیں لگیں
جب تو نہیں رہا تو مجھے نام مل گیا
غربت کے خواب بہہ گئے طوفاں کے ساتھ ساتھ
آغاز کی تلاش میں انجام مل گیا
اتنی تو کام آئی ہماری سخنوری
عزت کہیں ملی تو کہیں کام مل گیا

غزل

میری محبتوں کا لقب تھا مرے لیے
لیکن یہ بات سچ ہے وہ کب تھا مرے لیے
کرتا تھا روز مجھ سے مداوائے رنج و غم
میرے ہی گھر کے پاس مطب تھا مرے لیے
مجھ کو غزل کی شکل میں دولت ہوئی نصیب
سرمایۂ حیات ادب تھا مرے لیے
اب اس میں آگئیں ہیں بہت بے نیازیاں
مدت ہوئی وہ عزم طلب تھا مرے لیے
ہر ہر قدم پہ وہ مجھے دیتا رہا فریب
میری تباہیوں کا سبب تھا مرے لیے
داد سخن نے بخش دی مجھ کو گدا گری
یہ شاعری کا فن بھی عجب تھا مرے لیے
جن موسموں میں تجھ سے بچھڑنا پڑا مجھے
ان موسموں میں جینا غضب تھا مرے لیے

غزل

رابطے تجھ سے مقدر میں کہاں تک رہتے
چاند تارے بھی میرے گھر میں کہاں رہتے
جنگ بندی کا مجھے فیصلہ کرنا ہی پڑا
یہ منافق میرے لشکر میں کہاں تک رہتے
چاندنی رات، ندی، پھول، ستارے اور تو
اتنے منظر تھے تو منظر میں کہاں تک رہتے
ہجرتیں اپنے نصیبوں میں لکھی تھیں جاناں
پھر بھلا شہر سخنور میں کہاں تک رہتے
ہوگئیں لغزشیں اس کا بھی مقدر میکش
سارے اوصاف قلندر میں کہاں تک رہتے

غزل

ڈھل گیا دن تو ذرا شام میں فرصت نکلی
پھر چراغوں کو جلانے کی ضرورت نکلی

جب محل کوئی نیا اس نے بنانا چاہا
میرے دل سے کوئی بوسیدہ عمارت نکلی

آج پھر خود کو سجایا ہے بہت مدت میں
آج پھر اس سے ملاقات کی صورت نکلی

گاؤں میں میری حویلی سے بنے کتنے مکاں
گرتی دیوار کے ملبے میں سخاوت نکلی

میری تقدیر میں لکھا تھا بچھڑنا تجھ سے
جو نجومی نے بتائی تھی وہ ہجرت نکلی

میں نے کب چاہا مجھے داد غزل دے کوئی
میرے منہ سے کہاں اشعار کی قیمت نکلی

اس خزانے کو کوئی لوٹنے والا نہ ملا
میرے گھر سے میرے احساس کی دولت نکلی

اس نے بھی عہد وفا خوب نبھایا میکش
اس کے دل سے بھی کہاں میری محبت نکلی

غزل

نگاہ شوق کے سجدے جبیں پہ اترے تھے
یونہی تو وہم و گماں بھی یقیں پہ اترے تھے

پیمبری کا ہمیں فرض تھا ادا کرنا
محبتوں کے صحیفے ہمیں پہ اترے تھے

تمام عمر تو تیرہ شبی رہی لیکن
بس ایک بار یہ جگنو کہیں پہ اترے تھے

گواہی دینی تھی تیرے وجود کی ورنہ
خوشی سے ہم بھی کہاں اس زمیں پہ رہتے تھے

چھوا تھا بس یونہی چندن کے پیڑ کو ایک دن
بہت سے سانپ مری آستیں میں اترے تھے

ایس. ایس. آنند لہر

نقش کی دھند گم ہے آنکھوں میں
دور تک سلسلہ سفر کا ہے

(جاوید انور)

مجھ سے کہا ہوتا۔ گوش برخوب آواز

خان احمد فاروقی (کانپور)

کسی ہنگامی واقعہ یا حادثہ پر کوئی تخلیقی تحریر لکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ کیونکہ واقعہ یا حادثہ لوگوں کے ذہن میں مرتسم ہوتا ہے اور قاری واقعات کا تسلسل اس تخلیق میں تلاش کرنے لگتا ہے اور جہاں کھانچا نظر آیا یا ارتباط منقطع ہوا، اسے تخلیق کار کے کمزور مشاہدہ پر محمول کر دیا جاتا ہے۔ یاد آتا ہے کہ ایسے ہی کسی سوال پر اختر الایمان نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں کسی فوری واقعہ پر لکھنے سے گریز کرتا ہوں۔ اگر کوئی واقعہ ذہن پر اثر قائم کرتا ہے تو میں اس کو بھولنے کی شعوری کوشش کرتا ہوں اور جب وہ واقعہ دس بارہ برسوں کے بعد یاد کے پردے پر ابھرتا ہے تو اس کو نظم کرنے کی کوشش کرتا ہوں تا کہ فوری اثرات نظم پر مرتب نہ ہو سکیں۔

لیکن آنند لہر نے تو ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے کہ اس کو ۱۰۔۱۲ برسوں کیا سینکڑوں برس گزر جانے پر بھی آپ اپنے ذہن سے محو نہیں کر سکتے۔ اور اب تو ہر باشعور انسان یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ شاید ایسے حادثات اس آنی جانی دنیا کے مقدر میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً پہلی اور دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد مختلف ملکوں کے درمیان ہونے والی جنگیں، امریکا کا عراق پر حملہ، بابری مسجد کے انہدام کے بعد خونریز فسادات، W.T.C. کا دلدوز واقعہ، افغانستان کی تباہی اور سب سے آخر میں عراق پر امریکا کا تازہ حملہ اور (امریکا کی ایران پر حملے کی تیاری)۔ ان تباہیوں سے ہمیں سروکار نہیں ہے بس آپ کا ذہن بیدار کرنا مقصود ہے۔

یہ تمام واقعات ایسے ہیں کہ جتنا وقت گزرتا جاتا ہے ان کے بارے میں مزید تفصیلات ملتی جاتی ہیں۔ مثلاً دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ہوئی تباہی کی تفصیلات دنیا کو چالیس پچاس برس بعد پوری طرح معلوم ہوئیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ آج Information Technology کی یلغار کے باوجود، جب انسانی دنیا جنگ کو براہ راست ملاحظہ کر رہی ہے، عوام سے جنگ کی ۸۰ فی صد تباہی اور ہولناکی کو مخفی رکھا جاتا ہے۔ انسانی زندگیوں کے سفاک سوداگر بس وہ خبریں ہی عام آدمی تک پہنچنے دیتے ہیں کہ جتنی وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں معلوم ہونی چاہیں۔ حالانکہ دیر سویر تمام سفاکیاں سامنے آ ہی جاتی ہیں۔

جب حالات اتنے سنگین ہوں تو فنکار اپنے احساسات و جذبات کو کب تک معطل رکھ سکتا ہے۔ وہ قطعی ان کو بھلانے کی شعوری کوشش نہیں کر سکتا بلکہ حالات کی شدت اور سنگینی کو عوام تک پہنچانے کے لیے خون میں انگلیاں ڈبو لیتا ہے۔

آنند لہر کا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' پڑھتے ہوئے فنکار کی بے چینی اور کرب کا شدید احساس ہوا لیکن اس بے چینی کی بنیاد صداقت اور ہمہ گیر انسانی جذبہ ہے۔ ناول کی اختتامی سطور میں یہ انسانی جذبہ کس شدید کرب کے ساتھ

نمایاں ہوا ہے۔

''ایک آدمی کے پاس بہت زہریلے ہتھیار تھے۔ وہ اس دنیا کو بالکل تباہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے مارنے کے لیے ہی یہ سب ہوا۔

ہاں..... ہاں صرف ایک آدمی کو مارنے کے لیے۔

ایک آدمی کو مارنے کے لیے یہ زمین تباہ کی گئی..... یہ ٹینک چلائے گئے..... ہوائی جہازوں سے بم گرائے گئے۔ رشتے ختم کیے گئے۔ لگتا ہے انسانی عقل جانوروں سے بھی کم ہوگئی۔

وہ کیسے؟

جان نے پوچھا۔

''مجھ سے کہا ہوتا'' میں چپ چاپ آتا، اسے ڈنک مار کر چلا آتا۔'' سانپ نے کہا۔

اور زمین بچ جاتی۔''

ایک روایت کے مطابق سانپ باغ جنت سے آدم اور حوا کو نکلوانے کا باعث بنا۔ یعنی پہلے انسان کی پہلی رسوائی کا سبب۔ آج وہی سانپ انسان کے ذریعے کی گئی تباہیوں پر کہتا ہے کہ ''مجھ سے کہا ہوتا'' تا کہ یہ زمین، یہ پیارا خوبصورت انسان تباہی اور بربادی سے بچ جاتا۔

ناول کسی ایک جنگ کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ ماضی اور مستقبل کی تمام جنگوں سے ایک رشتہ قائم کرتا ہے اور انسان کی تعمیر میں جو ایک خرابی کی صورت مضمر ہے اس کا آئینہ دار بھی ہے۔

''یہی سچ ہے'' کی فکری صداقت

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

آنند لہر اردو فکشن میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ موجودہ ادبی منظرنامے پر متاثر کرنے والے، اور خوب پسند کیے جانے والے افسانہ نگار، ناول نویس اور ڈرامہ نگار آنند لہر اپنی شناخت مستحکم کر چکے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے ''انحراف''، ''سرحد کے اس پار'' اور ''کورٹ مارشل'' ان کی بے پناہ فکری صلاحیتوں کا روشن سرمایہ ہے۔ ''اگلی عید سے پہلے''، ''سرحدوں کے بیچ'' اور ''مجھ سے کہا ہوتا'' اردو ناول نگاری میں ان کی عمدہ اور کامیاب کاوشوں کی مثال ہے۔ ''نروان'' اور ''تپسوی کون'' ان کی ڈرامہ نگاری کے فنی وفکری برتاؤ کا نمائندہ ہے۔ مذکورہ ادبی سرمایہ کسی بھی ادیب وفن کار کے لیے باعث اطمینان وافتخار ہو سکتا ہے لیکن محترم آنند لہر ہیں کہ ان کا ادبی سفر اسی ذوق و شوق سے جاری وساری ہے۔ جیسے پربت سے کل کل چھل چھل بہتا ہوا دریا میدانی علاقے میں پھیلتا ہی جا رہا ہو۔ انہوں نے اپنے تجربات ومشاہدات سے اردو فکشن کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ ان کا ناول ''یہی سچ ہے'' ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آیا اور سنجیدہ ادبی حلقے میں پسند کیا جا رہا ہے۔

''یہی سچ ہے'' آج کے تناظر میں پاپ اور پن سے نبرد آزما حالات کو آئینہ کرتا ہوا سچ کی تلاش وجستجو کا حقیقی پہلو ہے۔ ناول کی کہانی شیو، شنکر اور کوشل کے گرد گھومتی ہے جس میں ان کا کنبہ بھی شامل ہے۔ اس کہانی میں کوشل کو اپنی ایمانداری پر تکبر ہے اور وہ اپنی ایمانداری موقع بے موقع لوگوں پر تھوپتا بھی ہے اور اس کو دکھاتا بھی ہے۔ یہاں تک کہ انہیں ایمانداری کا رعب جماتے ہوئے اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے۔ طلاق کے بعد اس کو ساوتری (بیوی) کی کمی کا احساس تو ہے مگر وہی ایمانداری کا دکھاوا اس کی زندگی کی پہچان ہے۔ وہ اپنے بیٹے پر بھی جج ہونے کا سکہ جماتا ہوا نظر آتا ہے۔ شیو رشوت کے سہارے اپنے بال بچوں کو بہتر مستقبل دینے میں جٹا ہوا ہے اور کامیاب بھی ہے۔ شنکر اپنی ایمانداری کی وجہ سے تنگ دستی کی زندگی گذار رہا ہے۔ اس کے یہاں غربت وافلاس ہے، اس کے بچے ناکام ہیں اور بیوی پریشان حال۔ یہاں ایمانداری اور رشوت ایک ہی خاندان میں کشمکش کی صورت حال پیدا کیے ہوئے ہے۔ یہی کشمکش بسا اوقات فکری مقابلہ آرائی کی نوبت ناول کا حصہ ہے۔ ان جاندار کرداروں کے ساتھ ساتھ گوپال داس، دھرم پال، نام دیو، سریش، رمیش، ترسیم وغیرہ نے اپنے افعال واقوال سے اپنی موجودگی کو پرقوت بنایا ہے۔ اس ناول کا ایک اہم کردار ''دھرم پال'' ہے، جس کے قول وفعل میں وہ توانائی ہے جس سے ناول کا موضوع راہ پا رہا ہے۔ مجھے لگا یہ ایک ایسا ٹول ہے جس سے ناول نگار نے اپنے اندرونی جذبات واحساسات کو مکالمہ بنایا ہے۔ زندگی کے رموز وفلسفہ دھرم پال کی زبان سے ادا ہو کر قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

اس ناول کو پڑھتے ہوئے انسانی زندگی، مذہب، نظریہ اور آج کے حالات کی جو سچائی جملوں میں بیان

ہوئے ہیں وہ نہ صرف کہانی کا حصہ ہیں بلکہ فکر کی نئی راہ کا سفر بھی ہے۔ چند جملوں پر آپ بھی غور کیجیے:

"..... یہ محکمہ، یہ قانون، یہ سماج انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ قدرت نے کسی پھول پر نہیں لکھا کہ کون سا پھول کون شخص توڑے۔ کون سا بدن کون چھوئے۔ کن بانہوں کو کون چوڑیاں پہنائے۔ کن مندروں میں کون پوجا کرے۔ یہ پاپ اور پن کے جھگڑے تو انسان کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔" (ص ۲۷)

"..... اصل میں انسان کا دل ہی حکومت کرتا ہے۔ جب انسان کا دل خوش ہوتا ہے تو اسے ہر چیز اچھی لگتی ہے اور جب دل اداس ہوتا ہے تو کوئی بھی چیز اسے اچھی نہیں لگتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات انسان کے دل کے اندر بسی ہوئی ہے۔" (ص ۳۸)

"..... کچھ لوگ اپنے حسد کو چھپانے کے لیے دھرم کا سہارا لیتے ہیں۔ بات کو چھپانے کے لیے اصولوں پر چلنے کی بات کرتے ہیں مگر ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا ہے۔ مقصد شکست کو چھپانا ہوتا ہے۔" (ص ۱۳۳)

کرپشن کے اس دور میں ایمانداری کا شیوہ اپنانے والے حضرات کی نمائندگی شنکر کر رہا ہے اور رشوت موقع پرستی کے اصولوں پر خوش حال زندگی کے تانے بانے بنتے ہوئے لوگ شیو کے کردار میں سما گئے ہیں۔ ایک شنکر ہے جو ایمانداری کا امرت پانی کرتا ہوا مذہب میں سکون تلاش کرتا ہے اور اصولوں کی کامیابی کی مثالیں اور توضیحات بھی پیش کرتا ہے۔ شیو ہے جو رشوت کو پاپ تو سمجھتا ہے مگر اس کی ضرورت اور اپنے تابناک مستقبل کے لیے حاصل کرنے سے گریز نہیں کرتا ہے۔ دونوں کردار کی نفسیات کی گرہ کشائی میں ناول نگار کامیاب ہیں۔ دونوں کے خصائل، عادات و اطوار پوری طرح قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ دونوں کے گھریلو حالات بھی منعکس ہوکر رائے قائم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔

شیو کی بیوی نرملا کی قربانی سے ناول میں تجسس و حیرت کا پہلو نکلتا ہے۔ اس نے بیٹے کو انجینئرنگ میں داخلہ کی خاطر اپنی عزت قربان کردی۔ اسے لعن طعن بھی کیا گیا مگر اس کو اطمینان ہے وہ اپنے بیٹے کے کام آئی۔ ناگپال کی بیوی شانتی اپنے شوہر کی خواہش پوری کرنے کے لیے نام دیو کے وحشیانہ جنسی فعل کو برداشت کرتی ہے اور خوش ہوتی ہے۔ یہ ناول یقیناً اس کڑوی سچائی کا روپ ہے جس کا چہرہ لفظوں میں دیکھ کر آج کی زندگی سے نفرت ہونے لگتی ہے مگر زندگی ہے تو یہ تمام سچائیاں روپ بدل بدل کر ضرور سامنے ہوں گی۔ اس ناول کے فکری درون سے اخذ چند اقتباسات دیکھیے:

"جو گیانی ہے وہ کرم کرتا ہے اور جو کرم کرتا ہے وہ بھوکا نہیں مرتا۔ اس کی روح نہ کبھی بھوکی رہتی ہے اور نہ پیاسی، جو گیانی ہے وہ کرم کرتا ہے، کرم سے گیان اور گیانی سے کرم کرنا ہی سنیاس ہے اور اس کے پھل کو تیاگنا ہی تیاگ ہے۔" (ص ۸۸)

"..... گیان نہ اس قدر روشنی دیتا ہے کہ تم کچھ نہ دیکھ سکو اور نہ ہی اس قدر

اندھیرا دیتا ہے کہ تمہیں کچھ نظر نہ آسکے۔ جب باہر اندھیرا ہوتا ہے تو گیان اس کے اندر چھپی ہوئی روشنی کو ظاہر کرتا ہے اور جب باہر روشنی ہو تو علم اس کے اندر بسے ہوئے اندھیرے کو جان لیتا ہے، یہی بات ہے کہ گیان اپنے راستے سے نہیں بھٹکتا۔'' (ص ۸۹)

''.....عورت آخر عورت ہے چاہے اس پر کتنا ظلم کیوں نہ ہو، پگھل جاتی ہے اور پگھل کر ہی عورت بدنام ہوتی ہے۔ کئی بار رحم میں اور کئی بار محبت میں آکر اپنا بدن دوسرے کے حوالے کر دیتی ہے۔'' (ص ۱۱۲)

''....(ایشور) کائنات کا شعور ہے، جو پیدا بھی ہوتا رہتا ہے، جیتا بھی رہتا ہے اور مرتا بھی رہتا ہے۔ اس کا کوئی وجود نہیں مگر اس نے اتنی بڑی کائنات کو جنم دیا ہے جو خاموش ہے لیکن لفظ پیدا کرتا رہتا ہے، جو ساکت ہے مگر ہر حرکت کا کارن ہے۔'' (ص ۱۴۰)

آنند لہر کا تجربہ ومشاہدہ عمیق ہے۔ انہیں ناول کے فن پر دسترس ہے۔ اس کا خلاقانہ ذہن نئے موضوعات کو فن کے سانچے میں ڈھالنے کے قابل استطاعت رکھتا ہے۔ جناب فدا کشتواڑی نے بجا طور پر لکھا ہے:

''عصری حسیت، خوشگوار لسانی تجربات، احساس و ادراک کی صورت گری اور جذبات کی پیش کش میں آنند لہر نے اپنی الگ راہ بنائی ہے جو ان کی انفرادیت شناخت کی ضامن ہے۔'' (آنند لہر شخصیت اور فن مرتبہ فدا کشتواڑی ص ۹)

ناول کا اختتام بھی متاثر کن ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ناول کو سمیٹتا ہوا یہ اختتامیہ آنند لہر کی بے پناہ فکری وتخلیقی صلاحیت کا مظہر ہے۔

''شنکر بھگوان کی تلاش میں تپسیا کرنے کے لیے جنگل چلا گیا ہے اور بے حد دکھی ہے۔ شیو اس دنیا میں رہ کر اپنے پاپوں کا پراشچیت کر رہا ہے اور حد سے زیادہ خوش ہے۔ دھرم پال بہت خوش ہے۔ وہ پاپ اور پن کے بندھن سے آزاد ہے۔ ناگپال ایشور کے ڈر سے ڈرا ہوا ہے اور دکھی ہے۔ کوشل کو معلوم ہی نہیں ہے کہ وہ سکھی یا دکھی ہے اور مندر سے گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ کہہ رہی ہے ''یہی سچ ہے''۔

اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر سید احمد قادری نے جس طرح سچ کو اکیرا ہے وہ حق بجانب ہے۔ ان کے مطابق:

''زندگی کے یہ نشیب وفراز، بدلتے وقت اور حالات، شوائد والائم، جذباتی بے کیفی، بے رحم ماحول کی سنگینی، ذات کا درد وکرب، خود غرضی اور استحصال کے تلاطم میں آنند لہر کا یہ ناول عہد جدید کے فلسفہ حیات کو متاثر کیفیات سے ہم کنار کرنے میں کامیاب ہے۔'' (ص ۱۰)

اتنے اچھے، کامیاب اور تازہ کار موضوع کو دامن میں سمیٹے ناول ''یہی سچ ہے'' کے لیے جناب آنند لہر کو مبارک باد۔ دعا ہے ان کے نوک قلم سے اور بھی ناول ہم قارئین کو تسکین کا سامان مہیا کرائیں۔ آمین!

آنند لہر کی ناول نگاری
ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' کی روشنی میں

ولی تاج محلی (آگرہ)

مادر وطن جیسی عزیز شئے کوئی نہیں۔ امن و سلامتی، طمانیت اور سکون ہندوستانی قدیم تہذیب کے اصل اقتدار ہیں۔ جو زندگی کی اساس ہیں۔ خورد و نوش، زبان اور بولیاں، رہن سہن اور لباس کی رنگا رنگی کے باوجود ہماری تہذیب اور ثقافت، زبان و ادب یک رنگ ہیں اور امن آشتی و یکجہتی کے علمبردار ہیں۔

کتنی بڑی اور قابل فخر بات ہے کہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کے نمونے ادب میں بکثرت ملتے ہیں۔ ''اردو'' اور ''ہندی'' جو شورسینی پراکرت زبان کے بطن سے پیدا ہوئی دو بہنیں ہیں۔ ان میں قلم طرازی کرتے وقت نہ کوئی ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان، نہ عیسائی نہ سکھ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندی زبان میں افسانے، کہانیاں، ڈرامے، انشائیے، حمد، نعتیں، منقبت وغیرہ لکھنے کے ساتھ ساتھ اردو کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہندو قلم کاروں نے لیلیٰ اردو کے گیسو سنوارنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے اور اردو کے لیے نا قابل فراموش سرمایہ ثابت ہوئے ہیں۔ اردو کے نامور اور مستند ثقہ ارباب قلم ایسے ایسے برگزیدہ حاملان نقد و بصیرت اس فہرست میں شامل ہیں کہ ہندوستانی یکجہتی کی مثال دنیا میں ملنا مشکل ہے۔ ان فدایان اردو میں منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، برج نارائن چکبست، جگن ناتھ آزاد، اوپندر ناتھ اشک، تلوک چند محروم، رام لعل، گلشن نندہ، دت بھارتی، بھگوان داس اعجاز، جوگندر پال، ستیہ پال آنند، وریندر پٹواری، ڈاکٹر نریش کمار شاد، آنند نارائن ملا، پنڈت آنند موہن گلزار دہلوی، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے نام نامی و اسمائے گرامی کے ساتھ ساتھ جناب آنند لہر بھی اپنے جدید و انفرادی تصنیفات لیے صف اول میں نظر آتے ہیں۔

زیر تبصرہ ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' ان کا نیا ناول نئے علوم میں نیا انداز لیے ہوئے ہے۔ آپ نے گل و بلبل، ہجر و فراق، مرد و زن، عاشق و معشوق اور شراب و شباب کے دائرے سے نکل کر چرند پرند، خاموشی، ہوا، لہریں، آگ، پیڑ کی پتیاں، درختوں کے ویران تنے، زندگی و موت، آہ و فغاں وغیرہ کو سراپا پیکر کی شکل دی ہے۔ خاموشی کو زبان دے کر انسانیت سوز جنگ، بارود، توپوں اور غارت گری سے پیدا شدہ ہولناک ماحول کی ترجمانی کی ہے۔ جب یہ کردار گفتگو کرتے ہیں تو بڑے بڑے مسائل کے حل صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ جناب آنند لہر کی تمام تر تحریریں، ان کے جذبات و احساسات کو نہایت مضبوطی سے قاری کو اپنے کرب میں سمیٹ لیتی ہیں۔ تلخیٔ ذائقہ حیات سے زبان انوکھی ہونے کے باوجود، کیونکہ گفتگو عوام سے ہے، زبان سادہ استعمال کی ہے۔ آنند لہر پختہ فنکار ہیں اس لیے بخوبی

جانتے ہیں کہ علامت واستعارے کے بغیر بھی زبان کو سینے میں اتارا جاسکتا ہے۔

دوسری جانب آنند لہر کمال ہنر مندی سے براہ راست حرب و جنگ کے مناظر کو پیش کرنے سے اپنے دامن کو بچالے گئے ہیں۔ بلکہ جنگ کے بعد جب ''انسانی سسکیاں اور خاموشی مقدر بن جاتی ہے'' سے ناول شروع ہوتا ہے تاکہ جنگ کی مکروہیت کو زیادہ واضح طریقے سے پیش کیا جاسکے اور یہ کراہیت اس وقت شدید نفرت میں تبدیل ہوجاتی ہے جب جنگ کے خاتمے کی وجہ معلوم ہوتی ہے۔

''جنگ اس لیے ختم ہوئی تھی کیونکہ لڑنے والے ختم ہو گئے تھے۔''

خاموشی، سناٹا اور ایسی ہولناک فضا میں.....

اچانک ایک چڑیا وہاں آئی اور خوشی سے پھدکنے لگی۔

یہ بھی لگتا تھا کہ کئی دنوں سے سوئی نہ ہو اور اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہ ہو مگر یہاں پہنچ کر جیسے ایک نئی زندگی اسے ملی ہو۔

سوکھے پتوں کی خاموشی نے اس سے پوچھا، کیا بات ہے کیوں پھدک رہی ہو؟

''کچھ انسان بچ گئے ہیں۔'' چڑیا نے کہا۔

مگر تم کیوں خوش ہو؟

پرندہ ہوں جانتی ہوں کہ انسان کے بغیر دنیا مکمل نہیں ہے۔''

پورا منظر کیسا سہادینے والا ہے۔ جنگ ختم ہوگئی کہ لڑنے والے ختم ہوگئے، لیکن اسی کے ساتھ بدن دریدہ اور مجروح انسانوں کی کراہوں پر، کہ انسان کے اس دنیا میں باقی رہنے کا مبہم احساس، پرندے کو سرشار کیے دے رہا ہے۔ انسان جو اس آنی جانی دنیا میں حرمت وعظمت کا منبع ہے اس کے لیے اس سے عبرت ناک اور کیا ہوسکتا ہے کہ پرندے، اور تو اور درندے اس کی عقل پر ترس کھائیں۔

آنند لہر نے پوری کہانی کا تانا بانا اس طرح بنا ہے کہ قتل وغارت گری کے واقعات کے بغیر ہی جنگ کی تباہی اور ہولناکی سامنے آجائے۔ اور تخلیق کار اس میں کامیاب ہے۔ نہایت سادگی اور خلوص کے ساتھ، مثبت نقطۂ نظر سے آنند لہر نے اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے عصری دنیا کی نہایت موثر انداز میں گرہ کشائی کی ہے۔ پرندے اور درندے بھی انسان کے ذریعہ انسان کی بے حرمتی پر نادم ہیں اور انسان، جس کی آسمانی صحیفے تک قسم کھاتے ہیں اور شہادت طلب کرتے ہیں، وہ انسان بذات خود اپنے ایجاد کیے ہوئے بے پناہ خطرناک ہتھیاروں کے زعم میں اپنی ہی تباہی کے درپے ہے۔

آنند لہر نے زندگی کی خود غرضانہ سفاکیوں کو افسانوی پیرائے میں ناول کی سرشت میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، جس کی گرفت میں لے لیتے ہیں اور پڑھنے والا گھنٹوں ان کے حصار سے باہر نہیں نکل پاتا ہے۔ یہ کسی فنکار کی شخصیت کے لیے معراج کا درجہ رکھتی ہے۔ آنند لہر کی تحریر اور دلکشی آنکھیں بند کر کے بھی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ انسان کو سوچنے پر مجبور کردیتی ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں اور غور فرمائیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''دیکھو جنگ کا انجام.....ہوا ہوا نہ رہی..... پانی پانی نہ رہا۔ انسانی زندگی جیسے ایک فضول چیز ہو۔''

''ہتھیار کی خوبی (خصوصیت) ہے کہ وہ اپنے ہوتے ہوئے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔''

''زندگی کا اصل مقصد جینا اور جینے دینے کا فلسفہ ہے۔''

''انسان اصل میں کسی سے نہیں، اپنے آپ سے ہارا ہے۔''

''یہاں سب ایک دوسرے کا مزاج سمجھ کر جئیں تو جنت میں جانے کی آرزو ختم ہو جائے۔''

''ان مسئلوں میں الجھنے کے بجائے پیار کیے جاؤ کیونکہ زندگی بہت مختصر ہے۔''

''اف.....اف کتنا مجبور ہو گیا ہے انسان کہ اس کے اپنے ہی ہاتھ اس کی تیمارداری نہیں کر سکتے۔''

''آؤ پیار کریں۔ یہ بھول کر کہ ماضی میں کیا ہوا۔''

یہ درس، یہ فلسفہ، یہ نصیحت، یہ سچائی.....یہ بیباکی.....یہ حقیقت.....یہ انداز بیان کسی انسان کا ہو ہی نہیں سکتا۔ ضرور کوئی فرشتہ کوئی دیوتا یا اوتار، کرشن یا رام یا پھر رحیم، کوئی مہاپرش، کوئی مہمان آتما ہی یہ اپدیش دے سکتی ہے۔ قرآن، گیتا، گرنتھ صاحب، بائبل میں ہی نہیں، صوفی اور درویش بھی یہی اپدیش دیتے ہیں مگر آنند لہر نے جس انداز میں، ناول کی شکل میں یہ سچائی بیان کی ہے وہ ان کی برسوں کی تپسیا، عبادت، خلوص نیت اور انسان دوستی کا پیکر سراپا ہے۔ اس قدر رشتہ و سہل زبان جو عام قاری کے دل و دماغ میں اتر جاتی ہے۔

''مجھ سے کہا ہوتا'' آنند لہر کا نیا ناول یقیناً اردو ادب کے لیے ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اور یہی نہیں یہ ناول آنند لہر صاحب کا صف اول کے ناول نگاروں میں شمولیت کا سبب بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلم کو اور روانی دے اور لمبی عمر دے۔ آمین!

آنند لہر۔ ایک ناقابل فراموش افسانہ نگار

ڈاکٹر خان حفیظ (کانپور)

ویسے تو اردو ادب کے افق پر لاتعداد ستارے درخشاں ہیں جو اپنی خصوصیت اور انفرادیت کے باعث منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انھیں کے درمیان ایک تابناک ستارہ روشن ہے۔ اس ستارہ کا نام آنند لہر ہے۔ ان کے تمام نثری ذخیرے کو دیکھنے اوران کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے تقریباً ہر صنف پر قلم اٹھایا ہے۔ افسانوں کے علاوہ ناول، ڈرامہ اور شاعری سب پر طبع آزمائی کی ہے۔ اپنے مخصوص لب ولہجہ، منفرد رنگ وآہنگ اور خد وخال سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے فن کا اختصاص یہ ہے کہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو انتہائی سنجیدگی ومتانت سے پیش کرتے ہیں۔ انفرادی شان رکھتے ہیں جو تفکر وتدبر کی دعوت دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے ساتھ مکمل انصاف اور اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ زبان وبیان کے وسیع اور ناہموار شاہراہ پر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، ساتھ ہی سفر کے دوران خوبصورت الفاظ کے سنگ بھی نصب کرتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی نثر کہیں کہیں پر شاعرانہ اور شاطرانہ ہو جاتی ہے۔ اس میں طنز ومزاح کی نمکینی کی آمیزش کر کے اسے لذت آفریں بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی ہے۔ آنند لہر فرسودہ اور پامال موضوعات کو اپنی جدت سے ایک نئی سمت عطا کرتے ہیں۔ اس میں ایک قسم کی ندرت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زمانے کے حالات وتغیرات کے پیش نظر وہ واقعات وحالات کی تراش خراش سے کہانی کی بنت تیار کرتے ہیں اور اس کے بنیادی خیال کو معیاری بنانے کے لیے جگہ جگہ پر طرح طرح کے افکار کے مد وجزر پیدا کرتے ہیں۔ اپنی تحریروں کو گنجلک، غیر معیاری اور عموماً بنانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ عام فہم اور سادہ زبان لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں اور اس میں سیاحی کے دوران علامتوں اور استعاروں کا سہارا لے کر اپنی نثر کو پر کشش اور دلکش بنا دیتے ہیں۔ جس کے ذریعہ قاری کی رسائی اس نکتہ تک آسانی سے ہو جاتی ہے جہاں سے آنند لہر کلام کرتے نظر آتے ہیں۔

انھوں نے اپنے افسانوں اور ڈراموں میں زیادہ تر سیاسی چالبازیوں اور سماجی ناہمواریوں کو اپنا موضوع بنایا ہے بعد ازاں نہایت دل سوزی سے اس پر تنقید اور تبصرہ بھی کرتے ہیں اور اس کے دامن میں پوشیدہ خامیوں و برائیوں کو نہایت چابکدستی وہنر مندی سے طشت ازبام کرتے ہیں۔ اس وقت نہ وہ نعرہ بازی کرتے ہیں نہ ہی مبلغ بننے کی سعی کرتے ہیں بلکہ اپنی ساری باتیں اشاروں کنایوں میں کہہ کر مثبت اور منفی پہلوؤں پر غور وخوض کرنے کی طرف رغبت کرتے ہیں۔ جس سے ان کی فنکارانہ ذہنیت اور دردمندانہ احساس کا سراغ ملتا ہے گو کہ یہ ساری باتیں ناولوں (سرحد کے بیچ، کل عید سے پہلے) میں جس میں یاد ماضی کے کرب واضمحلال کی درد بھری بلاخیز داستان کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کے افسانوں (انحراف، سرحد کے اس پاس) اور ڈراموں (نروان، تپسوی کون، سرحدیں) میں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ اس میں مخصوص انفرادیت کے ساتھ ہمہ گیریت کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اپنی سادہ اور سلیس نثر کی پرتوں کو کھول کر اس میں ربط و توازن برقرار رکھتے ہیں تو ان کا مقام بہت بلند ہو جاتا ہے۔ جس وقت وہ کرداروں کی زبان سے قاری سے ہم کلام ہوتے ہیں تو مکالموں میں ایسی چاشنی اور دلگیری پیدا کرتے ہیں کہ دل و دماغ پر ایک عجیب منظر چھا جاتا ہے۔ اس وقت ان کا مشاہدہ اور عمیق ہو جاتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب آنند لہر ناقد ادب کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں اور اس سحر کے تاثر میں وہ کہنے اور لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آنند لہر صف اول کے افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور ناول نگار ہیں۔

مسعود صدیقی مسعودؔ

غزل

ذرے ذرے میں تجھے انجمن آرا دیکھا
قطرے قطرے میں ترے نور کا دریا دیکھا
عالم عشق کا دستور نرالا دیکھا
شمع پروانے کو اور قیس کو لیلیٰ دیکھا
عشق ہر ذرہ ہستی میں نہاں ہے اے دوست!
تو نے گلزار میں بلبل ہی کو شیدا دیکھا
طور پر حضرت موسیٰ کو جو آیا تھا نظر
ہم نے وہ جلوہ ہر اک رنگ میں ہر جا دیکھا
زلف جاناں نظر آئی مجھے گھنگھور گھٹا
میکدہ باغ کو اور لالے کو مینا دیکھا
ڈال دی جس پہ اچٹتی سی نظر ظالم نے
مرغ بسمل نے بھی پھر اس کا تڑپنا دیکھا
موج ہر رنگ میں بے تاب ہے ساحل کے لیے
گرچہ ہر قطرے کو طوفان سراپا دیکھا
وہ بشر اپنے کیے پر جو پشیمان ہوا
رحمتوں میں تیری سب نے اسے ڈوبا دیکھا
مجھ کو دیوانہ سمجھتے ہیں زمانے والے
نرگس مست کا تیری یہ کرشمہ دیکھا
جو گیا در سے تیرے پائی نہ اس نے منزل
در بدر اس کو بھٹکتے ہوئے رسوا دیکھا
پھول بن کر چمنستان میں جو مہکا مسعودؔ
دیدۂ بغض و حسد میں اسے کانٹا دیکھا

غزل

لہو کے ایک قطرے کے سوا کیا
یہ دل کیا اور اس کا مدعا کیا
جبیں جب تک نہ وہ نقش قدم پر
جبیں سائی میں، سجدوں میں مزا کیا
وفا ہی جب نہیں دنیا میں باقی
تو پھر اے ہم نشیں ذکر وفا کیا
محبت پر کسی کا بس نہیں ہے
میری تقصیر کیا، تیری خطا کیا
اٹھیں ہیں اودی اودی سی گھٹائیں
مرے ساقی کو پھر رحم آگیا کیا
ہزاروں ہیں محبت میں پریشاں
ستم ہے یہ روا کیا ناروا کیا
تقید سے نکل کر ڈھونڈو ان کو
تعین کیا اور اس کی انتہا کیا
صدائے چنگ و نے سے دل کو بہلا
دل نالۂ سرا کیا اور نوا کیا
محبت اور ان کافر دلوں سے
ارے مسعودؔ تجھ کو ہوگیا کیا؟

شمارہ ۶، ۷ کے بعد کی ادبی سرگرمیاں

جاوید انور آل انڈیا انٹلکچول پیس کمیٹی (بریلی) کی جانب سے اردو کی خدمت کے لیے ایوارڈ قبول کرتے ہوئے
(بریلی)

جاوید انور، شان الرحمٰن اور شوکت حیات
(پٹنہ)

جاوید انور، شان الرحمٰن، شمیم قاسمی اور عبید کمال
(پٹنہ)

شمارہ ۶، ۷ کے بعد کی ادبی سرگرمیاں

جاوید انور اور معصوم عزیز کاظمی (پٹنہ)

جاوید انور اور انیس انصاری (لکھنؤ)

آسنسول کے ایک مشاعرے میں شرکت کرتے ہوئے (آسنسول)

شمارہ ۶، ۷ کے بعد کی ادبی سرگرمیاں

جاوید انور، خورشید اکبر اور امام اعظم
(سمستی پور)

جاوید انور اور رشید فانی
(جموں)

جاوید انور اور حامدی کاشمیری
(سری نگر)

شمارہ ۶، ۷ کے بعد کی ادبی سرگرمیاں

جاوید انور اور سجاد حسین

(سری نگر)

جاوید انور، رفیق راز اور ہمدم کاشمیری

(سری نگر)

جاوید انور اور مشتاق احمد

(پٹنہ)

شمارہ ۶، ۷ کے بعد کی ادبی سرگرمیاں

جموں میں منعقد ایک تقریب میں آنند لہر کے ساتھ جاوید انور اور دیگر

بریلی میں منعقد تقریب میں جاوید انور بسٹ صاحب (وائس چانسلر پنت یونیورسٹی) اور دیگر

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی ایک تقریب میں جاوید انور کلام سناتے ہوئے
(نئی دلی)

شمارہ ۶، ۷ کے بعد کی ادبی سرگرمیاں

ادبی کنج کی جانب سے استقبالیہ پروگرام میں
جاوید انور اور شعرائے جموں

جاوید انور اور سجاد حسین
(نئی دہلی)

جاوید انور اور آنند لہر
(چنڈی گڑھ)

عبدالاحد سازؔ
ممبئی

قطعات

نکہت سی نظر پہ چھا رہی ہے
پر نور ہوا سی آ رہی ہے
ہے یہ تری دید کا ترنم؛
یا روشنی گنگنا رہی ہے

☆

لمحوں کی لطیف جنبشوں کی
لہروں میں حیات بہہ رہی ہے
تو محو خرام ناز ہے یا
فطرت کوئی بات کہہ رہی ہے

☆

صبح کرنوں نے یوں سمند کی
نرم موجوں میں بن رکھا ہے جال
بکھرے لمحوں میں منعکس جیسے
بیتی صدیوں کا پر فریب جمال

☆

زمزمہ بار طائران چمن
شبنم آلود شاخساروں پر
نرم رو سیل نغمۂ ہستی
ساز فطرت کے سبز تاروں پر

شاعر علی شاعرؔ
پاکستان

تروینیاں

ساون آیا، بارش برسی
جل تھل ہوگئی ساری دھرتی
من کا آنگن خشک پڑا ہے

ایک کبوتر چھت پر میری
دانہ چگنے آ بیٹھا ہے
پیٹ کی خاطر جال نہ دیکھا

جب بھی اکیلا ہوتا ہوں میں
یاد کو اوڑھ کے سوتا ہوں میں
آنکھ کھلے تو تم آجاؤ

فصل بہاراں کے آنے پر
سارے پرندے خوش ہیں یارو!
من کا پنچھی ناخوش کیوں ہے

چھوڑ گیا ہے کوئی مجھ کو
توڑ گیا ہے دل کا شیشہ
کوئی بتائے کیوں زندہ ہوں

دن بھر تنہا رہتا ہوں میں
کچھ نہ زباں سے کہتا ہوں میں
حالِ دل وہ جانا کیسے

خوشتر مکرانوی

مکرانہ

ھائیکو

صرف بندہ تخت تک
اس سے آگے کے لیے محتاج ہے
کیا ہے تاج و تخت تک

قرآں کی آواز سن
حکم سے گویا ہوا کرتا رسول
خامہ والے راز سن

ترے لکھن کی صدا
فکرو احساسات کا وجدان ہے
ہے جو ہی اچھا برا

زندگی بے نور ہے
سانس مدھم تیز تر ہیں رات دن
روشنی مجبور ہے

صاف ستھرے کام کر
زیست کی خوشتر دعا پھولے پھلے
بعد مردن نام کر

جاوید انور

وارانسی

محسن اکبر چلا گیا

(والد ماجد الحاج فیاض آمری مرحوم کی وفات پر پسر عزیز الحاج اللہ بخش آمری کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے)

جس نے خدائے پاک سے ہر لمحہ کی دعا
جس کی دعا ہی میرا سراپا وجود تھا
میں جس کی التجاؤں کا امید بھر صلہ
اب میرے بھی وجود کا آخر نشاں ہے کیا
تھی جس کی چھاؤں میں مری تسکین کی ضیاء
میرا شجر، وہ محسن اکبر چلا گیا
جس کے کرم سے میری خزاں میں بہار تھی
جس نے مری خطا پہ کبھی اف تک نہ کی
مایوسیوں میں جس کی تسلی تھی نور سی
جس نے مری حیات کی خاطر ہی زیست جی
تھی جس کی چھاؤں میں مری تسکین کی ضیاء
میرا شجر وہ محسن اکبر چلا گیا
جو عہد طفلؔ میں مرا بنتا تھا راہبر
عہد جوانی جس کی مشقت کا ہے ثمر
بس ہے یہی دعا مری اللہ مختصر
دے دے اسے بہشت میں ایک عالیشان گھر
تھی جس کی چھاؤں میں مری تسکین کی ضیاء
میرا شجر وہ محسن اکبر چلا گیا

اسد اللہ حسینی چکر

امریکا

خوبصورت اگر نہیں ہوتی
وہ بلا میرے سر نہیں ہوگی
ایک شب بھی بغیر جھگڑے کے
اب ہماری بسر نہیں ہوتی
"بور" کرتی ہے سننے والوں کو
جو غزل مختصر نہیں ہوتی
کاٹ کر پھینک دیجیو غالبؔ
زلف گر اس کی سر نہیں ہوتی
مرغ ان کا نہ بانگ دے جب تک
رات اپنی سحر نہیں ہوتی
دختر رز نے ناس کر ڈالا
اب دوا کارگر نہیں ہوتی
شاعروں کے خیال میں یارو
دلبروں کی کمر نہیں ہوتی
دل کے "باٹم" سے جو نکلتی ہے
وہ دعا بے اثر نہیں ہوتی
کچھ کمائی کیا کرو چکر
شاعری سے گذر نہیں ہوتی

جسارت صنف نازک کی وہاں معلوم ہوتی ہے
جہاں بیوی بھی شوہر کی میاں معلوم ہوتی ہے
مری شادی کو پچپن سال کا عرصہ ہوا لیکن
مری بیگم مجھے اب بھی جواں معلوم ہوتی ہے
محبت "ماڈرن" دنیا کا جادوئی تماشا ہے
وہاں ہوتی نہیں بالکل نہیں معلوم ہوتی ہے
اگر گالی بھی دیتی ہے تو اردوئے معلّیٰ میں
مری دلبر کوئی اہل زباں معلوم ہوتی ہے
سوال وصل پر وہ اس طرح گردن ہلاتی ہے
کہ نا معلوم ہوتی ہے نہ ہاں معلوم ہوتی ہے
کسی امریکی دوشیزہ کی قامت کو اگر دیکھو
لٹے سامان کی خالی دکاں معلوم ہوتی ہے
طبیعت "نارمل" ہو تو تبسم "فیس" پر رقصاں
مگر غصے میں وہ آتش فشاں معلوم ہوتی ہے
جنون عشق میں چکر بجھائی کچھ نہیں دیتا
"لور" کو اک ضعیفہ بھی جواں معلوم ہوتی ہے

خالد عرفان

امریکا

اس دن کے لیے

ہم ریاضی داں ہیں اس دن کے لیے
جب بھی رشوت لی، روپے گن کے لیے
افسر اوقاف کا تقویٰ نہ پوچھ
ایک ملین ایک سائن کے لیے
لنچ بھی کرتے ہیں ڈبہ کھول کر
آئے تھے ''یوایس'' میں اس ٹن کے لیے
وہ چڑیلوں سے ڈراتے ہیں ہمیں
''جن'' سے لڑ جاتے ہیں ہم جن کے لیے
(ق)
اس زمیں میں شعر نکلے ہی نہیں
رنگ بھی چھٹر کے ڈیزائن کے لیے
کچھ ردیفیں بھی اکارت ہو گئیں
قافیے سن کے لکھے، گن کے لیے
کچھ نہیں تو یہ ہی مصرع ٹانک دو
جام لے آئے ہیں وائن کے لیے
مصرعۂ مینائی جاں کو آ گیا
ہم نے جھک ماری تھی اس دن کے لیے

چھوارہ دیکھنا

پہلے گیارہ تھے پسر، اس سال بارہ دیکھنا
عشق کے اخبار کا تازہ شمارہ دیکھنا
چونکہ ہم دونوں ہی بوڑھے ہو چکے ہیں اس لیے
میں سہاگن ڈھونڈھتا ہوں تم کنوارا دیکھنا
میں تمہاری لاٹری میں جب نکل آیا تو پھر
اپنی امی سے کہو کیا استخارا دیکھنا
ان کی امی جان میں ان سے زیادہ جان ہے
لذت آلو پس آلو بخارا دیکھنا
ہے کسی طفل مہاجر کی طرح سہما ہوا
خالد عرفان کی شادی کا چھوارا دیکھنا

خوش کلامیاں قلم کاروں کی

کے. ایل. نارنگ ساقی (نئی دہلی)

علامہ اقبالؔ (شیخ محمد اقبال)

ولادت: سیالکوٹ ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء وفات: لاہور ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء

خلافت تحریک کے زمانے میں مولانا محمد علی اقبالؔ کے پاس آئے اور لعنت ملامت کرتے ہوئے بولے۔ ''ظالم تم نے لوگوں کو گرما کر ان کی زندگی میں ہیجان برپا کردیا ہے۔ خود کسی کام میں حصہ نہیں لیتے۔'' اس پر اقبالؔ نے جواب دیا ''تم بالکل بے سمجھ ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں تو قوم کا قوال ہوں۔ اگر قوال خود وجد میں آ کر جھومنے لگے تو قوالی ہی ختم ہو جائے گی۔''

☆☆☆

تاجورؔ نجیب آبادی (احسان اللہ خاں)

ولادت: نینی تال ۱۸۹۴ء وفات: لاہور، ۳۰ رجنوری ۱۹۵۱ء

علامہ تاجورؔ نجیب آبادی بڑے تن و توش کے بزرگ تھے۔ ایک دن انھوں نے دیال سنگھ کالج سے نکلتے ہوئے خالی تانگہ والے کو آواز دی اور کوچوان سے پوچھا:

''انارکلی تک جانے کے کتنے پیسے لوگے؟'' ''سالم تانگا ہوگا جناب؟'' اس نے جواب دیا۔

''ہاں ہاں۔ میں کرایہ پوچھ رہا ہوں۔'' ''ایک روپیہ حضور!''

تاجور صاحب نے اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، بارہ آنے، یہی ہم روزانہ دیتے ہیں۔''

کوچوان نے سواری کے موٹے تازے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا'' چلئے یہی سہی مہربان! لیکن ذرا گھوڑے کی نظر بچا کر پچھلی طرف سے اگلی سیٹ پر آجایئے۔ اس بے زبان کو کہیں اعتراض نہ ہو۔''

☆☆☆

جگن ناتھ آزادؔ

ولادت: عیسیٰ خیل، ضلع میانوالی، ۵ ردسمبر ۱۹۱۸ء وفات: دہلی، ۲۴ رجولائی ۲۰۰۴ء

اٹلانٹا میں جگن ناتھ آزادؔ، محسنؔ بھوپالی اور حمایت علی شاعرؔ اسٹون فاؤنٹین دیکھنے نکلے اور وہاں تصویریں لینے لگے۔ حمایت علی شاعرؔ نے تصویر لیتے ہوئے کہا کہ کیمرہ تصویر تو لے گا، لیکن ہے پرانا۔ آزادؔ نے برجستہ کہا ''ہمیں کون سا خریدنا ہے۔''

☆☆☆

جواہر لال نہرو

ولادت: الہ آباد، ۱۴ر نومبر ۱۸۸۹ء وفات: دلی، ۲۷ر مئی ۱۹۶۴ء

پنڈت جواہر لال نہرو لندن میں انگریزی کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب برنارڈ شا سے ملے۔ باہر نکلنے پر ایک انگریزی نامہ نگار نے ان سے پوچھا "برنارڈ شا سے آپ کی کیا گفتگو ہوئی۔" پنڈت جی نے کہا: "کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی۔ میں نے ان کی بکواس سنی، انھوں نے میری۔"

☆☆☆

وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اندور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک عورتیں ملک کی تعمیر میں حصہ نہ لیں۔ میں پردے کو پنجرہ تصور کرتا ہوں اور جب میں اپنی کسی بہن کو پنجرے میں بند دیکھتا ہوں تو میرا خون کھول جاتا ہے۔ اس پر مولویوں نے فتویٰ دیا کہ آپ نے سن لیا آپ کے وزیر اعظم کا خون کس پر کھولتا ہے۔ فلمی بیساؤں پر نہیں۔ تھیٹر والیوں پر نہیں، گانے بجانے والیوں پر نہیں، ان کا خون کھولتا ہے تو ان بیچاریوں پر جو اپنی عفت اور ناموس کی خاطر اب تک حجاب اور نقاب کی پابند ہیں۔

☆☆☆

خلیق انجم (خلیق احمد خاں)

ولادت: دہلی، ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۵ء

خلیق انجم ہندوستانی ادیبوں کے وفد کے ساتھ پاکستان میں "موہن جوداڑو" دیکھنے کے لیے گئے۔ ماہر آثار قدیمہ نے ایک کھنڈر کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ کبھی یہاں ایک مندر تھا۔ خلیق نے ساتھ کھڑی مسلم خاتون کے کان میں کہا۔ "دیکھئے مندر تو بنا دیا مسجد نہیں بنائی، یہ تو کھلا تعصب ہے۔"

☆☆☆

دلیپ سنگھ

ولادت: گوجرانوالہ، ۲ر جنوری ۱۹۳۲ء وفات: دہلی، ۱۸ر اگست ۱۹۹۶ء

دلیپ سنگھ نے ناروے جاتے وقت بیوی سے پوچھا کہ تمہارے لیے کیا لاؤں؟ بیوی کہا نے۔ "کوئی چھوٹی سی چیز سجاوٹ کی لے آنا۔" اس پر دلیپ نے پوچھا۔ "تمہیں چھوٹی چیزوں کا شوق کیوں ہے؟" بیوی نے دلیپ سنگھ کے پانچ فٹ، تین انچ قد کو بغور دیکھتے ہوئے کہا: "اگر چھوٹی چیزوں کا شوق نہ ہوتا تو تم سے شادی کیوں کرتی؟"

☆☆☆

ھائی وے

انیس رفیع (کولکاتہ)

پٹرول کی قیمت بڑھ چکی تھی۔ ہائیوے(High way) پر گاڑیوں کی رفتار Speed-limit پھلانگ کر اس بڑھتی ہوئی قیمت کو Neutralise کرنے کے درپے تھی۔ Speed اور Fuel-economy ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ اپنا موپڈ (Moped) جو بہر حال قیمت کے گذشتہ برسوں میں اضافے کی پیداوار تھا، اب مہنہ تکو ہو رہا تھا۔ موٹر سائیکل گھٹ کر Moped بن گئی تھی۔ اب کیا بنے۔ رفتار بھی نہیں بڑھ سکتی تھی اب تو اگلے ماڈل سے ہی کوئی امید رکھی جاسکتی ہے۔

تو پٹرول کی قیمت آگے آگے اور اپنا یہ Moped اس کے پیچھے پیچھے۔ کیا فائدہ اب اس موپڈ کا۔ جیب میں انگلی پھرائی تو پایا اسے جوں کا توں۔ ابھی اسی ادھیڑ بن میں ہی تھا کہ سفید رنگ کی ہائی اسپیڈ موٹر کار ایک، کتے کو کچلتی ہوئی ژن سے نکل گئی۔ کتے کی ادھوری چیخ میری سماعت سے ٹکرائی اور میرا موپڈ بریک لگائے بغیر ہی ٹھہر گیا۔ کتا جانکنی کے آخری مرحلے میں تھا۔ ہائی وے پر فرانٹے بھرتی گاڑیاں اس جانکنی کے منظر کو نگلنے کے لیے، مگر کوئی تو بچ ہی جاتا ہے۔ گواہی کے لیے۔ پر آج میں اور میرا یہ موپڈ، بے وجہ فالتو سا، پٹرول کی قیمت اور بڑھی تو!

کتا بیچ سڑک پر ٹھنڈا اور بے جان پڑا تھا۔ ایک ذرا آنکھ جھپکی۔ دوسرے لمحے، دیکھا کتے کی لاش Toss کرتی دور جا کر چت ہوگئی۔ اپنا موپڈ اک ذرا لڑکھڑایا۔ کئی فرلانگ آگے آکر ٹھٹھک گیا۔ کتے کی چاروں ٹانگیں آسمان کی طرف اور زبان باہر لٹکی ہوئی تھی۔ کھوپڑی ادھ کھلی، خون بھبھکاتی ہوئی۔ ایک آنکھ سے بھوں غائب دوسری کی گولی چٹخی ہوئی۔ دم میں ہلکی ہلکی جنبش اب بھی تھی۔ پیٹ کے اوپر کی چمڑی ادھڑ چکی تھی۔ ابھی اتنا ہی دیکھا تھا کہ ایک تیز رفتار گاڑی نے دوسری سمت سے ایک ٹھوکر لگائی۔ لاش بہت پیچھے Roll کرگئی۔ پھر اس طرف سے کسی نے ٹھوکر ماری، دیکھا کتے کا مسخ شدہ جسم میرے موپڈ سے کئی گز آگے جا پڑا تھا۔ ان ٹھوکروں کے درمیان کتے کی لاش جھولے کی طرح پینگ کھا رہی تھی۔ لاش کی یہ پینگ موپڈ کی رفتار کو مات دینے پر تلی ہوئی تھی۔ پٹرول کی قیمت اور سڑک کے مردے کی رفتار اس سست رو موپڈ سے آگے لپک رہی تھی۔ کیوں ہو رہا ہے ایسا۔ کاہے کو بنتی ہیں یہ سست رفتار گاڑیاں۔ ابھی اس سوال کا جواب بھی نہ ڈھونڈ پایا تھا کہ ایک فوجی Heavy Vehicle نے اپنے تیز رفتار چکے جسم پر چڑھا دیئے۔ چکے کتے کی لاش کو روند کر Speed کے نئے آسمان کی طرف بھاگ گئے۔ بچ گیا روندا ہوا کتا۔ خون تار کول نے پی لیا۔ ہڈی چمڑی سڑک پر یوں بچھ گئی جیسے کتے کو نیند آگئی ہو۔ یوں لگ رہا تھا مانو کالی سلیٹ پر چاک سے ایک سوئے ہوئے کتے کی تصویر بنا دی گئی ہو۔ دفتر کو دیر ہو رہی تھی اس لیے مردہ کتے کے خیال کو جھٹک کر موپڈ کو آگے بڑھایا۔

دفتر سے واپسی کا وقت آن پہنچا تھا۔ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہوتا ہے، جس کی واپسی کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ جیسے

آدمی کی واپسی دنیا سے۔ بابو کی واپسی دفتر سے۔ یہ دونوں میرے لیے بڑی اہم ہیں۔ واپسی پر میرا یہ یقین بڑا مستحکم ہے۔ ڈھیر ساری چیزیں ٹوٹ گئیں اپنی اس مختصر اور معمولی زندگی میں۔ مگر میرا یہ واپسی پر یقین ٹھوس ولایتی مٹی کی طرح جم کر بیٹھ گیا ہے کسی کونے میں۔ کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔

دفتر سے واپسی کے لیے میں نے اسٹینڈ سے موپڈ نکالا۔ چھوٹی موٹی گلیوں سے گزرتا پل پار کر کے شاہراہ High way پر آگیا۔ اپنی سست رفتار اس ''ہائی وے'' پر مجھے برابر اجنبی بنائے رکھتی ہے۔ کسی گاڑی کے برابر دوڑ کر ان کے سواروں کے ساتھ Hello یا مسکراہٹ کا تبادلہ نہیں کر سکتا۔ آج موپڈ کی رفتار کچھ زیادہ ہی سست لگ رہی تھی۔ حالانکہ ایکسلیٹر پر پورا دباؤ دے رکھا تھا۔ ژن ژن کرتی کاروں اور گاڑیوں کے علاوہ صرف سناٹا تھا۔ بھیانک سناٹا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا ان چند گھنٹوں کے درمیان۔ گاڑیوں کی رفتار اور بھی دھواں دھار ہو رہی تھی۔ یہ شاہراہ شہر کو ہوائی اڈے سے بھی جوڑتی ہے۔ کسی کارن ہوائی اڈے پر آگمن (Arrival) بڑھ گیا ہوگا۔ کیونکہ الٹی سمت سے گاڑیاں بے تحاشہ بھاگی چلی آرہی تھیں۔ ژن.... ژن.... ژن.... خوف سا دل میں اتر آیا کہ جب جب شہر پر آسمان سے بڑا آسمان ٹوٹتا ہے تو آگمن بڑھ جاتا ہے اور ہائی وے پر گاڑیاں اڑن طشتریاں بن جاتی ہیں۔

ایک بار تو عجیب وغریب اڑن طشتریاں اس شاہراہ پر دیکھی گئی تھیں۔ مگر ہم ان کی ہوا کو بھی نہ پا سکے تھے۔ آج مجھے کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔ کیا ہو گیا تھا شہر میں، کیا ساری مسافتیں آج ہی طے ہونے والی ہیں۔ ضرور کچھ ہو گیا ہے شہر کو۔ آخر مجھے کیوں نہ پتہ چلا۔ سارا دن تو شہر میں ہی تھا۔ شاید اس لیے کہ میرا دفتر شہر کے مرکزی Secrateriat 'Writers Building' میں نہ تھا۔ فائلوں کا یہ قدیم مدفن و مسکن شہر کی تکی اور بے تکی خبروں سے ہر لمحہ گرما گرم رہتا۔ مگر میرا دفتر بھی میرے موپڈ کی طرح ہے۔ شہر کے ایک دور دراز کونے میں Burial Ground Board کا دفتر جہاں کوئی خبر نہیں ہوتی۔ صرف ریکارڈ ہوتا ہے مردوں کا۔ ہوتی ہے نئی پرانی قبروں کی گنتی اور جو قبریں گھروں میں کھد جاتی ہیں ان کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ اس دفتر میں خبریں آتے آتے مردہ ہو جاتی ہیں۔ ٹی۔ وی۔ پر خبریں زندہ ہوتی ہیں۔ گلیمر ہوتا ہے ان میں۔ بھرمار ہوتی ہے خبروں کی اور بے خبری کی بھی۔ دفتر سے روانگی سے قبل بہت ساری خبریں تھیں۔ ہماری آزادی کے ساٹھ سال، ریل ٹکر، شہزادی ڈائنا بعد از مرگ اس کے خفیہ غیر شاہانہ تجاوزات۔ پردہ کشائی.... پٹرول کی قیمت سے اونچی.... کتاب کے مصنف کی مانگ اور!!

اور اس کے بعد تو میں دفتر آگیا تھا۔ جب واپسی کے لیے نکلا تو شہر کچھ رکا رکا سا لگا۔ اچانک کوئی ہڑتال، شہر بند، بنگال بند؟ مگر ہائی وے پر آتے ہی بہت تیز ہو گیا۔ آواگمن کوئی Pilot-car اپنا ہوٹر (Hooter) بجا بجا کر میرے موپڈ کو اوور ٹیک (over take) کرنے کا سگنل دے رہی تھی۔ رفتار کی بلا خیزی وہ تھی جیسے جہاز رن وے پر ٹیل آف کے لیے دوڑ رہا ہے۔ موپڈ میں نے کنارے کر لیا۔ VIP کنوائے (Convoy) چھلاوے کی طرح گزر گئی۔ گاڑیوں کے تیزی سے گھومتے پہیوں نے اپنے پیچھے جو سڑک چھوڑی وہ چمچماتی اور بے داغ تھی۔ حالانکہ آج صبح آس پاس ہی ایک کتا کچل گیا تھا۔ اس کی لاش پہیوں کی رگڑن سے تارکول میں تحلیل ہو گئی تھی۔ میں نے موپڈ کا ایکسلیٹر گھمایا اور دھیرے دھیرے سڑک پکڑ لی۔ ابھی رفتار بہت تیز نہیں ہوئی تھی۔ ایک ذرا آگے بڑھا ہوں گا کہ 'بھوں بھوں' کتے کے بھونکنے کی آواز ملی۔ آس پاس کوئی کتا نہ تھا۔ نظر نیچے سڑک پر پڑی چمچماتی سڑک پر ایک داغ سا نظر آیا جس میں

حرکت تھی۔ کتے کی زبان نہ صرف تحلیل ہونے سے رہ گئی تھی، بلکہ وہ زندہ تھی اور حرکت کر رہی تھی۔ اس آواز نے میرا پیچھا کیا۔ آخر یہ زبان مجھ پر ہی کیوں 'بھوں بھوں' کر رہی ہے۔ سارے آسیب کیا میرے لیے ہیں۔ میں پریتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے ڈر سا لگا۔ بھوں بھوں کی آواز بدستور تھی میں ست رفتار تھا۔ تیل کا دباؤ بڑھا کر میں نے اپنی رفتار کم از کم دوگنی کر لی۔ مجھے خود حیرت تھی۔ موپڈ کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ High Speed پھر Jet Speed پھر Crash۔

اس کے بعد میں کہاں گیا، مجھے نہیں معلوم۔ مگر میرے دفتر کے ریکارڈ میں مرنے والوں میں میرا نام وہ نام ہوگا جس کی کوئی قبر نہیں ہوگی۔ کوئی قبرستان نہیں ہوگا۔ ایک دم بے نشان۔

تو شہر مادر[1] میں یوں چکانی پڑتی ہے قیمت۔ پٹرول کی نہیں اپنے ہونے کی قیمت!!

[1] مدر ٹریسا کا شہر کلکتہ۔

ورطہ

بلراج بخشی (جموں و کشمیر)

نارنگی رنگ کا سورج غیر محسوس طور پر سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا اور سطح پر دکھائی دینے والی ہلکی لہروں کی جگہ اب کناروں پر لگے دیو قد کھمبوں پر ایستادہ روشنیاں پانی میں تیرتی نظر آنے لگی تھیں۔ ماہی گیری کشتیاں ساحل کی جانب واپس آ رہی تھیں۔ حالانکہ یہ کشتیاں یہاں سے کم از کم دس کلومیٹر کی دوری پر لنگر انداز ہوتی تھیں لیکن نہ جانے کبھی کبھی اسے کیوں مچھلیوں کی بو آتی تھی۔ اس وقت بھی ہوا کے ایک خفیف سے جھونکے کے ساتھ اسے مچھلیوں کی ناگوار بو کا احساس ہوا۔ وہ بے ارادہ کھڑکی سے پیچھے ہٹا اور دو قدم چل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

شانو نے میز پر رکھا گلاس اٹھا کر ایک چسکی لی۔ گلاس ہاتھ ہی میں رکھ کر اس نے دوسرے ہاتھ کے ساتھ میز پر رکھے پیکٹ میں سے کسی منجھے ہوئے فنکار کی طرح بہ آسانی سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور پھر لائٹر سے سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور سگریٹ کو ہونٹوں سے نکال کر انگلیوں میں پھنسا لیا۔ اس نے لائٹر میز پر واپس رکھا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ شانو نے اٹھ کر ڈرائنگ روم کی ساری بتیاں جلا دیں اور پھر واپس بیٹھ گیا۔

فلورا اپارٹمنٹس کی تیسری منزل پر واقع یہ دو بیڈروم سوئیٹ ان کی ضروریات کے لحاظ سے ایک خاصی کشادہ رہائش گاہ تھی۔ دراصل یہ علاقہ شہر سے کوئی آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہاں سے وہ دونوں اپنے دفاتر میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں پہنچ سکتے تھے۔ ایک اور خاص بات یہ کہ پانچ منزلوں کی اس عمارت کے ایک گوشے میں ایک اچھا خاصا ڈپارٹمنٹل اسٹور اور ایک بڑھیا سا ریستوراں بھی تھا جہاں واجبی درروں پر کئی اقسام کا اچھا کھانا روم سروس کے ساتھ دستیاب تھا۔

ملحقہ خوابگاہ کا دروازہ کھلا اور شانو نے ادھر دیکھا۔

دروازے کے ہلکے زرد رنگ کے فریم میں بنفشی رنگ کی نائٹی پہنے کھڑی تانیا شعلۂ جوالا نظر آ رہی تھی۔ ہلکے نیلے رنگ کے زیر جامے کے ساتھ قدرے شفاف نائٹی میں سے جھانکتا اس کا سپید و سرخ بدن قیامت خیز تھا اور تازہ ڈرائر کیے ہوئے اس کے لمبے بال ایک سیاہ ہالا بنا کر اس کے سرخی مائل چہرے کو بے پناہ دلکشی عطا کر رہے تھے۔ تانیا نے ایک نظر میں میز کا جائزہ لیا اور پھر لپ اسٹک کی ایک ہلکی سی پرت لیے ہوئے اس کے بھرے بھرے ہونٹ وا ہوئے۔

''بہت بے صبر ہو..... انتظار نہیں کر سکتے تھے؟''

''بہت دیر لگا دی.....'' شانو نے سر سے پاؤں تک اس کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہوئے تعریفی لہجے میں کہا۔

''آج قیامت ڈھانے کا ارادہ ہے کیا؟''

تانیا نے ایک نگاہ غلط انداز سے اسے دیکھا اور تیرتی ہوئی اس کے پاس پہنچی۔ شروع ہی سے شانو اس کی مست خرامی کو چلنے سے زیادہ تیرنے ہی سے تشبیہ دیتا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ شانو نے میز پر رکھا ہوا دوسرا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ تانیا نے ایک گھونٹ بھر کر گلاس اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ شانو نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر آہستہ سے اسے اپنی طرف کھینچ کر اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ چسپاں کیے تو تانیا کے ہاتھ میں پکڑے گلاس میں سے تھوڑی سی وہسکی گر گئی۔

''کیا کرتے ہو.... گلاس چھلک رہا ہے۔''

''اور.... تم جو چھلک رہی ہو....''

''تو پیو نا....''

وہ گلاس میز پر رکھ کر اس سے لپٹ گئی۔ شانو کے ساتھ اس کے جسم پر آوارہ خرامی کرنے لگے۔ دونوں بڑی دیر تک اسی طرح رہے۔ اچانک کال بیل بجی۔

''کون ہے؟'' تانیا نے الگ ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''شاید روم سروس.... تم اندر جاؤ....''

تانیا خوابگاہ میں چلی گئی۔ کال بیل پھر بجی اور شانو نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ریستوراں کا باوردی ویٹر ایک ٹرالی کے پیچھے کھڑا تھا۔ شانو آگے سے ہٹا اور ویٹر ٹرالی کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے میز پر رکھے دو گلاسوں میں سے ایک کے کنارے پر لپ اسٹک کا نشان دیکھا۔ لیکن فلورا اپارٹمنٹس کے ریستوراں کے ویٹر اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ ان اپارٹمنٹس کے مکیں ایک لاکھ ماہوار تک کما لینے والے متوسط طبقے کے پس منظر کے افراد تھے جن میں سے بیشتر کثیر الاقوامی تجارتی کمپنیوں میں اعلیٰ منتظمانہ عہدوں پر فائز تھے اور عالم کاری کی اقتصادی بخششوں سے مستفیض ہو کر طبقۂ بالا کی تقلید میں ایک نئی ثقافت ترتیب دے رہے تھے۔ ویٹر کا چہرا ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا اور وہ پیشہ ورانہ غیر دلچسپی کے ساتھ ٹرالی پر رکھے لوازمات میز پر منتقل کر رہا تھا۔ ان میں بیئر کی دو یخ بستہ بوتلیں بھی تھیں۔

''ڈنر کتنے بجے لیں گے سر؟'' ویٹر نے کام ختم کر کے آہستہ سے پوچھا۔

''ابھی آٹھ بج رہے.... '' شانو نے سامنے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ''دس بجے ٹھیک رہے گا....''

''ویری ویل سر.... دس بجے.... ڈنر فار ٹو.... سر؟''

شانو نے اثبات میں سر ہلایا اور ویٹر چلا گیا۔ دروازے میں چٹخنی لگا کر شانو واپس مڑا اور اونچی آواز میں بولا۔

''آ جاؤ....''

تانیا نے باہر آ کر میز پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔

''میں نے کتنی بار منع کیا ہے کہ ڈیپ فرائیڈ نان ویج مت کھایا کرو....'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم سنتے

ہی نہیں۔ تمہارا وزن پہلے سے کافی بڑھ گیا ہے۔''
''تم بھی کھاؤ.....'' شانو منہ چلاتا ہوا بولا۔
''تھینک یو..... آئی ہیو ٹو واچ مائی فگر.....'' تانیا نے گلاس ختم کر کے اسے بیئر سے بھرا اور ایک سگریٹ سلگایا۔
''چکھ لے لو..... فگر میں واچ کرلوں گا'' شانو نے ایک پلیٹ اس کی طرف سرکائی۔ ''یہ کباب شاندار ہیں۔''
لیکن تانیا نے بھنے کاجوؤں کے دو چار دانوں پر اکتفا کیا اور خاموشی سے بیئر اور سگریٹ پیتی رہی۔
رات کے کھانے کے بعد گیارہ بجے کے قریب جب دونوں بستر نشیں ہوئے تو تانیا کو بانہوں میں لے کر شانو اپنے ہونٹوں سے اس کے رخساروں کی ملاحت جذب کرنے لگا۔ تانیا دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی لیکن کچھ دیر بعد شانو انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے اس کے ہونٹوں اور اس کی سانسوں کی تپش کی تاب نہ لا سکا اور یکبارگی تانیا سے الگ ہو کر اٹھ بیٹھا۔
''کیا ہوا.....'' تانیا نے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ بمشکل اس سے پوچھا۔
''کچھ نہیں..... یونہی..... گرمی لگ رہی تھی.....''
''گرمی.....؟'' تانیا نے حیرت سے کہا ''اے سی میں گرمی؟ مجھے سردی لگ رہی ہے.....اوہو.....آؤ نا.....''
شانو خاموشی سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔
''میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ برش کرنے کے بعد سگریٹ نہ پیا کرو..... گندی بو آتی ہے..... لیکن تم میری کوئی بات بھی نہیں مانتے.....''
ان سنی کرتے ہوئے شانو نے سگریٹ سلگایا اور دو تین گہرے کش لینے کے بعد اس کی طرف دیکھا۔
''آئی ایم ساری ڈارلنگ.....'' شانو نے آہستہ سے کہا۔ ''میں تھک گیا ہوں..... تمہیں پتہ ہے کہ آج چار دنوں کے ٹور کے بعد میں واپس آیا ہوں.....''
تانیا بیڈ پر لیٹے لیٹے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے اٹھی، بیڈ سے نیچے آ کر نائیٹی اتار کر شب خوابی کا گاؤن پہنا اور سگریٹ سلگا کر شانو کی طرف دیکھنے لگی۔ شانو دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔
''آئی ہوپ یو انڈر اسٹینڈ می ڈارلنگ..... میری وہی پرابلم.....'' شانو نے اس کی طرف دیکھے بغیر بے چارگی سے کہا۔
''یس آئی انڈر اسٹینڈ یو.....'' اس نے آہستہ سے کہا لیکن اس کے چہرے کے عضلات درشتی سے تن گئے تھے۔
اور اسی لیے مجھے تم سے عشق ہے ڈارلنگ..... یو آر سو ریزنیبل..... تمہاری یہی بات مجھے اچھی لگتی ہے..... کوئی دوسری عورت ہوتی تو وبال کھڑا کر دیتی، شانو نے سوچا۔
محض سات مہینے پہلے جب وہ اس سے پہلی بار ملا تھا تو ذہنی طور پر کتنا پریشان تھا۔ اس کے باپ نے گھر

سے اسے فون کر کے شادی کے لیے اصرار کرتے ہوئے کہا تھا کہ پینتیس سال کی عمر کسی کو بھی شادی کی مارکیٹ سے باہر کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ پھر اس کے باپ نے اسے تانیا کا موبائل نمبر دے کر اس سے ملنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس کے دوست کی بیٹی ہے اور اسی شہر کی کسی کمپنی میں ہے۔

اور پھر تانیا سے ملاقات طے کرنے کے لیے جب شانو نے فون کیا تو اس نے فلورا اپارٹمنٹس کا پتہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ یہیں آجائے۔ تب وہ سنگل بیڈروم والے فلیٹ میں تھی۔ شام سات بجے شانو نے کال بیل دبائی تو دروازہ فوراً کھل گیا۔

''مسٹر شانو....؟'' تانیا کا لہجہ مترنم تھا۔

شانو نے عادتاً مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تھا اور وہ سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

اور پھر شانو کو تانیا سے متاثر ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ لڑکیاں جو بڑے شہروں کے بڑے تجارتی اداروں میں اپنے ناموس کے تحفظ کے ساتھ اعلیٰ ذمہ داریاں نبھاتی ہیں ان کی اہلیتوں اور صلاحیتوں پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ تعارفی کلمات اور خوش طبعی کے ابتدائی مظاہرے کے بعد دونوں کے بیچ کا رسمی تناؤ بتدریج جاتا رہا۔

''ڈرنکس؟'' تانیا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا؟'' شانو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''میں نے پوچھا... ڈرنکس.....''

''اوہ شیور.... شیور..... اور آپ؟''

''آف کورس..... کیا پئیں گے آپ؟''

''کچھ بھی.... میری کوئی خاص Preferences نہیں ہیں....''

''ٹھیک ہے.... میں دیکھتی ہوں کہ کیا Available ہے....''

اور پھر بہت دیر تک وہ اسے لوازمات کی فراہمی کے لیے ادھر سے ادھر جاتے دیکھتا رہا۔ تانیا آگاہ تھی کہ شانو بڑی دیر سے اس کے سراپے کا جائزہ لے رہا ہے۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ شانو کو لگا جیسے تانیا جان گئی ہو۔ اس نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ لیکن زیادہ دیر اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ اونہہ..... اس نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی.... لڑکیاں ان نظروں کی عادی ہوتی ہیں.... اور..... میرا خیال ہے وہ اسے پسند بھی کرتی ہیں کہ کوئی ان کے حسن کو دیکھے اور سراہے، اس نے سوچا اور اس کی نظریں بے اختیار ہی تانیا کی طرف اٹھ گئیں۔

اس کے گھنے اور چمکدار بال کندھوں سے نیچے تک ترشے ہوئے تھے۔ بیضوی چہرے پر کماندار بھنوؤں کے نیچے گھنی سیاہ پلکوں کے بادامی حصاروں کی حفاظت میں اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے خارج ہونے والی استفہامی شعاعوں میں دیکھنے والے کو کچھ پوچھے بنا ہی لاجواب کر سکنے کی اہلیت صاف نظر آرہی تھی۔ ستواں ناک کے نیچے اس کا دہانہ مختصر تھا لیکن اس کے ہونٹوں کی بناوٹ سے لگتا تھا کہ انہیں سیٹی بجانے کے انداز میں دانستہ سکوڑا گیا ہے جس سے ان پر پڑی ہوئی ہلکی ہلکی عمودی لکیریں لپ اسٹک کی موہوم سی پرت کی اوٹ میں کچھ اور نمایاں ہو کر انگیخت کرتی نظر آرہی تھیں۔ اس کے چھریرے بدن کے باوجود قدرے غیر معمولی طور پر نمایاں اس کے سینے کے ابھار ایک ایسا دعوت

نامہ گستاخی لگ رہے تھے جنہیں شعوری کوشش کے باوجود نظر انداز کرنا اگر ناممکن نہیں تو کافی حد تک مشکل ضرور تھا۔ اس کے انداز خرام کو چلنا نہیں بلکہ تیرنا ہی کہا جا سکتا ہے، اسنے سوچا اور پھر اس کے کولہوں کی بلنت پر شانو کی جان نکلنے لگی۔

''چیئرز..... '' تانیا نے اس کے بالمقابل بیٹھ کر گلاس اس کی جانب سرکاتے ہوئے کہا۔ شانو نے چونک کر گلاس کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں وہ کہاں کھو گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پہ ایک شرمندہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے گلاس اٹھایا۔ تانیا نے اپنے گلاس سے دو چسکیاں لیں، گلاس میز پر رکھا، سگریٹ کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ سلگایا اور منہ سے دھواں نکالتے ہوئے شانو کی طرف دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

''آپ سگریٹ بھی پیتی ہیں؟'' شانو نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں پینا چاہیے.....!''

''نہیں.....میں.....میں نے یونہی کہا..... '' وہ چپ ہو گیا۔

''آپ کو اپنی ہونے والی بیوی کی اچھی یا بری عادتوں کا اندازہ ہو جائے تو اچھا ہوگا'' تانیا نے لمبے اور پتلے سگریٹ سے ایک ہلکا سا کش لیا۔

''آپ واقعی بے مثال ہیں..... ''

''اگر ہم دونوں آپ سے تم پر آجائیں تو ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں آسانی ہوگی.....نہیں؟''

''اوکے.....تانیا.....آئی ایم امپریسڈ.....سچ.....لیکن.....یہ بتاؤ کہ.....تم نے آج تک شادی کیوں نہیں کی؟ خاص طور پر جبکہ تم.....نہ صرف بہت ذہین بلکہ.....بہت خوبصورت بھی ہو..... ''

تانیا کچھ دیر تک سگریٹ اپنی انگلیوں میں گھماتی رہی۔

''ایک تو..... '' وہ چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''ایک تو کیریئر.....اور پھر.....شاید کوئی اپنے ٹیسٹ کا ملا ہی نہ ہو.....لیکن تم نے کیوں نہیں کی..... ''

''میں.....'' شانو نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا، دو تین گہرے کش لیے، گلاس خالی کر کے ایک اور پیگ بنایا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔''

''دیکھو.....تانیا.....Since you have been so honest with me.....میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا.....بات یہ ہے تانیا کہ.....میرے ساتھ ایک پرابلم ہے.....Actually.....'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''پرابلم.....؟'' تانیا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں.....ایک بہت بڑی پرابلم۔''

اب تانیا اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔

''Actually.....تانیا.....میری پرابلم یہ ہے کہ.....کہ..... ''

''ہاں ہاں..... '' تانیا ہمہ تن گوش تھی۔

''میری پرابلم یہ ہے کہ....'' شانو نے تانیا کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے کہا "I am not a one woman man"۔

''میں سمجھی نہیں....'' اس نے حیرت سے کہا۔

''میرے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی تھا تانیا.... کالج میں بھی.... میں.... کسی بھی لڑکی کے ساتھ چار چھ مہینوں سے زیادہ نہیں رہ سکا....'' اس نے گلاس خالی کر کے آگے جھک کر تانیا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''میں بہت جلد اکتا جاتا ہوں تانیا.... جب میں اسے.... یعنی.... میرا مطلب ہے کہ.... یو نو وہاٹ.... جب میں کسی لڑکی کو حاصل کر لیتا ہوں تو.... تو بس.... میں اس سے اوب جاتا ہوں....'' اس کی سانسیں تیز ہو گئیں ''پلیز تانیا.... ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ می.... میں آج تک کسی کے ساتھ مستقل جذباتی تعلقات نہیں بنا سکا.... پتہ نہیں کیوں.... There must be something wrong with me'' وہ ہانپنے لگا۔

ایک لحظہ کے لیے شانو نے تانیا کی آنکھوں میں ایک واضح چمک محسوس کی لیکن وہ اسے کوئی معنی نہ پہنا سکا اور الجھن میں پڑ گیا۔

''تم کچھ کہہ رہے تھے....'' تانیا نے سکوت توڑا۔

''ہاں آں.... بس.... یہی وجہ ہے.... کہ میں خود کو آج تک شادی کے لیے آمادہ نہیں کر سکا.... ا.... و.... ر.... یہ پہلی بار ہے کہ میں نے اس سلسلے میں کسی سے بات کی ہے.... ورنہ.... میں ہمیشہ کوئی وجہ بتائے بنا شادی کی بات ٹالتا رہا.... اور.... آج بھی میں گھر والوں کی ضد کی خاطر تم سے ملنے آیا ہوں....''

شانو نے تانیا کو ایش ٹرے میں سگریٹ مسلتے دیکھا۔ وہ چپ ہو گیا۔ اور پھر جب وہ اس کی طرف مڑی تو وہ بولا۔

''میں.... نہیں جانتا.... کہ میں ایسا کیوں ہوں.... لیکن بس.... میں ایسا ہی ہوں.... میں.... مجھے پتہ ہے کہ.... مجھے شادی کر کے Settle ہو جانا چاہیے.... لیکن.... میں کیا کروں؟.... Are you getting me.... تم مجھے اچھی لگی ہو تانیا.... You have been so honest with me سچ تو یہ ہے کہ میں تم سے شادی کرنا چاہوں گا.... لیکن اب.... تم دیکھ لو.... میں نے اپنا سچ تمہیں بتا دیا.... مجھے امید رکھنی چاہیے کہ تم مجھے سمجھ سکو گی۔ After all..... both of us are professionals''

''ہاں.... Professionals تو ہیں....'' اس نے آہستہ سے کہا اور خاموش ہو گئی۔

''تو.... پھر.... کیا خیال ہے....؟'' بڑی دیر کی خاموشی کے بعد شانو نے پوچھا۔

''خیال....!'' تانیا نے بجھتے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا۔ اس نے میز پر رکھا وہسکی کا گلاس اٹھایا، ایک چسکی لی اور گلاس کو دونوں ہتھیلیوں کے بیچ رکھ کر رول کرنے لگی۔ پھر اس کی آنکھیں میز سے ذرا اوپر کہیں خلا میں معلق ہو گئیں اور وہ واضح طور پر سوچوں کے قعر میں اترتی محسوس ہونے لگی۔ اس کی پلکوں کے جھپکنے کا وقفہ بھی طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہسکی کے گلاس کو رول کر رہے اس کے دونوں ہاتھ اب اس کی آغوش میں ساکت تھے۔ لیکن جذبات سے عاری اس کے چہرے سے قطعی مترشح نہیں ہو رہا تھا کہ اس بظاہر سکوت کے پس پردہ دراصل حالات و امکانات کی عکس

بنی ترکیب وتربیت کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ گہرے انہماک میں تانیا کے چہرے سے تفکرات اور لمحاتی جذبات کی عدم موجودگی اس کے خدوخال کو کلاسیکیت عطا کر رہی تھی جس سے اس کے چہرے کی دلکشی میں تقدس کی آمیزش ہونے لگی۔ معاً شانو کو بدھ کے مجسموں کا لازوال سکوت یاد آگیا۔ اس کی نظریں بلا ارادہ ہی تانیا کے چہرے پر ٹک گئیں۔ کوشش کے باوجود وہ نظریں ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ لیکن تانیا اس سب سے غافل لگ رہی تھی۔ شانو کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس کی غیر ضروری صاف گوئی نے تانیا کو کہیں گہرا صدمہ تو نہیں پہنچا دیا۔ شانو نے سوچا اور اچانک اس پر احساس ندامت طاری ہونے لگا۔ اپنی بات کی ترسیل کے لیے کوئی دوسری حکمت عملی بھی تو استعمال کی جا سکتی تھی، شانو نے جھنجھلا کر سوچا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے کیسے نکلے۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور تانیا چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تانیا..... میرا خیال ہے..... کہ.....''

''پلیز.....'' تانیا نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک لاتوضیحی، لیکن معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہونے لگی ''میرا خیال ہے..... شانو..... کہ..... ہمیں شادی کا رسک..... لے لینا چاہیے.....''

لیکن یہ سات مہینے کی بات ہے۔ اب تک تو سب ٹھیک چلتا رہا لیکن آج پھر وہی ہو رہا ہے جس کا ڈر تھا، شانو نے مایوسی سے سوچا۔ انگلیوں میں آنچ محسوس ہوئی تو اس نے چونک کر دیکھا کہ سگریٹ سلگتے سلگتے فلٹر تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا اور تانیا کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھی خاموشی سے چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ تانیا نے گھنی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے بھرے ہونٹوں کے بیچ دبا، پتلا لمبا سا سگریٹ اچھا لگ رہا تھا۔ شانو نے بایاں ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اسے اپنے قریب کھینچا۔ تانیا نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ شانو نے دائیں ہاتھ سے اس کے ہونٹوں میں سے سگریٹ نکال کر ایک گہرا کش لیا، ہونٹوں اور نتھنوں میں سے دھواں خارج کرتے ہوئے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ تھوڑی دیر کی ابتدائی لیت ولعل کے بعد تانیا کا انجماد پگھلنے لگا اور اس کے ہونٹ بھی انگاروں کی طرح دہکنے لگے اور اس نے بھی اپنی بانہیں اس کے گلے میں حمائل کر دیں۔ شانو کے ہاتھ تانیا کی نائیٹی کے بٹن ڈھونڈنے لگے۔ پھر کچھ دیر بعد شانو نے اسے اپنی بانہوں میں اٹھایا اور بستر کی جانب بڑھا۔

اگلی صبح اپنے اپنے کام پر جانے سے قبل شانو نے گذشتہ شب کی اپنی دانستہ اور ان چاہی غلطی کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی۔

''تانیا..... رات..... تم نے برا مانا ہوگا..... لیکن..... میں نے شادی سے پہلے ہی صاف لفظوں میں تمہارے ساتھ اس پرابلم کا ذکر کیا تھا.....''

''مسٹر شانو.....'' تانیا نے انتہائی سرد مہری سے بات کاٹتے ہوئے کہا ''پلیز..... آئندہ کے لیے آپ اپنے نفسیاتی مسائل کے بارے میں صرف اس کے ساتھ بحث کریں جو ان کا حل جانتا ہو..... میرے دماغ کو خواہ مخواہ ڈسٹ بن بنانے کی کوشش نہ کریں.....''

تانیا نے اپنا بڑا سا چرمی پرس اٹھایا، اس کی طرف دیکھے بغیر اسے 'گڈ بائی' کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

شانو کے چہرے پر خجالت کے آثار ابھر آئے۔ وہ کچھ لمحے بند دروازے کو دیکھتا رہا پھر کھڑکی کے قریب آیا۔ اس نے دیکھا کہ تانیا کی کار گیراج سے ریورس گیئر میں بائیں جانب کو مڑی پھر رک کر اس نے دایاں ٹرن لیا اور صدر دروازے میں سے تیزی سے نکلتے ہوئے اپنے پیچھے دور تک دھول اڑاتی چلی گئی۔

وہ واقعی غصے میں ہے، شانو نے سوچا، ورنہ اس بیدردی سے کبھی گاڑی نہیں چلاتی۔ کہیں کوئی حادثہ نہ کر بیٹھے، شانو نے سوچا اور اپنے آپ کو خطا کار محسوس کرنے لگا۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ اس کی یہ بے سر پیر کی پرابلمز سن سن کر وہ اپنے دماغ کا کباڑا کیوں کرے۔ کیا کہا تھا اس نے؟... اپنے نفسیاتی مسائل کا ذکر اس کے ساتھ کرو جوان کا حل جانتا ہو.... اچانک اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔ مسائل کا تذکرہ اس سے کرو جوان کا حل جانتا ہو۔ کمال ہے، شانو نے حیرت سو سوچا، اسے آج تک اس کا خیال بھی کیوں نہ آیا... اور تانیا نے غصے کے عالم میں بھی کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ کسی باخبر آدمی سے بات کرو.... یعنی کسی اسپیشلسٹ سے۔ وہ تانیا کی صلاحیتوں کا صدق دلی سے معترف ہو گیا۔ اسے تعجب ہوا کہ اس نے آج تک اس مسئلے کے بارے میں اس عملی نکتۂ نظر سے کیوں نہیں سوچا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے کبھی اسے سنجیدگی سے مسئلہ ہی نہیں سمجھا، اس نے سوچا اور فیصلہ کیا کہ اب وہ اس سلسلے میں لاپرواہی نہیں برتے گا کیوں کہ اب یہ مسئلہ تانیا سے بھی جڑ گیا ہے۔ تانیا، جس نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس سے شادی کی۔

شانو نے دفتر فون کر کے نہ آنے کو کہہ دیا۔ آج وہ کسی سے مشورہ کرے گا، لیکن کس سے؟ ٹیلیفون کے زمانے میں ڈائرکٹری نام کی ایک دستاویز ہوتی تھی جس کے زرد صفحات میں انواع و اقسام کی پیشہ ورانہ اور کاروباری اطلاعات فراہم کی جاتی تھیں لیکن اب جیبی فون کے دور میں ٹیلیفون ناپید ہوتے جا رہے تھے اور ڈائرکٹری مفقود الخبر۔ بہر حال، جنسی سرگرمیوں سے وابستہ مسائل کو اگر صیغۂ راز میں رکھنے کی ضد ترک کر دی جائے تو اس قسم کی اطلاعات کی فراہمی کوئی دشوار نہیں ہے۔ پانچ چھ جگہ فون کر کے جب ان میں سے دو نے ڈاکٹر خشوگی کا نام لیا تو شانو نے اس کا پتہ اور فون نمبر لے کر اس سے شام پانچ بجے کی اپوائنٹمنٹ بھی لے لی۔

شام پانچ بجے سے ٹھیک ایک منٹ پہلے شانو ڈاکٹر خشوگی کے دروازے پر لگی نیم پلیٹ پڑھ رہا تھا:

ڈاکٹر اے. خشوگی (ایم.او.ایس.ایس.)

ایکسپرٹ ان سیکچوئل سائیکالوجی اینڈ میڈیسن

شانو نے کال بیل کا پش بٹن دبایا۔ اندر سے بزر کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت اور خوش لباس نرس نے باہر جھانکا۔

"یس....؟" اس نے استفہامیہ انداز میں بھنویں اٹھائیں۔

"میری اپوائنٹمنٹ ہے...." شانو نے آہستہ سے کہا۔

"مسٹر شانو...."

شانو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آیئے.... ڈاکٹر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

نرس واپس مڑی اور شانو اس کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ نرس ایک میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے

سامنے رکھی کرسیوں پر دو آدمی اور بیٹھے تھے۔ نرس نے شانو کو سامنے والی خالی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ان میں سے ایک کو مخاطب کیا۔

''آپ نے دوائیاں لے لی ہیں مسٹر دیکشت، آپ جا سکتے ہیں.....'' وہ آدمی اٹھنے لگا اور وہ دوسرے سے بولی ''اور آپ.....؟ آپ ایک گھنٹہ پہلے آ گئے۔ اب انتظار کریں۔ آپ وہاں..... اس صوفے پر چلے جائیں پلیز..... وہاں کئی میگزین ہیں، آپ ان سے دل بہلائیے..... اور مسٹر شانو..... آپ کنسلٹیشن فیس جمع کروائیے پلیز.....''

''شیور شیور..... کتنی فیس ہے؟''

''دو ہزار.....''

شانو نے پرس سے دو ہزار روپے نکال کر نرس کے حوالے کیے اور نرس نے میز کی ایک دراز سے تین چار صفحات پر مشتمل ایک فارم نکالا اور شانو سے اس کی جنسی زندگی کے متعلق استفسار کر کے فارم میں اندراج کرنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہونے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ نرس فارم لے کر ڈاکٹر خشوگی کے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی اور اسے ایک دروازے کے اندر جانے کو کہا جہاں باہر جیسی ہی ایک اور نیم پلیٹ لگی تھی۔ ''رسید آپ کو واپسی پر ملے گی.....'' نرس نے کہا۔ شانو نے سر کو تفہیمی جنبش دی، بڑھ کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

''آیئے مسٹر شانو.....'' پچھلی دیوار سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر ایک بڑی سی یو شیپ میز کے پیچھے خوش سلیقہ پیرہن میں ملبوس ڈاکٹر خشوگی نے قدرے گہری آواز میں استقبال کیا۔

یہ ایک وسیع اور کشادہ کمرہ تھا، شانو نے اطمینان سے جائزہ لیا۔ جس پر بہ آسانی ایک چھوٹے سے ہال کا گمان کیا جا سکتا تھا۔ کمرے میں ہلکی نیلاہٹ لیے ملگجی سی روشنی منتشر تھی شانو چاروں طرف دیکھتا ہوا میز کے پاس پہنچا اور ڈاکٹر کشوگی کے اشارے پر میز کے اس طرف رکھی تین کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کی غلطی کر بیٹھا غلطی اس لیے کہ کسی نشست پر بیٹھنے کا عمل دو ایک لمحوں میں ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کرسی پر بیٹھنے کا عمل ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اسے لگ تھا کہ وہ آہستہ آہستہ دھنس رہا ہے۔ اسے لگا کہ اس کا سارا جسم روئی کے گالوں پر رکھا ہوا ہے یا پھر بادلوں کے دوش پر کہیں معلق ہے۔ اسے ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہونے لگا۔

''آپ کیسے ہیں مسٹر شانو.....'' ڈاکٹر خشوگی نے قدرے آگے جھک کر پوچھا۔

''ویری فائن ڈاکٹر.....'' شانو نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بھرائے لہجے میں کہا ''آپ کا کمرہ ڈاکٹر کا کم اور کسی آرٹسٹ کا زیادہ لگتا ہے.....''

''اصل میں.....'' ڈاکٹر خشوگی نے آہستہ سے ہنستے ہوئے کہا ''سیکس..... سائنس کم..... اور آرٹ زیادہ ہے۔ لیبارٹری میں کیے جانے والے صرف فیزکس اور کیمسٹری کے تجربات ہی سائنس نہیں کے زمرے میں نہیں آتے بلکہ زندگی کے کسی بھی پہلو کے ادراک و تفہیم کے عمل کو سائنس کہا جا سکتا ہے..... اور جہاں تک سیکس کا تعلق ہے..... کچھ ٹیکنیکل اور جسمانی باتوں کو چھوڑ کر..... یہ ایک آرٹ ہے..... جانوروں کی ارذل سطح پر بھی سیکس میں پارٹنرز کی تلاش کے لیے رنگوں، بوؤں اور کئی طرح کی، ان کی نظر میں، دلآویز حرکتوں کا استعمال کیا جاتا ہے..... لیکن انسان نے تو سیکس کو باقاعدہ آرٹ بنا دیا ہے.....''

''تو پھر.... سیکس کو برا کیوں کہا جاتا ہے؟''

''پہلے نہیں کہا جاتا تھا.... '' ڈاکٹر خشوگی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''سیکس زندگی تو ہے..... لیکن زندگی سیکس نہیں ہے.... جبکہ سیکس ایک مفت کی ہاتھ آئی خوشی ہے لیکن پیٹ کی آگ، چھت اور صحت جیسی زندگی کی دوسری آسائشوں نعمتوں اور مسرتوں کے لیے مسلسل کدو کاوش کرنے کے باوجود مطلوبہ حصولیابیاں نہیں ہوتیں اور انسان لاتعداد مصائب وآلام کا شکار ہوکر زندگی کی شرمناک منفی تصویر بن جاتا ہے۔ مہاویر اور بدھ نے زندگی کے اسی ناپائیدار، تاریک اور بے ثبات پہلو کا احاطہ کر کے زندگی کو ایک عبوری دور قرار دیا جس سے روگردانی ناممکن نہیں تھی۔ دراصل مہاویر اور بدھ کے بعد ہی تناسخ، مکتی اور نجات کے تصورات ملتے ہیں.... بار بار پیدا ہونے اور مرنے کے چکر سے نجات حاصل کرنے کے لیے تیاگ، خود اتلافی اور خود اذیتی مثبت رجحان قرار پائے اور اس کے لیے دنیاوی آسائشوں اور تلذذ سے رضا کارانہ اجتناب مستحسن معاشراتی رویے بن گئے.... سیکس چونکہ اکتساب لذت کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے اس لیے نجات کے حصول کی راہ میں عورت کو سد راہ تسلیم کر لیا گیا.... لہٰذا مہاتما بدھ کے مٹھوں میں عورتوں کو رہنے کی اجازت نہیں تھی.... آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا مسٹر شانو.....؟''

''ہاں..... سمجھ رہا ہوں.... آپ کہتے جایئے پلیز.....''

''مہاتما بدھ کا ایک چہیتا پیروکار تھا.... آنند.... ایک بار آنند نے بدھ سے کہا کہ اگر عورتوں کو مٹھوں میں رہ کر تپسیا کرنے کی اجازت نہیں ملے گی تو وہ نجات کیسے حاصل کر پائیں گی..... بدھ نے کہا کہ وہ اگلے جنم میں مرد پیدا ہونے کا انتظار کریں..... بہر حال آنند کی مسلسل مہم کے تحت جب بدھ نے عورتوں کو مٹھوں میں رہنے کی اجازت دی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جانتے ہو بدھ نے کیا کہا تھا؟ بدھ نے کہا: آنند میں نے پانچ ہزار سال چلنے والا دھرم بنایا تھا لیکن اب یہ پانچ سو سال بھی نہیں چلے گا.... کپل وستو کے راجکمار نے بالکل ٹھیک کہا تھا..... مٹھوں میں محض خواتین کی موجودگی ہی تارکین لذات کے لیے سوہان بن گئی.....''

''لیکن ڈاکٹر..... یہ تو پرانی بات ہے.... ڈھائی ہزار سال پرانی.....''

''ہاں.... ڈھائی ہزار سال پرانی...... لیکن ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کو اور سیکس کو معتوب قرار دے دیا گیا..... اور پھر اس کے بعد چرچ نے عورتوں کی تذلیل کے لیے باقاعدہ مہم چھیڑ دی.....''

''چرچ نے.....؟'' شانو نے بے یقینی سے کہا۔

''دراصل ابتدائی مسیحیت نے Pagan Religions میں استعمال کی جانے والی کئی علامتوں کو اپنا لیا تھا۔ مسیحیت میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ سب Pagan Religions سے مستعار ہے۔ صرف مسیحیت ہی کیوں، ہر نیا مذہب اپنے پیشرو مذاہب سے بہت کچھ عاریتاً لے لیتا ہے۔ چنانچہ قدیم مصریوں کی Sun Discs عیسائی سنتوں کے مقدس ہالے بن گئے۔ مصر کی دیوی Isis کے معجزاتی بیٹے Horus کی پرورش کرتی ہوئی تصویر سے مقدس مریم کا ننھے جیسس کی دیکھ بھال کا تصور لے لیا گیا۔ ماقبل عیسائیت کا God Mithras جسے سن آف گاڈ بھی کہا جاتا تھا، ۲۵ دسمبر کو پیدا ہوا تھا۔ اتفاق سے ۲۵ دسمبر ہی Pagan Gods Orisis, Adonis, Dionysus کا بھی یوم پیدائش ہے، ۲۵ دسمبر ہی کو جیسس کا یوم پیدائش تسلیم کر کے Pagan God Mithras کی طرح سن آف گاڈ بنا دیا گیا۔ یہ

بات سمجھنا از حد ضروری ہے کہ قدما کے نزدیک سیکس کے عمل کو روحانیت سے جوڑ دیا گیا تھا۔ مصر میں دیوی Isis کے زمانے ہی سے سیکچول رسوم کو عبادت کے انداز میں ادا کیا جاتا تھا اور عورت کے ساتھ جسمانی ملن ہی مرد کے لیے زمین سے جنت کی پرواز کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اپنی کوکھ میں سے ایک نئی زندگی کو وجود میں لانے کی عورت کی لاثانی صلاحیت کو کسی خدائی معجزے سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا اس اعتراف کا جشن منانے کے لیے دو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے سے قدیم مصری راہب اور راہبائیں Hieros Gamos کی عارفانہ جنسی رسم ادا کرتی چلی آ رہی ہیں۔ Hieros Gamos ایک یونانی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب ہے' مقدس (جنسی) ملن'۔ اس دور کا نظریۂ سیکس آج کے بالکل برعکس تھا۔ یہاں تک کہ یہودیوں کی ابتدائی روایات کے مطابق ان کے معبدوں میں نہ صرف یہ کہ خدا ہی رہتا تھا بلکہ اس کی نصف برابر Shekinah (سکینہ) بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ روحانی وجدان کے متلاشی ان معبدوں میں جا کر مقدس راہباؤں، جنہیں Hierodules کہا جاتا تھا، کے ساتھ سیکس کرتے تھے۔ لیکن سیکس کے توسط سے خدا تک دائریکٹ پہنچنے کا تصور ابتدائی چرچ کے اس دعوے کی زور دار نفی کرتا تھا کہ انسان اور خدا کے بیچ چرچ واحد ذریعہ ہے۔ چنانچہ چرچ نے سیکس کو Demonise کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سیکس کی مکمل نفی اور Demonisation کر کے کیتھولک چرچ نے دیوی پوجا کو یکسر مٹا دیا۔ ابتدائی کرسچین چرچ نے نسائی برتری کے خلاف منظم تحریک شروع کر کے دنیا کے مذاہب سے نسائیت کو ہمیشہ کے لیے بدر کر دیا۔ پگن مذہبی تصورات، نسائی عبادت اور غیر کرسچین خیالات کے حاملوں کو سزا تجویز کرنے کی غرض سے قائم کیے گئے رومن کیتھولک ٹرائیبونل نے ایک کتاب شائع کی..... "Malleus Maleficarum" جسے 'Witches Hammer' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں آزاد خیال عورتوں سے پیش آنے والے خطرات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اس کتاب میں عیسائی پادریوں کو اس قسم کی عورتوں کی نشاندہی، انہیں ایذا و اذیت رسانی اور انہیں نیست و نابود کرنے کی ہدایات صادر کی گئیں تھیں۔ اور..... جانتے ہو، کس قسم کی عورتوں کو عتاب کا شکار بنایا گیا؟ ان 'ساحراؤں' میں خاتون اسکالرز، یوروپ میں جگہ جگہ گھوم کر مستقبل کی پیشین گوئی کرنے والی تمام ایشائی نژاد خانہ بدوش عورتیں، راہبائیں، آزادئ فکر کی حامی اور فطرت کی شیدائی خواتین اور یہاں تک کہ قابلاؤں کو بھی نہیں بخشا گیا اس جرم میں کہ اپنے علم و ہنر کا استعمال کر کے وہ دردِ زہ کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں، وہ دردِ زہ جسے ایشور نے ہر عورت کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ مسٹر شانو..... ان نام نہاد 'ساحراؤں' کے خلاف چلائی گئی تین سو سال طویل اس مہم میں پچاس لاکھ عورتوں کو کھمبوں سے باندھ کر زندہ جلا دیا گیا..... پچاس لاکھ..... سنتے ہو؟..... پچاس لاکھ عورتوں کو چرچ نے زندہ جلا دیا..... ہٹلر بے چارہ تو خواہ مخواہ بدنام ہے۔''

''اور پھر دھرتی ماتا مردوں کا کارزار بن گئی۔ روحانی وجدان کے لیے عورت کو نصف بہتر کی برتری دے کر اس کی توقیر کرنے والا معاشرہ ختم ہو گیا۔ چرچ نے عورت کے تقدس کو ہمیشہ کے لیے پامال کر کے عورت کے لیے قدیم مذاہب کی روایتی توقیت کا ذکر بھی قابل تعزیر جرم قرار دے دیا۔ سیکس کی مکمل نفی اور Demonisation کے لیے چرچ نے جیسس کرائسٹ کے کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہونے کا دعویٰ کر کے جیسس کو تو ماورائی حیثیت کا حامل بنا دیا مگر سیکس اور عورتوں کو ارذل ترین سطح پر لا کھڑا کر دیا۔ چنانچہ گذشتہ دو ہزار سال سے دنیا کے تمام مذاہب میں سیکس ایک قابل نفریں اور شرمناک سرگرمی کے طور پر ابھرا ہے۔ ہمارا آج کا جنسی رویہ اسی پس منظر سے نکلا ہے۔ جس کے

مطابق سیکس کے بارے میں بات کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔''

''کمال ہے..... میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ سیکس کا تصور کیسے کیسے مراحل سے نکلا ہوگا'' شانو نے بھرائے لہجے میں کہا۔

''جی ہاں..... '' ڈاکٹر خشوگی نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا'' میں نے سیکس کے بارے میں بنیادی معاشراتی رویوں کا ایک سرسری جائزہ آپ کے سامنے رکھنے کی مختصر سی کوشش کی ہے، جن سے ہمارے آج کے سیکسچوئل تحفظات اور ترجیحات نکلتی ہیں..... ویسے مسٹر شانو..... آپ کی پرابلم کیا ہے؟''

''میری پرابلم یہ ہے ڈاکٹر کہ..... '' شانو نے ہچکچائے روانی سے کہا'' میں ایک عورت کے ساتھ گذارہ نہیں کر سکتا.....''

''اوہ..... آئی سی۔''

''یس..... کالج سے لے کر آج تک میرے ساتھ ایسا ہی ہے..... بس..... جس لڑکی کو ایک بار حاصل کر لیتا ہوں سات آٹھ مہینوں..... یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کے بعد اسے دیکھنا بھی گوارہ نہیں ہوتا..... دیئر از سم تھنگ سیریسلی رانگ ودمی.....''

''شادی ہوگئی آپ کی؟''

''یہی تو مصیبت ہے..... سات مہینے پہلے جس سے شادی کی تھی..... آج اسے دیکھنے کا بھی جی نہیں کرتا..... '' شانو کراہا'' حالانکہ وہ کتنی اچھی ہے..... ہاؤ نائس شی از..... کتنی خوبصورت..... اور کتنی انڈر اسٹینڈنگ..... اوہ ڈاکٹر..... میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا..... میں کیا کروں.....!''

''مسٹر شانو آپ خواہ مخواہ پریشان ہورہے ہیں.....''

''کیا مطلب؟ یعنی یہ کوئی پرابلم ہی نہیں ہے؟''

''جی ہاں..... یہ کوئی پرابلم ہی نہیں ہے.....''

''پلیز ڈاکٹر..... وضاحت کیجیے..... میں بہت پریشان ہوں۔''

''یہ کوئی پرابلم اس لیے نہیں ہے مسٹر شانو کہ یہ ایک نیچرل بات ہے..... آپ جانتے ہیں مسٹر شانو کہ صغیر ترین خوردبینی جرثومے سے لے کر ہاتھی اور جراف جیسے بڑے جانوروں اور ان سے بھی پہلے ڈائنا سورز کا Burning Passion کیا ہے اور کیا تھا؟ صرف ایک..... اپنی نسل کا تحفظ اور افزائش..... اسی لیے درخت پر ہزاروں پھل لگتے ہیں اور ان پھلوں میں کروڑوں بیج..... کہ کوئی نہ کوئی تو لگ جائے گا..... اسی لیے ایک بار کے سیکسچوئل انٹرکورس میں مرد کے خارج ہونے والے Semen میں دس لاکھ سے زیادہ Sperms ہوتے ہیں کہ ان میں سے ایک تو عورت کے رحم میں منتظر Ovum میں ضم ہو کر اسے Fertilize کرے گا اور عورت کو Pregnant..... یہ بڑی سیدھی سی بات ہے مسٹر شانو..... نیچر چانس نہیں لیتا..... وہ نسل کی افزائش کو یقینی بناتا ہے..... نسل انسانی کی بقا اور افزائش کے لیے ضروری ہے کہ عورت کو حاملہ کر دیا جائے۔ ایک بار حاملہ ہو جانے کے بعد عورت اب کم سے کم دو سال تک حاملہ نہیں ہونا چاہے گی کیونکہ اسے بچے کی پرورش کرنی ہے، اور اسی لیے ہر مرد کو شکایت رہتی ہے کہ وہ بچے کے مقابلے میں اسے توجہ نہیں

دیتی، لیکن مرد اس دوران درجنوں بلکہ سینکڑوں عورتوں کو حاملہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے.....اسی لیے اسے ایک سے زیادہ عورتیں چاہئیں....حرم کے لیے وہ سینکڑوں عورتیں جمع کرتا ہے.....کچھ معاشرے مرد کو آج بھی ایک سے زیادہ عورتیں رکھنے کی اجازت دیتے ہیں.....بظاہر اس سب کا مقصد سیکس دکھائی دیتا ہے لیکن اصل میں اس کے در پردہ نسل انسانی کی بقا کا جذبہ کارفرما ہے....یہ ایک Natural Instinct ہے.....آپ میری بات سن رہے ہیں مسٹر شانو؟''

''ہاں ڈاکٹر.....پلیز کیری آن....'' شانو ہمہ تن گوش تھا۔

''اصل میں یہ.....فناپذیر انسانی جسم میں مقید ۵۹۹۹ کے Pairs of genes کے نسبتاً خود مختار اتحاد کے جہد بقا کی کہانی ہے جن میں سے کوئی بھی فنا نہیں ہونا چاہتا۔ ان کے پاس خود کو زندہ رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے.....اگلی نسل میں منتقلی.....اور یہ کام سیکس کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ہر وہ Gene جو سیکس کے لیے ذرا سی بھی انگیخت کرتا ہے اپنی بقا کا مکان بڑھا لیتا ہے اور جو نہیں کرتا وہ فنا کے کگار پر جا کھڑا ہوتا ہے.....جیسا میں نے پہلے کہا کہ کوئی بھی Gene اپنا وجود نہیں مٹانا چاہتا لہٰذا یہ سارے کے سارے ۵۹۹۹ کے Genes انسان کو سیکس کے لیے مسلسل انگیخت کرتے رہتے ہیں.....اور یہی وہ اصل مجرم ہیں جو نہ صرف آپ کے Sexual Behaviour بلکہ آپ کے لیے خوبصورتی کا معیار بھی متعین کرتے ہیں.....آپ سمجھ رہے ہیں؟''

''یس ڈاکٹر.....''

''گڈ.....'' ڈاکٹر خشوگی مزید آگے جھکا ''ابھی باہر انتظارگاہ میں نرس نے آپ کا فارم بھرتے وقت سیکس اور عورت کے بارے میں آپ کی ترجیحات دریافت کی تھیں.....آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے کہا تھا کہ چہرے کے خدو خال کو تو آپ کسی حد تک نظر انداز کر سکتے ہیں مگر عورت کے سینے کے غیر معمولی ابھاروں، لمبے چمکدار بالوں، پتلی کمر اور بھرے بھرے کولہوں پر آپ کی جان جاتی ہے.....رائٹ؟''

شانو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مسٹر شانو.....آپ دنیا کے پہلے مرد نہیں ہیں جو ایسا سوچتے ہیں.....آپ یہ جان کر حیرت ہوگی کہ سب کی ترجیحات یہی ہیں....اور ان ذاتی پسندیدگیوں کے پیچھے بھی انہی ۵۹۹۹ کے Pairs of Genes کے کمینے پن کا ہاتھ ہے.....مرد کو عورت کے سینے کے غیر معمولی ابھار صرف اس لیے پسند نہیں ہوتے کہ وہ انہیں سہلا کر یا چوم کر طمانیت محسوس کرتا ہے اور خود کو یا عورت کو جنسی طور پر مشتعل کر سکتا ہے بلکہ اس کے لاشعور میں یہ اطلاع کہیں محفوظ ہے کہ سینے کے یہ ابھار بچے کی زندگی اور صحت کے ضامن دودھ کی فراہمی کا بیش قیمت اور غیر مختتم ذریعہ ہیں.....اسی طرح گھنے، لمبے اور چمکدار بال اچھی صحت کے ترجمان ہیں اور اچھی صحت کامیاب حمل کے لیے بہت ضروری ہے۔ پتلی کمر اس لیے اچھی لگتی ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عورت ابھی تک Pregnant نہیں ہوئی ہے.....اور.....عورت کے بھرے بھرے کولہوں پر مرد کے ریشہ خطمی ہونے کی وجہ اس کی جینیاتی پروگرامنگ میں مخفی یہ اطلاع ہے کہ بھاری کولہے کوکھ میں بچے کی افزائش اور پیدائش میں معاون ثابت ہوں گے.....مسٹر شانو.....یہ وہ عناصر ہیں جو کم و بیش دنیا بھر کے مردوں کی جنسی ترجیحات ترتیب دیتے ہیں.....لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا.....اس سب کی تہ میں صرف Genes یا دوسرے لفظوں میں نسل انسانی کی بقا کا نظریہ ہی سرگرم ہے۔ واضح رہے کہ ازمنہ ما قبل تاریخ میں بچے کی پرورش صرف

عورت کی ذمہ داری تھی مگر پھر ہزاروں سالوں کے دوران، دنیا کے تقریباً سبھی معاشروں میں شادی جیسے ادارے ابھرتے..... اور ایک آدھ کو چھوڑ کر سبھی معاشروں میں Monogamy یعنی ایک بیوی کا چلن ہے لیکن یہاں بھی بچے کی بہتر پرورش و پرداخت ہی مطمع نظر ہے کیونکہ اب بچہ ماں اور باپ دونوں کی مشترکہ Genetic Investment ہے..... اس لیے اب ماں اور باپ مشترکہ طور پر بچے کی بقا کو یقینی بناتے ہیں، جیسے کئی دوسرے نر اور مادہ چوپائے اور پرندے دونوں مل کر اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں..... ان ہزاروں برسوں کے دوران مہذب یا نیم مہذب معاشروں میں مردوں کا Secual Behaviour معاشرتی پابندیوں کے طابق ہوگیا ہے، مسٹر شانو..... اور..... اسے ہم..... مردوں کی مکمل Social Domestication کہہ سکتے ہیں..... لیکن آپ کے سلسلے میں اس Institutionalized Domestication پر یہ خرافاتی، شریر اور کمینے Genes زیادہ حاوی ہوگئے ہیں..... آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا مسٹر شانو..... یہ صورت حال غیر معمولی ضرور ہے مگر غیر فطری نہیں..... آپ کو اس پر قطعی شرمندہ نہ ہونا چاہیے..... اصل میں سیکس انسانی فطرت کا حصہ نہیں ہے بلکہ سیکس ہی انسانی فطرت ہے۔"

"لیکن..... لیکن..... اس کا علاج کیا ہے ڈاکٹر صاحب.....؟"

"علاج.....؟" ڈاکٹر خشوگی نے ایک نظر ختم ہوتے ہوئے سگریٹ کو دیکھ کر اسے ایش ٹرے میں مسلا، ایک طرف رکھا ہوا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا، اس میں سے ایک اور سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور پیکٹ شانو کی طرف بڑھا کر پوچھا "آپ سگریٹ پیتے ہیں مسٹر شانو؟"

شانو کو واقعی سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ اس نے شکریہ کے ساتھ سگریٹ لے لیا۔ ڈاکٹر خشوگی نے لائٹر سے دونوں سگریٹ سلگائے۔ دونوں نے گہرے گہرے کش لے کر کمرے کی فضا کو مکدر کرنے لگا۔

"علاج.....؟ نہیں مسٹر شانو..... کسی قسم کی بھی میڈیکیشن آپ کی Secual Drive مضر ہوگی..... نہیں..... اس کا کوئی ریڈی میڈ علاج نہیں ہے..... یوں سمجھیے کہ آپ ایک ایسے جنگلی گھوڑے ہیں جسے ابھی تک سواری کے لیے بریک نہیں کیا جا سکا۔ اس کا علاج ہے Social Domestication..... اور یہ ایک طویل المدتی عمل ہے جس میں آپ کی بیوی اور خصوصاً آپ کے سرگرم تعاون کی ضرورت ہے..... لیکن یہ جو آپ..... اپنے زعم میں..... دنیا بھر کی عورتوں کو حاملہ کرنے کے مشن پر نکلے ہیں، یہ عورتیں آپ پر کہاں سے برستی ہیں؟"

"کال گرلز" شانو نے بے دریغ کہا۔

"ہوں ں ں ں..... میرا بھی یہی اندازہ تھا..... لیکن اس میں جو کھم ہے....."

"کیا کریں..... یہ رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں..... یہاں ایک گروپ ہے جس میں ستر اسی کے قریب مرد اور عورتیں شامل ہیں....."

"کیا مطلب؟" شانو نے سیدھا ہونے کی کوشش کی لیکن کرسی کی پیڈنگ میں زید دھنس گیا۔

"مسٹر شانو..... یہ ایک Exclusive کلب ہے جس میں ستر اسی کے قریب ایسے گھریلو مرد اور عورتیں شامل ہیں جو اپنی Sexual Urges پر قابو نہیں رکھ سکتے اور..... ایک مرد یا عورت کے ساتھ انہیں جنسی طمانیت نہیں ملتی..... بالکل آپ کی طرح....."

''اوہ....تو آپ ایک باقاعدہ سیکس ریکٹ چلا رہے ہیں....''

''سیکس ریکٹ؟'' ڈاکٹر خشوگی نے حیرت آمیز مجروح لہجے میں کہا'' ریکٹ تو تب ہوتا مسٹر شانو جب کسی بھی اسٹیج پر روپیہ Involve ہوتا۔ہم تو آپ کو کلب کے انچارج سے ملوادیں گے جو آپ سے ایک سال کی ممبر شپ کے لیے محض پانچ ہزار لے گا....یہ وہ حقیر رقم ہے جو آپ کسی بھی کال گرل کو ایک رات کے لیے دیتے ہیں....کلب کا انچارج آپ کی Sexual Preferences کی مطابقت سے Rotational Basis پر مختلف عورتوں کے ساتھ آپ کی Pairing کرتا ہے اور آپ کے مطالبے پر....آپ دونوں کو ملوا دیتا ہے....اور....آپ دونوں جہاں بھی چاہیں....اور جتنے دن چاہیں ایک ساتھ گذار سکتے ہیں....اور آپ دونوں اخراجات شیئر کرتے ہیں....کیا آپ اب بھی اسے ریکٹ کہیں گے مسٹر شانو؟''

''کیا....کیا ہمارے ہاں ایسی عورتیں ہیں؟''

''کیوں؟ تقریباً ہر بڑے شہر میں بنا شادی کے آپ Live-in Relationships نہیں دیکھتے؟ لڑکے لڑکیاں بنا شادی کے ایک ساتھ رہتے ہیں، بچے ہو جاتے ہیں....ان کے گھر والے سب جانتے ہیں....نہیں مسٹر شانو....یہ....خود کفیل اور خود مختار عورتیں ہیں....کارپوریٹ سیکٹر میں کام کرنے والی اور خود اعتمادی سے بھری ہوئی یہ عورتیں چھوٹے شہروں سے آتی ہیں....صرف میٹروز ہی میں نہیں بلکہ بے شمار بڑے شہروں میں بھی کوئی کسی کو نہیں دیکھتا....یہاں کوئی Social Restrictions نہیں ہیں....یہاں کسی کے لیے بھی رضا مندانہ سیکس کوئی مسئلہ نہیں ہے۔یہ عورتیں اپنے Wildest Dreams کے تعاقب کے لیے کسی قسم کی وضاحت کے بنا ہی اپنے گھروں سے چار چھ دنوں کی غیر موجودگی افورڈ کر سکتی ہیں....اور....میں نہیں سمجھتا اس میں کوئی بری بات ہے....''

''بری بات نہیں ہے ڈاکٹر؟''

''یقیناً....آج کی دنیا کو سو سال پرانے اخلاقی پیمانوں سے نہیں پرکھا جا سکتا....''

''اور....سو سال بعد ڈاکٹر؟''

''اخلاقی اقدار غیر محسوس طریقے سے بدلتی رہتی ہیں مسٹر شانو....لیکن....اخلاق اقدار کی پیشین گوئی ایک خطرناک مشغلہ ہے جو Prophets of doom ہی کو مبارک رہے تو بہتر ہوگا....''

''اوکے ڈاکٹر خشوگی....آئی ایم آن یور سائڈ....یو ہیو وان می اوور....میں آپ کے کلب کا ممبر بن گیا....کیا میں اس کرسی سے اٹھ جاؤں....؟''

''کیا آپ یہاں کوفت محسوس کر رہے ہیں مسٹر شانو؟''

''نہیں تو'' شانو نے حیرت سے کہا''اس کے برعکس میں یہاں بہت آرام سے ہوں....''

''ہاں....یہ Over Stuffed کرسی خاص طور پر اس طرز پر بنائی گئی ہے کہ اس میں بیٹھنے والا اپنے آپ کو انتہائی Comfortable محسوس کر کے اپنے Inner Self کو پوری طرح Reveal کرے اور Inhibitions کے بنا در پیش مسئلے کی تفہیم کرے....نہیں نہیں'' شانو کو کرسی سے اٹھنے کی کوشش سے باز رکھنے کے لیے ڈاکٹر خشوگی نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کرتے ہوئے کہا''ابھی اٹھیے نہیں....کچھ اور باتیں آپ کو بتانی ہیں....''

شانو پھر سے کرسی کی زمیوں میں دھنس گیا۔

''مسٹر شانو.....'' ڈاکٹر خشوگی نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا'' گذشتہ کئی ہزار برسوں سے عورت اور مرد کی شادی کے دوران شکل وصورت، معاشی حالات ذات برادری جیسی باتوں کو مدنظر رکھا جا رہا ہے، جو کئی اعتبار سے غلط بھی ہے اور کئی اعتبار سے صحیح بھی...... لیکن سیکس، جو مرد اور عورت کے رشتے کی بنیاد ہے، اس کے بارے میں سوچنا بھی گوارہ نہیں کیا جاتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنسی عادات کے نہ ملنے کے باوجود انہیں زندگی بھر جہنم میں لگنا پڑتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی جوڑا Sexually Compatible ہے تو باقی Adjustments کی جا سکتی ہیں۔ اس لیے.... مسٹر شانو کلب کی کسی بھی خاتون کے ساتھ آپ کی پہلی Pairing میرے اسی آفس کمپلیکس کے ایک یکسر تاریک کمرے میں کی جائے گی۔ آپ دونوں الگ الگ تاریک راستوں سے کمرے میں داخل ہوں گے۔ ایک Plush ڈبل بیڈ پر آپ چار گھنٹوں میں بالکل خاموشی میں ایک دوسرے کو Sexually Discover کریں گے.... In Absolute Darkness..... لیکن اس کے اخراجات الگ سے ہوں گے۔ Fore-play یا Climax کے بعد اگر آپ دونوں ایک دوسرے سے مطمئن ہوتے ہیں تو بیڈ کے دونوں طرف دو بزر پش کر سکتے ہیں جس سے مجھے معلوم ہو گا کہ آپ دونوں ایک دوسرے سے روشنی میں ملنا چاہتے ہیں؟ میں سوئچ آن کر دیتا ہوں اور آپ دونوں اپنی سطح پر اگلی بار کہیں بھی ملنے کا پروگرام بنا سکتے ہیں..... کلب بیچ میں سے نکل جاتا ہے..... ورنہ آپ دونوں ایک دوسرے کو دیکھے بنا اندھیرے ہی میں اپنے اپنے راستے جا سکتے ہیں۔ دوبارہ آپ دونوں کی Pairing تین مہینوں تک نہیں کی جائے گی۔ Is that Clear مسٹر شانو؟''

''یس ڈاکٹر''

''فائن.... آپ کا ریکارڈ کل ہی کلب کے انچارج کو بھیج دیا جائے گا..... یہ اس کا فون نمبر اور پتہ ہے'' ڈاکٹر خشوگی نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کچھ لکھ کر اسے دیتے ہوئے کہا'' آپ جب بھی چاہیں اپوائنٹمنٹ لے کر اس سے مل سکتے ہیں.... گڈ بائی مسٹر شانو۔''

''گڈ بائی ڈاکٹر...'' شانو نے بدقت تمام اس Outsized کرسی سے نکلتے ہوئے کہا'' آپ کمال کے آدمی ہیں۔''

یہ پانچ روز پہلے کی بات تھی۔ شانو اب ہر وقت لذتوں کے نئے امکانات کے بارے میں سوچتا رہتا تھا جو ڈاکٹر خشوگی سے گفتگو کے بعد اس پر وا ہوئے تھے۔ کمال تو یہ تھا کہ جس تانیا کے لیے فرض سمجھ کر وہ ڈاکٹر خشوگی سے ملا تھا اس تانیا سے اس دوران اس کی بات چیت بھی ہاں یا نہ جیسے ایک صوتی الفاظ پر ہی مشتمل رہی۔ یہاں تک کہ رات کو بستر پر تانیا کا وجود بھی اسے عدم لگنے لگا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ اسے دانستہ نظر انداز کر رہا تھا بلکہ وہ شاید اسے دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ تانیا بھی اس کے ساتھ واضح سرد مہری کا مظاہرہ کرتی رہی جسے شانو نے شاید دیکھا بھی نہ ہو کیونکہ وہ اپنے ہی حال میں مگن تھا۔ اور کل چار روز بعد کلب کے انچارج نے آج شام چار بجے ڈاکٹر خشوگی کے کمپلیکس میں اس کی Pairing فکس کرنے کی جب اسے اطلاع دی تو وہ اچھل پڑا۔ ٹھیک چار بجے اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر خشوگی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے جا کر دیوار میں لگے ایک پردے کے پیچھے دروازے کی کنڈی کھولی اور اسے

کہنے لگا:

''مسٹر شانو..... یہ دس فٹ کی اندھیری راہداری ہے جس کے آخر میں ایک اور دروازہ ہے، اسے بند کر لینا..... اندر گھپ اندھیرا ہے لیکن فکر نہ کریں۔ وہ خاتون دروازہ بند ہوتے ہی آپ کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر لے جائے گی..... آپ کو معلوم ہونا چاہیے مسٹر شانو کہ یہ Pairing میں نے خود کی ہے'' اس کی آنکھوں میں ایک ایسے آرٹسٹ کی چمک تھی جس نے ابھی ابھی کسی شاہکار کی تکمیل کی ہو'' Happy Discoveries مسٹر شانو....'' ڈاکٹر نے اسے تاریک راہداری کے اندر دھکیلتے ہوئے کہا اور باہر سے دروازہ بند کر لیا۔

شانو کچھ دیر تو وہیں کھڑا رہا۔ پھر دیوار ٹٹولتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ راہداری کے اختتام پر اس کا ہاتھ ایک دروازے پر پڑا ہی تھا کہ اچانک ایک نرم و نازک ہاتھ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور شانو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خاتون نے دوسرے ہاتھ سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی اور اس کا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ بیڈ کے پاس آ کر خود بھی بیٹھ گئی اور اسے بھی بٹھا دیا۔ شانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ پہلے کبھی ایسی سچویشن سے دو چار نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کے برعکس خاتون پہلے بھی ان مراحل سے گذر چکی لگ رہی تھی۔ شانو نے مناسب سمجھا کہ اپنے آپ کو خاتون کے حوالے کر کے تن بہ تقدیر ہو جائے کیونکہ اب خاتون نے اپنا سر اس کے شانے پر ٹکا کر شہوانی فضا کی تشکیل کے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد شانو کا ہاتھ خاتون کے کاندھے پر سے پھسلتا ہوا اس کے بازو پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کی قمیض یا بلاؤز بلا آستین کے تھا۔ شانو نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اٹھایا اور اپنے ہونٹ اس پر رکھ دیئے۔ خاتون نے اپنا دوسرا بازو اس کی گردن میں حمائل کر کے ذرا سا دھکا دے کر لیٹ جانے کا اشارہ کیا اور شانو لیٹ گیا اور اسے دونوں بانہوں میں لے کر اس کے ہونٹ چومنے لگا۔ خاتون نے بھی ہونٹوں کے در وا کر لیے۔ دونوں کی سانسوں کی تیز آنچ دونوں کے چہروں کے گرد خوشگوار اور شیریں تپش کا محیط بنا رہی تھی۔ اچانک شانو نے اپنے ہونٹ ہٹا کر اس کے گلے پر رکھ دیئے اور خاتون اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں سے اس کے سر کے بال سہلانے لگی۔ شانو کے ہونٹ اس کے سینے تک پہنچنے لگے تھے۔ خاتون نے اس کی قمیض کے بٹن کھولے اور اس کا ہاتھ اس کی شرٹ کے اندر جا کر اس کی چھاتی کے گھنے بالوں کو سہلانے لگا۔ کیا وہ اسے Discover کر رہی ہے، شانو نے چونک کر سوچا۔ پہلے سر کے گھنے بال جو مکمل صحت کی نشانی ہیں، پھر چھاتی کے گھنے بالوں کا معائنہ جو قوت مردی کی علامت ہیں، اور اب شائد وہ اس کے بازوؤں اور سینے اور پھر پیٹ کے مسلز کا جائزہ لے گی۔ شانو نے کچھ دیر بعد جب محسوس کیا کہ وہ باضابطہ طور پر یہی کر رہی ہے تو وہ یہ سوچ کر مگن ہو گیا کہ چونکہ وہ باقاعدگی سے کسرت کرتا ہے اس لیے اس کے گٹھیلے جسم کو محسوس کر کے خاتون کو مایوسی نہیں ہو گی۔ 'Discover through sex in absolute darkness' اسے یاد آیا کہ ڈاکٹر خشوگی نے یہی کہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے بھی کچھ نہ کچھ Discover کرنا چاہیے ورنہ یہ فیصلہ کیسے کر پائے گا کہ اس سے دوبارہ ملنا ہے یا نہیں..... اونہہ..... اس نے لاپرواہی سے سوچا، اس کا فیصلہ بھی خاتون ہی پر چھوڑ دیا جائے تو مناسب ہو گا کیونکہ اس قسم کی باتوں کے بارے میں وہ زیادہ باخبر معلوم ہوتی ہے۔ شانو کے ذہن پر سے سارا غبار چھٹ گیا اور وہ منصفانہ مقامات پر گدرائے ہوئے بھرپور جسم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بستر میں شانو ایک منجھا ہوا کھلاڑی تھا لیکن Love Games کی دنیا میں وہ بھی کوئی نووارد نہیں معلوم ہوتی تھی۔ شانو نے بایاں ہاتھ اس کی

گردن کے نیچے رکھ کر ایک بار پھر اسکے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے اور اس کا دایاں ہاتھ قمیض کے نیچے رینگ کر گولائیوں اور گھاٹیوں کو تلاش کرنے لگا۔

وقت سرعت سے اڑ جانے والے کسی سیال کی طرح تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ وحشی جذبات کے چڑھتے سروں کے ساتھ ساتھ ان کے جسموں کے لباس قسطوں میں اترتے گئے۔ مکمل تاریکی، اور حدوں کی عدم موجودگی میں وہ دو اجنبی عریاں جسم ایک دوسرے کو دریافت کرنے کی شدید خواہش میں ان دیکھے اور ان سنے مراحل سے گذرنے لگے اور مشتعل سانسیں نئے جہان معنی دریافت کرنے لگیں۔ وحشی جذبات کے آتشیں سیلاب میں دونوں تنکوں کی طرح بہے جا رہے تھے اور پھر جب دونوں کی دیوانگی بام پر پہنچ گئی تو ڈاکٹر خشوگی کی تنبیہ کے باوجود اچانک کمرے کی فضا میں کیف آفریں سسکاریاں سرسرانے لگیں۔ اچانک جیسے شدید بخار میں بے قابو ہو کر دونوں شد و مد سے مرتعش ہو گئے اور پھر دونوں کے حلق سے ناقابل فہم قسم کی لیکن کیف آور کلکاریوں جیسی آوازیں نکلنے لگیں جو بڑی آہستگی سے ایک طویل وقفے میں بتدریج معدوم ہوتی گئیں اور پھر تاریک در و دیوار پر ایک طویل سکوت طاری ہو گیا۔

بہت دیر تک دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر نشہ آور نیم خوابی کے عالم میں رہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی ایک دوسرے کی بانہوں میں کسمسائے۔

''روشن کے لیے اپنی سائڈ کا بزر دباؤ'' خاتون نے اسے بازوؤں میں کستے ہوئے کان میں سرگوشی کی۔

شانو نے اپنی سائڈ والا بزر دبایا اور خاتون نے شانو پر اپنی بانہوں کی گرفت ڈھیلی کیے بنا اس کے اوپر سے رول کر کے دوسری طرف کا بزر دبایا۔ اور ڈاکٹر خشوگی تو جیسے بزر ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ پلک جھپکتے ہی لائٹ آ گئی۔

دونوں نے ہونٹوں پر مسکراہٹیں لے کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں منجمد ہو گئیں۔

شانو اور.....تانیا.....ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''تم.....!'' شانو کو جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔

''تم.....!'' تانیا سکتے میں آ گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت و خوف سے پھیل گئیں اور اس کا منہ کھل گیا۔

کسی کے پاس بھی کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

فی الفور تانیا نے سنبھالا لیا اور اٹھ کر کپڑے پہننے لگی۔

''ٹھہرو.....'' شانو نے اچانک گرج کر کہا ''اب یہ تماشہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں.....تمہاری اصلیت سامنے آ گئی ہے۔''

''اور تمہاری اصلیت؟'' تانیا نے کپڑے پہننا جاری رکھا ''تمہاری اصلیت کیا ہے'' اس نے ہاتھ کے ساتھ سر سے پاؤں تک اس کی برہنگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ؟''

شانو بھی جلدی سے اٹھ کر کپڑے پہننے لگا۔

''تمہیں اونچی آواز میں چلانے کا حق صرف اس لیے مل گیا کیونکہ تم مرد ہو؟ کمال ہے.....تمہیں اپنی کسی بھی بے راہ روی کا سائنٹیفک جواز پیش کرنے کی اجازت ہے لیکن مجھے نہیں، کیونکہ میں عورت ہوں اس لیے میری کسی

بھی کمزوری کو، میری کسی بھی Biological Urge کو بدکاری کہا جا سکتا ہے، کیوں؟...... مسٹر شانو کیا ڈاکٹر خشوگی نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ عورت میں بھی بہتر سے بہتر مرد سے حاملہ ہونے کا Natural Instinct ہوتا ہے اور وہ پہلے مرد کے مقابلے میں دوسرے یا تیسرے مرد کی کسی اور خوبی سے متاثر ہو کر اسے ترجیح دے سکتی ہے اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا؟''

شانو نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھول ہی تھا کہ تانیا نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

''بات سنو.... ڈاکٹر خشوگی نے تمہیں یہ تو ضرور بتایا ہوگا کہ مرد کروڑہا Sperms پیدا کرتا ہے اور اپنی جنسی طور پر فعال زندگی میں تقریباً چار پانچ ہزار عورتوں کو حاملہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لیے جوان عورتوں کی اس کی طلب ختم نہیں ہوتی..... لیکن اس نے تمہیں یہ تھوڑی نہ بتایا کہ ایک عورت اپنی زندگی میں زیادہ سے زیادہ بیس بار حاملہ ہو سکتی ہے اور اس لیے پارٹنرز کے انتخاب میں وہ بہت بہت Selective ہوتی ہے۔ مرد کو تعداد چاہیے لیکن عورت کو معیار چاہیے...... Quality چاہیے اور یہ Quality کچھ بھی ہو سکتی ہے.... صحت کی، عہدے کی، دولت کی..... لیکن مرد کی طرح عورت کا یہ فطری رجحان بھی Domesticate ہو کر Social Restrictions کے تابع ہو گیا ہے لیکن کئی مردوں اور عورتوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا..... میرے ساتھ بھی یہی ہوا مسٹر شانو..... اور اس کے پیچھے صرف آنے والی نسل کی صحت اور تندرستی کو یقینی بنانے کے لیے بہتر سے بہتر مرد سے حاملہ ہونے کا جذبہ ہے..... جب ایک مرد اعتماد سے بات کرتا ہے، آپ کی بات بڑے انہماک سے سنتا ہے، آپ سے اثر پذیر ہوتا ہے، خوش طبعی کا اظہار کرتا ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں میں آپ کے آرام کا خیال رکھتا ہے تو یقین کرو کہ وہ آپ سے جنسی نوازشوں کا آرزومند ہے..... بالکل اسی طرح جیسے مورنی کو رجھانے کے لیے مور رقص کرتا ہے لیکن اس کا مقصد محض رقص نہیں ہوتا بلکہ وہ مورنی کو اپنے بڑے بڑے گھنے اور رنگین پنکھ دکھا کر یہ کہنا چاہتا ہے کہ دیکھو میں کتنا اسمارٹ ہوں کہ جنگل میں درپیش اتنے خطرات کے باوجود میرے یہ بھاری پنکھ صحیح و سلامت ہیں..... میرے ساتھ آ جاؤ..... میں تمہارا خیال رکھ سکتا ہوں..... میں تمہیں محفوظ رکھوں گا..... مسٹر شانو..... میری بھی یہی پرابلم ہے..... شادی سے پہلے جب تم نے مجھے اپنی پرابلم بتائی تو میں نے سوچا کہ کسی اسٹیج پر ہم دونوں اکٹھے مل کر یہ پرابلم حل کرنے کی کوشش کریں گے.... لیکن..... تم نے تو....'' تانیا نے جملہ ادھورا چھوڑ کر پرس سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور صوفے پر بیٹھ کر کش لگانے لگی۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

شانو بڑی دیر سے بیڈ پر بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر بہت دیر بعد اس نے تانیا کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے تم نے طلاق کا فیصلہ کر لیا ہوگا....'' تانیا نے اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر ایش ٹرے میں سگریٹ بجھاتے ہوئے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

''چلو'' شانو نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اگر تم سوچ رہے ہو کہ گھر چل کر تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں یہ بتا دوں کہ تم کسی غلط فہمی میں ہو...... میں ہوٹل میں شفٹ ہو رہی ہوں.... ابھی'' تانیا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''نہیں.....ابھی ہم گھر نہیں جا رہے ہیں.....چلو اٹھو۔''

''کہاں؟'' تانیا نے محتاط لہجے میں دریافت کیا۔

''ڈاکٹر خشوگی کے پاس'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''خشوگی کے پاس؟''

''ہاں...'' شانو کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی ''ہم دونوں نے اسے الگ الگ کنسلٹ کیا ہے....اب ہم اس سے ایک ساتھ ملیں گے.....کیونکہ.....کیونکہ.....ہم دونوں کی پرابلم بھی ایک ہے.....''

تانیا اسے حیرت اور بے اعتباری سے دیکھنے لگی۔ شانو بیڈ سے اٹھ کر تانیا کے پاس آیا، اس کا ہاتھ پکڑا اور واپس آ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ تانیا نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک تشکیک تھی۔

''لیکن ڈاکٹر خشوگی کو ملنے سے پہلے ایک ضروری کام باقی ہے۔'' شانو نے سائڈ ٹیبل پر رکھا فون اٹھا کر ریسیور کان سے لگایا اور کہا ''ہیلو۔''

تانیا نے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''یس.....مسٹر شانو'' ڈاکٹر کی آواز آئی۔

''ڈاکٹر خشوگی پلیز.....دو گھنٹے کے لیے لائٹ آف کر دیں....ہمیں ابھی بہت کچھ Discover کرنا ہے۔''

شانو نے مسکرا کر تانیا کے ابھی تک حیرت زدہ چہرے کو دیکھا اور اسے کشادہ بیڈ پر ہولے سے پش کیا۔ عین اسی وقت اندھیرا ہو گیا۔

پناہ گاہ کی تلاش

سلیم خاں ہمراز (کولکاتہ)

وہ کریہہ منظر کینوس پر ابھر رہا تھا۔

گدھوں سے ڈھکا آسمان، خون کی بارش، سرخ پانی کے دریا، جلتی لاشیں، برہنہ داغ دار جسم۔ کتنا خطرناک منظر گذشتہ تیس برسوں سے اس نے بار بار دیکھا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے وہ مسلسل یہ کوشش کرتا رہا کہ اس منظر پر خوب صورت رنگوں کے برش پھیر دے۔ لیکن کچھ عرصہ بھی گذرنے نہیں پاتا کہ وہ سارے رنگ دھل جاتے اور وہی خطرناک منظر کینوس پر ابھر آتا۔ آرٹسٹ بدلتے جا رہے تھے لیکن ہر آرٹسٹ سفیدی کا برش لیے کینوس تک آتا اور پھر نئے رنگ اور نئے برش کے ساتھ وہی بربریت کی تصویر پینٹ کرنے لگتا۔

اس منظر کو مٹانے کے لیے وہ اپنی لائبریری میں برش اور سفیدی تلاش کرنے لگا۔ یہ اس کی اپنی بسائی ہوئی دنیا تھی۔ ریکس میں سجی کتابوں کے گھروں میں اس کے کردار تھے۔ ڈھیر ساری دوسری کتابیں بھی تھیں۔

''آج پھر تم اس منظر سے گھبرا کر ہماری دنیا میں آگئے۔ قریب ہی سرگوشی ہوئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کا اپنا تخلیق کردہ کردار تھا۔'' ''تم۔ تم کیوں باہر آگئے۔ کتاب سے؟''

''میں ان سیکڑوں کرداروں کی نمائندگی کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' ''تمہارے چہرے سے لگتا ہے جیسے تم آج پھر کوئی کردار تخلیق کرو گے۔'' ''اور ہم نہیں چاہتے کہ ہم میں اضافہ ہو'' ''کیوں؟''

''اس لیے کہ تم میں سچ بولنے کی طاقت نہیں۔ سچ کی عریانی سے تم آنکھیں بچاتے ہو اور اسے جھوٹ کا لباس پہنا کر ہمیں تخلیق کرتے ہو۔'' ''نہیں میں جھوٹ نہیں کہتا۔'' ''تمہارے جھوٹ کا زندہ نشان ہم ہیں۔ تمہارے جنم کردہ کردار، تم بھی جھوٹ نہیں ہو۔

''میں جھوٹی کہانیاں نہیں لکھتا۔''

''اچھا۔'' کردار نے طنزیہ کہا۔ ''تم ہمیں کہاں سے تراشتے ہو، میرا مطلب ہے ہمیں جنم دینے کے لیے تخلیقی عناصر کہاں سے یکجا کرتے ہو۔''

''اسی دنیا سے جہاں میں رہتا ہوں۔ میں انسان کو اس کی شخصیت کا وہ زاویہ دکھاتا ہوں جہاں اس کی نظر نہیں جاسکتی یہی روپ تم ہو۔''

''تو ہم تمہاری دنیا کے انسانوں کے روپ ہیں۔'' ''ہاں'' ''ہاہا... ہاہا... ہم جیسا تمہاری دنیا میں ایک انسان بھی نہیں۔ ہم تمہاری خیالی دنیا کی نیکیوں کا روپ ہیں۔ تم نے ہمیں جھوٹ کی صلیب پر لٹکا رکھا ہے۔ ہم کتنی

اذیتوں سے جی رہے ہیں، تم نہیں جانتے، ایسا جیون کیا جس کی کوئی پہچان نہ ہو۔''

''کیا؟ میں نے تمہیں پہچان دی ہے۔ میں نے تمہیں زندگی دی ہے یہ دیکھو۔ خطوط کے ڈھیر۔ کتنے لوگ تمہیں جانتے ہیں۔ تمہاری تعریفیں کرتے ہیں۔ میں نے تمہیں امر بنا دیا ہے۔ میں بے ربط تحریروں کے ٹکڑے۔ بے معنی لفظوں کے جال تو نہیں بنتا۔ تمہیں محنت سے پینٹ کرتا ہوں۔''

''ہاں یہی تو مصیبت ہے کہ تم ہمیں مکمل صورت دیتے ہو۔ ہمیں زندگی دیتے ہو۔ ادھورا نہیں چھوڑتے اور ہم جیون کے زہر کا قطرہ قطرہ پینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان بے ربط بے ہنگم لفظوں سے یہ تو ہوتا ہے کہ ہم جنم نہیں لے سکتے۔ شکلیں بنتی بھی ہیں تو ایسی جیسے ناجائز بچہ تکمیل سے پہلے ہی کوکھ سے باہر پھینک دیا گیا ہو۔''

''تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ میں نے نہ صرف تمہیں مکمل شکل دی ہے بلکہ کتابوں کے محفوظ گھر بھی دیے۔''

''لیکن ہمیں تم نے بدی کے خلاف لڑنے والے بے جان ہتھیار بنا دیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کے ہم جیسے کمزور کردار اس منظر کو نہیں بدل سکتے۔ تم ہمیں تخلیق کیوں کرتے ہو۔''

''میں نے ہمیشہ قلم کے ذریعہ جنگ کی ہے۔ تم نہیں جانتے ہم میں کتنی طاقت ہے۔''

''ہم نے انسانوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔''

''کہیں بھی نہیں'' انسان وہیں ہے جہاں سے نکلا تھا۔ جہالت اور طاقت جیسی منفی قوتوں کو متوازی حکمرانی آج بھی ہے تب بھی تھی۔ تمہارے علم نے ہم جیسے مجہول کرداروں کی دنیا بسائی ہے اور تم جیسے انسانوں کو مصلحت پسند بنا دیا ہے۔ تم وحشیوں کے ہاتھوں سے تلوار نہیں کھینچ سکتے۔ ان سانپوں کو نہیں کچلتے۔ ایک طرف ان سانپوں کو پالتے ہو، دوسری طرف ان سانپوں کے خوف سے چیخنے والوں کو تسلیاں دیتے ہو کہ یہ سانپ بے ضرر ہیں ان کے منہ میں دانت نہیں۔ پھر جب سانپ ڈس لیتے ہیں تو لکیریں پیٹی جاتی ہیں۔ تمہارا علم انہیں لفظوں کا جھوٹا مرہم دیتا ہے۔ نفرت کا ڈھونگ کیا جاتا ہے۔

کیا تم سب مر گئے ہو؟'' نہیں ہم زندہ ہیں۔''

پھر عمل کہاں ہے؟ عمل کے بغیر علم کی کیا حیثیت ہے کردار نے قہقہہ لگایا اور کتاب میں چھپ گیا۔

''عمل؟''

اور پھر یہ ہوا کہ شہر میں بجھی ہوئی بارود کے سرنگوں کو آگ لگ گئی۔ شہر جلنے لگا۔ گدھ لاشوں پر جھپٹنے لگے ننگے جواں جسموں کو داغدار کیا جانے لگا۔ گھروں کی چھتوں سے شعلے اٹھنے لگے۔ وردی اور معمولی لباس کے فرق مٹ گئے۔ وہ منظر کینوس پر پوری آب و تاب کے ساتھ ابھرتا جو تیس سال سے مسلسل پینٹ ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی نے کہا آؤ ہم بھی چوہوں کی طرح محفوظ بلوں میں چھپ جائیں۔ لیکن وہ پتھر بن گیا۔ اس کی بیوی اور بچوں نے اس پتھر میں خود کو غیر محفوظ محسوس کیا اور چوہیوں کی طرح محفوظ بلوں میں پناہ لی۔ وہ تنہا اس آگ اور خون کے حصار میں کھڑا اس منظر پر سفیدی کا برش پھیرنے لگا۔

لوگوں نے دیکھا وہ کئی دن کا بھوکا ہاتھ میں برش لیے اسی طرح سفیدی پھیر رہا تھا۔ اس کے اطراف کالے ناگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ کسی نے کہا بل میں چلے جاؤ۔ سانپوں کی پیاس بجھنے کے بعد لاٹھی لیے آنا اور لکیر

پیٹ کر جلی حرفوں میں نام چھپوانا۔ لیکن اس کے کرداروں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ تم کیسے خدا ہو، جھوٹے، مجبور و بے بس!!

پھر اس ایوان سے بھی شعلے بلند ہونے لگے جہاں اس نے تاریخ، مذہب، فلسفہ، کلاسیکی و جدید علوم کا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ آگ نے سارے لفظوں کو چاٹ لیا تھا اب وہاں راکھ کا ڈھیر تھا۔ یہ تمیز کرنا ناممکن تھا کہ اس میں قیمتی لفظوں کی راکھ کون سی ہے اور عریاں تصویروں کی کون سی! اس کے کردار جلتے گھروں سے باہر آگئے۔

پیاس کے مارے کرداروں نے اپنے خدا کی تلاش شروع کر دی لیکن اب وہ کینوس کے پاس بھی نہ تھا۔ وہ کریہہ منظر بہت واضح ہو گیا تھا۔ اس کی چھوڑی ہوئی سفیدی اور برش سرخ ہو گئے تھے۔ کالے ناگ بھی وہاں سے ہٹ گئے تھے۔

زمین پر سرخ لکیروں کا جال تھا ''خدا کہاں؟'' بے گھر کرداروں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔ ''آؤ تلاش کریں۔''

''ہم کہاں جائیں.... ہم کہاں جائیں؟''

پیاسے کردار کنویں تک پہنچے۔ ایک کردار نے کنویں میں جھانکا۔

''وہ دیکھو خدا۔'' وہ سب جھک پڑے۔ ان کے خدا کی مسخ شدہ لاش پانی پر تیر رہی تھی۔

''خدا مر گیا....''

''ہاں خدا مر گیا....''

''ہمارا خدا مر گیا....''

''آؤ چلو شاید قیامت آگئی۔ ہمیں اٹھایا نہیں گیا۔ ہم شاید بہرے ہو گئے جو صور کی آواز ہم نے نہیں سنی۔ چلو ہم خود ہی اوپر اٹھ جائیں اور محاسبہ دیں۔'' کرداروں نے کہا۔

''ٹھہرو'' خدا کی لاش سے آواز آئی۔

''تمہارا خدا مر گیا۔'' لیکن میں ''تم'' ہو گیا ہوں۔ ایک کردار!!

مجھے اپنے ساتھ لے چلو اور کسی کتاب میں چھپا دو۔''

''آؤ ہمارے ساتھ... ہم خدا کے بغیر ہی جی لیں گے۔''

کرداروں نے یک زبان ہو کر کہا....

''چلو کسی کتاب میں پناہ ڈھونڈیں!!''

ممتا کی زنجیر

ڈاکٹر نرگس جہاں باروی (پٹنہ)

وہ بچپن سے رحیمن بوا سے مانوس تھی۔ بھولی بھولی، نرم نرم سی.... گھر میں کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتی۔ ننھے ننھے ہاتھوں سے سر دبانے کی ناکام کوشش کرتی۔ اپنی پیاری پیاری من موہنی باتوں سے دل بہلاتی۔

وجاہت حسین شہر کی جانی مانی شخصیتوں میں شمار ہوتے، اپنا کاروبار تھا، اچھی گذر رہی تھی۔ چار لڑکے، تین لڑکیوں میں رابعہ سب سے چھوٹی تھی۔ بیگم وجاہت زیادہ تر علیل رہا کرتیں، بچوں کی نگہداشت رحیمن بوا کے ذمہ تھی۔ بوا کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ سسرال والوں نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تو ایک رات ہمیشہ کے لیے انہوں نے گھر چھوڑ دیا اور وجاہت حسین کے یہاں بچوں کو کھلانے پر معمور ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ بیگم صاحبہ کی طویل علالت سے گھر کی تمام ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر آتی گئیں جسے وہ بڑے خلوص و لگن سے نبھاتیں۔ رابعہ کی پیدائش کے بعد بیگم وجاہت ذی فراش ہو گئیں تھیں۔ رابعہ رحیمن بوا کی گود میں پلی بڑھی۔ بہن بھائی اسے رحیمن بوا کی بیٹی کہہ کر چڑھاتے۔ وہ اپنے تمام کام انہیں سے کراتی۔ دلیہ بوا سے کھاؤں گی، دودھ بوا پلائیں، کنگھی بوا کریں۔ بچپن میں بوا اس کے چونچلے اٹھاتی اٹھاتی تھک تھک جاتیں جو کبھی بوا علیل ہو جاتیں پھر تو اس کی بے چینی دیکھنے کے لائق ہوتی۔ تتلیاں پکڑنا بھول جاتی، بات بات بہانے سے رونا بھی آتا۔ گڑیوں سے کھیلنے میں بھی دل نہیں لگتا، بولائی بولائی سی ان کا پلو پکڑے دن رات ان کے بستر سے لگی بیٹھی رہتی۔ جب وہ ٹھیک ہو جاتیں تو پھر اسے طوطا مینا کی کہانیاں سناتیں۔ او میری ننھی پری، آ جا ری نندیا تو آ۔ میٹھے سروں میں لوریاں گا کر اسے سلاتیں، اس کے الجھے بال سنوارتیں، نیند اس کی آنکھوں میں گھل جاتی۔ دھیرے دھیرے ریشمی پلکیں جھپکنے لگتیں وہ پرستان کی سیر کرنے لگتی، جہاں پریاں اپنے خوبصورت نازک رنگ برنگ کے چمکیلے پنکھ پر بیٹھا کر پرستان لے جاتیں۔

بوا اس کی جان تھیں، وہ بوا کے بنا نہیں رہ سکتی تھی۔ سسرال کیسے جاؤ گی بیٹا مجھے چھوڑ کر، کبھی بوا ہنس کر اس سے پوچھتیں۔

تم بھی ساتھ چلنا بوا۔ وہ بڑے اطمینان سے کھیل میں مصروف جواب دیتی۔ شادی کا تصور اس کے نزدیک نئے نئے کپڑے، اچھے اچھے کھانے مٹھائیاں تھیں۔ شگن باجی کی شادی میں اس نے دیکھا تھا کس طرح نئے چمکیلے کپڑے گہنے پہنے دولہن بنی وہ دولہا بھائی کے پہلو میں بیٹھی تھیں۔ دولہا بھائی پھولوں کا ہار پہنے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی دولہن بننے کے لیے مچلنے لگی، اسے شادی کا بڑا شوق تھا۔ اس کی معصوم ادا دیکھ کر سب ہنستے تھے۔

رابعہ کا بچپن محبتوں کے سائے میں تتلیاں پکڑتے چھپا چھپی کھیلتے نت نئی شرارتیں کرتے گذرا تو شباب تعلیم کی رہ گذر پر۔ اب وہ ایک کامیاب M.B.B.S., M.D. ڈاکٹر اور شہر کے مشہور گورنمنٹ ہاسپٹل میں باوقار

پوسٹ پر تھی۔ اپنی نیک مزاجی اور مسحور کن شخصیت سے اپنے سرکل میں یکساں عزیز۔ ابو امی اب اس کی شادی جلد کر دینا چاہتے تھے۔ انہیں مقامی رشتہ کی تلاش تھی تا کہ اس کی سروس متاثر نہ ہو، ہوسپٹل جانے کی آسانی قائم رہے۔

وجاہت حسین کے دیرینہ دوست خان صاحب کے توسط سے مناسب رشتہ مل گیا۔ گھر خاندان لڑکے کی نوکری وغیرہ کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کر لینے کے بعد وجاہت حسین نے حامی بھری اور رابعہ ندیم کی شریک حیات بن کر آنسوؤں کی چھاؤں میں بابل کی دعاؤں کی سوغات لیے اپنی سسرال آگئی۔

سہاگ رات کو ندیم نے اپنے گھر کے حالات اسے بتائے۔ وہ آٹھ بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ چنانچہ والدین کی پہلی اولاد ہونے کا حق ادا کرنا چاہتے تھے۔ والدین کے خوابوں میں رنگ بھرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ اپنی رفیقۂ حیات سے فرائض کے اس سفر پر ہمراہی کے متمنی تھے۔

سہاگ کی خوشبو سے معطر کمرہ خوبصورت نازک پھولوں سے سجا ہوا، رومان پرور ماحول!

اس خوابناک جذباتی لمحے ہی اس نے ندیم سے ہر قدم ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔

ابتدائی دنوں میں نئی دولہن کے خوب چو چلے، خوب خاطر داریاں ہوئیں ساس وار لی جاتیں نندیں فدا ہوتیں۔ وہ خود کو بہت قسمت والی تصور کرتی، رفتہ رفتہ شب و روز معمول پر آگئے۔

اس کی مصروفیت بڑھتی گئی، بڑی بہو ہونے کے ناطے گھر کی چھوٹی بڑی ذمہ داریاں اس کے سر ہوتی گئیں وہ انہیں خلوص دل سے نبھاتی۔ اس کی بلیغ کوشش ہوتی کہ وہ ندیم کی مرضی اس کی رضا کا پاس رکھے انہیں شکایت کا موقع نہ ملے۔ اسے سہاگ رات کو ندیم سے کیا ہوا وعدہ اپنے فرائض کو بہتر طور پر انجام دینے کی یاد دلاتا رہتا۔ ندیم اس کے ممنون رہتے۔ ساس خوب خوب دعائیں دیتیں۔ دیور نند آگے پیچھے پھرا کرتے۔ وہ دن رات گھن چکر بنی اپنے بڑے ہونے کا فرض نبھاتی رہی۔

ہاسپٹل اور گھر دو خانوں میں بٹ کر وہ خود کو بھول گئی۔ اس کی سحر انگیز شخصیت کہیں کھو گئی۔ نرم نرم سی گداز گداز سی۔ ستاروں جیسی چمکتی آنکھوں والی، دہکتے رخساروں والی رابعہ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک گلابی رخساروں کی تازگی کی جگہ ذمہ داریوں کی بوجھ سے دبی ایک تھکی تھکی پژمردہ پژمردہ سی عورت صرف ڈاکٹر رابعہ تھی۔ جہیز میں ملا میک اپ کا قیمتی سامان پڑا پڑا سوکھ چکا تھا، کچھ چیزیں اس کی نندوں کے استعمال میں رہیں۔ صبح بھاگم بھاگ سبھوں کے لیے ناشتہ کھانا تیار کرنا پھر ہاسپٹل کے لیے تیار ہونا ہمیشہ یہ خوف کہ کہیں لیٹ نہ ہو جائے۔ رات کو تھکن سے چور بستر پر گرتے ہی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔ ان تمام پریشانیوں کے باوجود وہ اپنی بساط بھر فرض نبھاتی رہی۔

پہلی تاریخ کو شام میں ندیم اس کے منتظر رہتے وہ اپنی پوری تنخواہ ان کے حوالے کر دیتی۔ ہمیشہ خرچ زیادہ ہونے کا رونا رو کر ندیم مہینے بھر کا جیب خرچ اتنا مختصر دیتے کہ وہ بہ مشکل اپنی ضرورتیں پوری کر پاتی۔ پچھلے دو سال سے وہ اپنے جوتے نہیں خرید سکی تھی، موسم کی مناسبت سے اس کے پاس لباس نہیں تھے۔ جہیز کے پرانے کپڑوں سے ہی کام چلانا پڑتا۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اسے ندیم کی طرف دیکھنا پڑتا۔

چھوٹی نند کی شادی تھی جہیز کے اخراجات زیادہ تھے۔ ندیم کی ایماء پر اس نے بخوشی اپنے جڑاؤ زیورں

کے دوسیٹ دے دیئے۔ میکے سے ملے جہیز کے کئی قیمتی جوڑے جو اسے بے حد پسند تھے اور نئے رکھے ہوئے تھے وہ ساس نے بیٹی کو دینے کے لیے مانگ لیا جسے خوش دلی سے اس نے دے دیا۔ ندیم اس کی اس ادا سے بہت خوش تھے اس کے ممنون تھے۔ گھر کے بھی افراد اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے۔ یہ بات جب میکے میں اپنی چھوٹی بھابھی کو بتایا تو اس کی بیوقوفی پر وہ جھلا گئیں۔ ارے نہیں بھابھی میں نے اپنی مرضی سے دئے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ ان سے بدگمان ہو رہی ہیں۔ وہ ہنستے ہوئے بولی ٹھیک ہے، بنو! ایک دن سمجھ میں آجائے گا یہ لوگ تمہارے کتنے خیر خواہ ہیں۔ بھابھی جل کر بولیں۔

وقت کا پرندہ اپنی رفتار سے مائل بہ پرواز تھا۔ اس درمیان اس نے تین بچوں کو جنم دیا۔ دو خوبصورت تندرست بیٹے اور اس سے چھوٹی پیاری پیاری سی بیٹی۔ ایک مثالی محبت کرنے والی ماں کی طرح بچوں پر وہ اپنی جان چھڑکتی۔ بچوں کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش بھی وہ ٹال نہیں سکتی تھی۔ ان کے لاڈ پیار کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت پر بھی وہ بہت دھیان دیتی۔ وہ اسکول جانے کے لائق ہوئے تو شہر کے بہترین اسکول میں ان کا داخلہ کرانا چاہا۔ ندیم مہنگے اسکول میں بچوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔ اس نے اب تک ندیم کے ہر فیصلے پر سر جھکایا تھا لیکن آج اس نے اپنے بچوں کے روشن مستقبل کی خاطر ندیم کی حکم عدولی کرتے ہوئے بچوں کا داخلہ شہر کے بہترین اسکول میں کرا دیا۔

ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو بچوں کی فیس دیتے ہوئے ندیم سے اس کی ایک جھڑپ معمول بن گیا تھا۔ وہ اسے خوب برا بھلا کہتے۔ رئیس زادی ہونے کا طعنہ دیتے، ضدی اور نافرمان بیوی کا خطاب تو وہ بچوں کے داخلہ کے وقت ہی دے چکے تھے۔ اس کی زبان سے اکثر یہ بات نکلتے نکلتے رہ جاتی کہ ہر ماہ وہ بھی تو ایک خطیر رقم ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ ان کی اپنی تنخواہ سے زیادہ۔ بات بڑھنے کے خوف سے وہ خاموشی اختیار کر لیتی۔ اپنے بچوں کی خاطر وہ سب چپ چاپ برداشت کرتی رہی۔

ذمہ داریاں تھی کہ بڑھتی جارہی تھیں وہ ہر ممکن کوشش کرتی کہ گھر کا ماحول خوش گوار رہے۔ پھر بھی غلطی سے اگر کسی کو کچھ کمی ہو گئی تو ندیم کی پیشانی پر کئی بل پڑ جاتے۔ گھر والوں کا خیال رکھنا آپ کا فرض ہے! وہ اسے اس کا فرض یاد دلانے لگتے۔

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ سبھوں کا لنچ باکس، ناشتہ بنانے کے چکر میں اسے کھانے کا موقع نہیں مل پاتا یا سبھوں کا لنچ باکس دیتے ہوئے اپنے لیے کچھ نہیں بچا پاتی تو کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ بھوکی ہاسپٹل جا رہی ہے۔ سب اپنی اپنی راہ لیتے، ساس کی طرف سے مشورہ ملتا۔ کوئی حرج نہیں دولہن ہاسپٹل کے کینٹین سے کچھ منگوا کر کھا لینا۔ وہ زخمی زخمی سی نظروں سے انہیں دیکھتی رہ جاتی۔ اسے موقع پر اسے رحیمن بوا بہت یاد آئیں۔ ان کی محبتیں، ان کی شفقتیں یاد آجاتی۔ اسکول کے لیے تیار کراتے ہوئے کس طرح بہلا پھسلا کر دوڑا دوڑا کر اس کے منہ میں لقمہ ڈالتی جاتیں۔ میکے کا آرام یاد آتا تو وہ آزردہ ہو جاتی، اتنی بے لطف اتنی بے کیف زندگی کے خواب تو اس نے نہیں بنے تھے۔ گھر، ہاسپٹل، الجھنیں۔ کبھی اس کا دل چاہتا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھاگ جائے۔ مایوسی کے ان لمحوں میں وہ اپنے بچوں کی خاطر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش میں بے حال ہونے لگتی۔

دن رات کی شدید محنت اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اس کے ناتواں کاندھے اب تھکنے لگے تھے۔ اس کی

صحت خراب ہوتی گئی، ہائی بلڈ پریشر کے ساتھ شوگر کا لیول بھی بڑھ گیا تھا۔ ہاسپٹل سے واپس ہوتے ہوئے وہ تھک کر نڈھال ہو جاتی۔ ایسے میں چائے کے ایک گرم پیالہ کی خواہش نری خواہش ہی رہ جاتی۔ اس کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ سبھی اپنی اپنی دلچسپیوں میں مصروف۔ بچوں کے تعلیمی اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ ندیم اس سے شاکی رہنے لگے تھے۔

ادراک کے دروازے دھیرے دھیرے وا ہوتے گئے۔ حقیقت کی سنگلاخ زمین پر اس نے خود کو تنہا پایا۔ چاہتوں کی بوند بوند کو ترستے، پیاسی پیاسی، آبلہ پا!! اپنے بیتے دنوں کے سود و زیاں کا حساب لگاتے ہوئے زیست کی فائل پر ''ریٹرن'' کا خانہ اسے سادہ نظر آیا۔ آگے پیچھے کہیں کوئی شجر سایہ دار نہیں۔ دور دور تک سناٹا ہی سناٹا، پر ہول سناٹا۔

حد تو اس دن ہوگئی جب اس نے بڑے بیٹے کے I.Sc. پاس کرنے کے بعد شہر کے مشہور انجینئرنگ کالج میں داخلہ کے لیے اپنے پروویڈنٹ فنڈ سے رقم نکالنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ندیم اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ حسب معمول وہ زیادہ خرچ کرنے کے خلاف تھے۔ دونوں میں جھڑپ ہونے لگی۔ ندیم کی آواز بلند ہونے لگی گھر کے سبھی افراد وہاں پر اکٹھا ہو گئے۔ کیا قصہ ہے بھابھی؟ آپ گھر میں ہمیشہ فساد کیوں پھیلائے رہتی ہیں؟ جب دیکھئے بھیا سے جھگڑتی رہتی ہیں؟ منجھلے دیور نے آنکھیں دکھائیں۔ کمانے والی بہو جو ٹھہریں۔ ساس نے طنزیہ کہا۔ میں! میں گھر میں فساد کرتی ہوں؟ وہ ہکا بکا تھی!!! کیا میں اپنے بچوں کے لیے بہتر سوچ بھی نہیں سکتی؟ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

ممی پلیز! پاپا بلڈ پریشر کے پیشنٹ ہیں آپ خواہ مخواہ انہیں پریشان نہ کیا کریں۔ بچپن سے ہم لوگ یہ قصہ دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کا بڑا بیٹا آگے بڑھ کر بیزاری سے بولا۔ ایک توقف کے بعد وہ کہنے لگا۔ ممی تعلیم معمولی اسکول میں بھی دلائی جا سکتی ہے اگر گھر میں ہماری پڑھائی پر آپ تھوڑی محنت اور کر لیتیں، بہترین اسکول کا انتخاب تو آپ نے اپنا سوشل اسٹیٹس بڑھانے کے لیے کیا ہے۔ اتنی ریاضتوں کا یہ صلہ! وہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

رات بھر وہ مضطرب رہی، پھر اس نے ایک فیصلہ کیا۔ صبح سبھوں کے بیدار ہونے سے قبل وہ اپنا مختصر سامان لے ہاسٹل آگئی، کبھی گھر واپس نہ جانے کے لیے۔

ممتا کی زنجیر وہ توڑ چکی تھی۔

پریت نہ کریو کوئے

عامر مصطفیٰ رضوی (امروہہ)

یونانی دیومالا کا سنہرے گھونگرالے بالوں والا نو سال کی عمر کا بچہ ہاتھوں میں چھوٹی سی کمان لیے اپنے ننھے پروں سے فضا میں پرواز کر رہا تھا۔ اس کی متجسس نگاہیں شکار کی تلاش میں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔

یکبارگی اس نے خوشی سے قلقاری ماری ''اہا! شکار.....''

کندھے پر بندھے ترکش سے تیر نکال کر اپنی کمان میں چڑھایا اور خلا میں چھوڑ دیا.....

☆☆☆

رات کے اس پہر یک وتنہا کسمپرسی اور بے کسی کے عالم میں بے مونس و غمخوار سڑک پر کھڑی سوچ رہی ہوں کہ اب کہاں جاؤں؟..... شاید ہی نہیں بلکہ یقیناً اللہ کی اس وسیع و عریض دنیا میں مجھ جیسا بدنصیب کوئی اور نہ ہوگا۔ آج میری عمر بیس سال ہے۔ گذشتہ عمر کے ماہ و سال کو یاد کر کے آنسو بہا رہی ہوں۔ پندرہ سال کی عمر تک اپنے ماں باپ کے سایۂ شفقت کی جنت میں گذارتی رہی۔ اس سال میری ماں کا انتقال ہو گیا اور ایک سال بعد میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ جب سے آج تک اپنی سوتیلی ماں کے ظلم وستم کا ہر ہر لمحہ ایسے شکار رہی کہ زندگی ضیق معلوم ہونے لگی۔ مگر پھر بھی باپ کی شفقت سے ان مظالم کا کسی حد تک تدارک ہو جاتا تھا۔ اور میں برداشت کرتی رہی۔ دو سال قبل چند روز بیمار رہ کر باپ بھی جنت الفردوس کو سدھار گئے۔ مرنے سے قبل مجھے گلے لگا کر بہت روئے اور کہا کہ ''بیٹی! تجھے اکیلا چھوڑے جا رہا ہوں۔ مگر یاد رکھ دنیا میں جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ تجھے خدا کے سپرد کیا۔'' ان کے انتقال کے بعد میری سوتیلی ماں کو میرے اوپر مظالم توڑنے کی پوری پوری آزادی مل گئی۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو ضرور ایسی موت کو گلے لگا لیتی۔

آج تو حد ہو گئی، رات کو کھانے کے بعد پلیٹیں دھو رہی تھی۔ چینی کی ایک پلیٹ میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی۔ اتنے سے قصور پر اتنی سزا ملی کہ میرے جسم پر پڑے ہوئے نیل اس کا منہ بولتے ثبوت ہیں۔ پیمانۂ صبر ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔

سود و زیاں سوچے بغیر اللہ کے بھروسے پر گھر چھوڑنے کا تہیہ کر لیا۔ ماں کے سو جانے کے بعد چند جوڑی کپڑے گٹھری میں باندھے اور برقع اوڑھ کر تن بہ تقدیر گھر سے نکل آئی۔

ایک غیبی ترغیب پر میرے قدم اسٹیشن کی طرف اٹھ گئے جہاں چوبیس گھنٹے گہما گہمی تو رہتی ہی ہے مگر کوئی ایک دوسرے کا پرسان حال نہیں ہوتا اور ہر شخص نفسی نفسی میں مبتلا رہتا ہے۔ میرے تحفظ کے لیے اس ماحول سے بہتر کوئی اور جگہ نہ تھی۔

پوری رات سوتے جاگتے گذاری۔ صبح کا اجالا ہونا شروع ہوگیا تھا مگر آج باسی روٹی کا ٹکڑا اور پھیکی چائے بھی قسمت میں نہیں تھی۔ اللہ کا نام لے کر سڑک پر آگئی۔ نہ کوئی منزل، نہ کوئی جادہ، دن بڑھتا چلا جارہا تھا۔ اور پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تھے۔

بھوک کی ناقابل برداشت اذیت کے آگے اپنی عزت نفس اور خودداری کو بالائے طاق رکھ کر ایک گھر کے دروازے پر جھجکتے ہوئے ہلکی سی دستک دی۔ ایک معمر خاتون دروازے میں آئیں۔ ان کے پرکشش چہرے پر ممتا کا نور برس رہا تھا۔ نرم مزاجی اور ہمدردی چہرے سے عیاں تھی۔ انہوں نے پوچھا ''کیا بات ہے؟''

میں نے بہت لجاجت سے کہا ''اماں جی کچھ کھانے کو مل جائے گا۔''

اماں جی نے بہت شفقت سے کہا ''آؤ۔ آؤ۔ اندر آجاؤ''

مجھے صحن میں بچھے ہوئے ایک پلنگ پر بٹھادیا اور کھانا میرے سامنے لاکر رکھ دیا۔ کھانے پینے کے بعد اماں جی نے پوچھا ''کیا بات ہے؟ کچھ مصیبت زدہ اور پریشان معلوم ہوتی ہو''

ایک مشفق اور مہربان چہرہ سامنے دیکھ کر ضبط اور برداشت کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنسوؤں کا سیلاب رواں ہوگیا اور میں نے اپنی پوری داستان کہہ سنائی۔

بڑی بی کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ پوچھا ''ملازمت کروگی؟''

''جی''

''ٹھیک ہے پھر یہیں رہ جاؤ''

اس طرح اس گھر میں سر چھپانے کے لیے باعزت طور پر جگہ مل گئی اور میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ تمام عمر اپنی محسن کے اس گھر کی خدمت میں گذاردوں گی۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری جس میں ایک پلنگ کے بعد تھوڑی سی جگہ اور تھی مجھے رہنے کے لیے دے دی گئی۔ جہاں میں نے اپنی کپڑوں کی گٹھری رکھ دی۔

دو تین روز ہی میں بڑی اماں کی ہدایت میں گھر کے کاموں کو سمجھ گئی۔ ایک دن میں نے پوچھا ''اماں جی! اتنے بڑے گھر میں آپ تنہا رہتی ہیں۔''

انہوں نے جواب دیا ''نہیں۔ میرا بیٹا میرے ساتھ رہتا ہے۔ دو بڑی لڑکیاں شادی کے بعد امریکہ چلی گئیں۔ میرا بیٹا اپنے کاموں کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے۔ ایک دو روز میں آجائے گا۔''

اور ایک دن۔

میں باورچی خانے میں کھانا پکانے کے انتظامات میں مصروف تھی۔ دروازے میں کچھ آہٹ سنائی دی۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا۔

کسی بھی لڑکی کے خوابوں میں آنے والا پرستان کا حسین و جمیل شہزادہ ایک سوٹ کیس ہاتھ میں لیے میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے ایک نامعلوم سی خلش دل میں محسوس ہوئی۔ جیسے ایک تیر دل میں پیوست ہوگیا ہو۔ ایسا کیوں ہوا۔ میں نہیں بتاسکتی۔ چند لمحے بے جان سی کھڑی اس بت آزر کو دیکھتی رہی۔ وہ متجسس نگاہوں سے گھر میں چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر پوچھا ''بی اماں کہاں ہیں؟''

میں نے اپنے حواسوں پر قابو پا کر جواب دیا "نہا رہی ہیں۔ آپ؟"

"وہ میری والدہ ہیں۔ تم کون ہو؟"

"میں ان کی ملازمہ ہوں۔"

وہ اپنا سوٹ کیس لے کر اندر کمرے میں چلے گئے۔ اس عرصے میں بی اماں بھی نہا کر باہر آ چکی تھیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ کمرے میں چلی گئیں۔ ایک بے نام سے جذبے کے تحت میرے دل میں بے چین خواہش ہو رہی تھی کہ ایک دفعہ اور ان کو دیکھوں۔ اسی وقت بی اماں کی آواز آئی۔ "شاہدہ! جمیل کے لیے چائے بنا دو اور کچھ ناشتے کے لیے بھی لیتی آنا۔" میں نے ان کے اور بی اماں کے لیے چائے تیار کی اور ٹرے میں لگا کر اس کمرے میں لے گئی جہاں وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ میز آگے سرکا کر ٹرے اس پر رکھ دی۔ اس لمحے دل کی عجیب کیفیت تھی جو میں بیان نہیں کر سکتی۔ قربت کے احساس سے دل معمول سے زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ روح رس کی پھواروں میں نہائی جا رہی تھی۔ پورا دن چور نگاہوں سے چھوٹے صاحب کو دیکھ کر قلبی سکون محسوس کرتی رہی۔ رات آئی۔ میں گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ البتہ حسن یوسف کا ایک سراپا میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ تمام رات سوتی اور جاگتی آنکھوں سے صرف ایک ہی خواب دیکھتی رہی۔

دن گذرتے گئے اور میرے دل میں لگی آگ اور زیادہ بھڑکتی رہی۔ بھڑکتی رہی۔ اکثر اپنے دل کو سمجھاتی کہ اس لاحاصل جذبے سے کیا فائدہ۔ کہاں تو اور کہاں چھوٹے صاحب! دونوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ یہ دوری کبھی ختم نہ ہوگی۔ جیسے دریا کے دو کنارے دور تک ایک ساتھ چلتے ہیں مگر فاصلہ اتنا ہی رہتا ہے۔ یا آسمان پر چمکنے والے چاند کو حاصل کرنے کے لیے چکور کتنی ہی اونچی اڑان بھرے مگر پھر بھی دور ہی رہتی ہے۔ یہ کمبخت دل میری ایک نہیں سنتا۔ ایسی تاویلیں دیتا ہے کہ میں لاجواب ہو جاتی ہوں۔ کہتا ہے محبت کرنا نہ جرم ہے نہ گناہ اور میں تجارت تو نہیں کر رہی کہ اس کے بدلے میں کچھ مانگوں۔ نہ یہ اختیاری چیز ہے۔ یہ تو وہ آگ ہے کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ خرد اور جنون کی کشمکش جاری رہی۔ میں اپنے دل کو بار بار سمجھاتی کہ اپنی حیثیت مت بھول۔ کہاں آقا، کہاں ملازمہ! یہ بھی سوچتی کہ اس حسن کے بدلے تیرے پاس کیا ہے؟ میری شخصیت میں حسن کا شائبہ تک نہ تھا۔ نہ گورا رنگ، نہ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح تراشے ہونٹ۔ نہ ہرنی کی سی بڑی بڑی آنکھیں۔ بلکہ اس کے برعکس اگر کسی شخص کی اتفاقیہ نظر میرے چہرے پر پڑ جائے تو وہ دوبارہ دیکھنے کا روادار نہ ہو۔

نہ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام۔ غذا بہت کم ہو گئی تھی اور راتیں زیادہ تر جاگ کر گذرتی تھیں۔ جسمانی طاقت روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ مگر میں اپنی کمزوری کسی پر ظاہر نہیں کرتی تھی۔ دن بھر روبوٹ کی طرح گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔

ایک رات کسی وقت آنکھ لگ گئی تو اپنے ماں باپ کو خواب میں دیکھا۔ ایک خوبصورت باغ میں اپنی باہیں پھیلائے کھڑے ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں "بیٹی! اب تیری جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ آ۔ ہمارے پاس آ جا۔ میں دوڑ کر ان کے سینے سے لپٹ گئی۔ آنکھ کھلی تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

اس خواب کے چند روز بعد ہی ایک قیامت کی رات میرے اوپر گذری۔ رات کو سونے کے لیے لیٹی تو

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ دل کی دھڑکن اتنی بے قابو ہو رہی جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ تمام رات کروٹیں بدلتی رہی۔ نارسائی کے درد و کرب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر سینے میں موجزن تھا اور میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ اس کیفیت کا درد آشنا صرف وہی ہو سکتا ہے جو خود اس مقام سے گذرا ہو۔ ''گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے''۔ رات کے کس حصے تک اس کشمکش سے نبرد آزما رہی، کچھ خبر نہیں۔

☆☆☆

بی اماں نے آواز دی ''جمیل بیٹا! ذرا دیکھو تو شاہدہ آج ابھی تک نہیں اٹھی۔ حالانکہ وہ صبح ہی ناشتہ تیار کر دیا کرتی تھی۔''

جمیل نے کوٹھری کے دروازے پر جا کر آواز دی۔ ''شاہدہ۔ شاہدہ۔'' مگر کوئی جواب نہ پا کر کواڑوں پر ہاتھ رکھا تو وہ کھلتے چلے گئے۔

شاہدہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں ایک انہونی امید میں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جیسے زبان حال سے کہہ رہی ہو:

امید شب بھر دیتی ہے لوری
آئے اب آئے، آئے اب آئے

روح جسم کے قفس سے آزاد ہو چکی تھی۔ ایک ہاتھ پلنگ کی پٹی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اور دو انگلیوں میں ایک کاغذ دبا ہوا تھا جس پر لرزتے ہاتھ کی تحریر سے لکھا تھا:

جو میں ایسا جانتی پریت کیے دکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی پریت نہ کریو کوئے

چھوٹے صاحب کی آنکھوں سے گرتے ہوئے مسلسل آنسو اس کاغذ پر جذب ہو رہے تھے۔

خوشبو کا سفر

ڈاکٹر بلند اقبال (کناڈا)

پھر کچھ ہی دیر میں وہ لمحہ آ گیا جب وقت فنا ہوکر محض ایک کسیلی یاد کی شکل میں تاریخ کے صفحوں میں محفوظ ہونے والا تھا، بس ایک مسلے ہوئے پھول کی خوشبو تھی جو زمین و آسمان کے درمیان پھنسے ہوئے اُس بھاری بھرکم لمحے سے جان چھڑا کر بادلوں کے اوٹ آ چھپی تھی اور اب ایک انجان سی خواہش لیے آخری بار بغداد کی گلیوں اور بازاروں پر نظر ڈال رہی تھی جہاں ایک فاقہ زدہ صوفی کو سولی پر چڑھایا جانے والا تھا۔

بغداد کی گلیوں اور بازاروں میں لوگوں کے ہجوم وحشتوں کی عبائیں پہنے جنگلی جانوروں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے سرپٹ بھاگ رہے تھے۔ اُن کے ذہن خالی اور سینے نفرتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں نوکیلے پتھر اور ہونٹوں پر منصور الحلاج کا نام تھا۔ زخم خوردہ منصور الحلاج، جس کا بدن تلوار کے دستوں کی ضربوں سے خون آلود تھا، جس کی بے ہنگم کٹی ہوئی داڑھی کے پیچھے چھپے ہوئے چہرے پر چانٹوں کے نشان تھے۔ جو کئی دنوں کا فاقہ زدہ تھا اور جس کی پسلیوں پر جلد کی جگہ محض ایک جھلی سی رہ گئی تھی۔ جوں جوں وہ ایک شکنجے میں جکڑ کر بیچ بازار میں لایا جانے لگا عشق الٰہی سے منور فضا اُس کے کلام سے مہکنے لگی۔

یکسو کر دیا مجھے اس (ذات) واحد نے سچی توحید کے ذریعے

سالک کے لیے اُس تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ نہیں

میں حق ہوں اور حق، حق کے ساتھ حق ہے

اس کی ذات سے منسلک ہونے کے بعد فراق ممکن نہیں۔

اور پھر نوکدار پتھروں کی ضربوں سے منصور کا بدن لہولہان کیا جانے لگا مگر وہ دیوانگی عشق میں سرمست صوفی، تختہ دار کو دیکھ کر مسکرانے لگا مگر اس سے قبل کہ اُس کے لہو سے دار کی لکڑی سرخ ہو جاتی، ایک پھول شبلی کی دبی ہوئی مٹھی سے نکلا اور منصور الحلاج کے زخم خوردہ بدن کو معطر کرتا ہوا ہجوم کے قدموں تلے روندتا چلا گیا۔ پھر جونہی منصور الحلاج کا سر قطع کر کے جسم کو نظر آتش کیا گیا اور اُس کی راکھ راس المنارہ سے ہوا میں بکھیری گئی تو وہ بغداد کی گلی کوچوں میں سوگواری اُڑتی ہوئی چند لمحوں کے لیے جنید بغدادی کی قبر کی دھول سے آملی اور پھر وہاں موجود بایزید بسطامی اور ابو سعید ابوالخیر کے چڑھائے ہوئے پھولوں کی خوشبوؤں کو اپنے اندر بسا کر زمین و آسمان کے اُس مشکل لمحے سے دامن چھڑانے لگی مگر پھر ایک موہوم سی امید کے سہارے بادلوں کے اوٹ چھپی خوشبو سے آکر مل گئی اور پھر وقت کے طویل مگر انجانے سفر میں شامل ہو گئی۔

لاہور کی پُر رونق گلیوں اور بازاروں میں زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں تھی۔ بلاول

گنج مارکیٹ کی گلیوں میں صوفیانہ کلام کی مہک کسی انجانے اندیشے سے اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔ شام کا وقت آنے والی صبح کی سلامتی کے لیے بابا داتا گنج بخش کے مزار پر نذرانوں کے پھول چڑھانے کو بے تاب تھا۔ دیوانگی عشق میں سرمست صوفی فقیر اللہ ہو اللہ ہو کا وِرد کرتے ہوئے گلیوں میں ناچ رہے تھے اور فضا، حضرت محی الدین چشتی کے کلام سے مہک رہی تھی۔

گنج بخش فیضِ عالم ،مظہر نورِ خدا ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را راہنما

پھولوں سے لدے ٹھیلوں وخوانچوں اور مزار پر چڑھانے والی چادروں کی دوکانوں پر زائرین کا ہجوم بڑھتا جارہا تھا۔ بابا داتا گنج بخش کے مزار کا طویل کشادہ صحن صوفیانہ کلام کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ بچے، جوان، بوڑھے، عورتیں، مرد، امیر، فقیر سبھی فرش پر زانوں ہوئے عبادت الٰہی میں مشغول تھے۔ لمحہ بہ لمحہ کلام الٰہی کا وِرد جاری و ساری تھا، دربار میں اجتماعی دُعا کے خاطر لوگ اپنی صفیں درست کر رہے تھے کہ اچانک مزار کے سبز گنبد اور صحن میں پھرتے پرسکون کبوتر کسی نادیدہ اندیشے کو پا کر خوفزدہ ہو کر ایک ساتھ پھڑ پھڑا کر اُڑنے لگے۔

اور پھر بلاول گنج مارکیٹ کی گلیوں میں تین سائے وحشتوں کی عبائیں پہنے جنگلی جانوروں کی طرح انسانی لہو سے اپنی پیاس بجھانے نمودار ہوئے۔ اُن کے ذہن خالی اور سینوں میں نفرتیں تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں گرنیڈ اور خودکش دھماکوں کی جیکٹس اور ہونٹوں پر حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری کا نام تھا۔ کچھ ہی دیر میں اللہ کے ذکر میں مصروف عبادت گزار اجتماعی دُعا کے خاطر قطار در قطار صف بندی کرنے لگے اور دربار میں جمعرات کی جمعرات حاضری لگانے والا محمد منشاء خود کے لیے دُعائیں مانگنے کے بجائے ذکر اذکار میں مشغول زائرین پر عطر اور خوشبو چھینکنے لگا کہ اچانک اُس کے ہاتھوں میں دبے عطردان سے نکلی خوشبو زندہ انسانوں کے بجائے مردہ انسانی گوشت کے لوتھڑوں کو معطر کرنے لگی۔ داتا دربار کے پہلو میں دھماکے سے اُنکے سرہانے درج مرکز تجلیات انسانی لہو سے بھیگ کر رنگین ہونے لگا۔

اور مزار شریف کا سبز گنبد کبوتروں اور انسانی خون کے لوتھڑوں میں رنگ کر سُرخ گنبد میں بدلنے لگا۔ مزار کے فرش پر عبادت گزاروں کا خون اور اعضاء ہر طرف بکھرنے لگے اور پھر کلام الٰہی کا وِرد اور صوفیانہ کلام کی مہک دھاڑیں مار مار کر روتی ہوئی آوازوں میں بدلتی چلی گئی۔

محمد منشاء کے ہاتھوں میں دبے عطردان کی خوشبو انسانی گوشت کے لوتھڑوں اور بکھرے ہوئے اعضاء کو معطر کر کے کچھ دیر تو یونہی لاہور کے گلی کوچوں میں سوگوار اڑتی رہی اور پھر کچھ ہی لمحوں میں مزار شریف پر خواجہ نظام الدین اولیا، حضرت معین الدین چشتی ؒ، در بابا فرید الدین شکر گنج کے چڑھائے ہوئے پھولوں کی خوشبو کو اپنے اندر بسا کر زمین و آسمان کے اُس مشکل لمحے سے دامن چھڑانے لگی جہاں وقت بارود کے دھماکوں سے فنا ہو کر پھر سے ایک کڑوی کسیلی یاد کی شکل میں تاریخ کے صفحوں میں محفوظ ہو گیا تھا، مگر پھر ایک موہوم سی امید کے سہارے بادلوں کے اوٹ چھپی خوشبو سے آکر مل گئی اور ایک بار پھر وقت کے طویل مگر انجانے سفر میں شامل ہو گئی۔

پیاسی ندیا

فہیم اختر (لندن)

امن کو شہر میں آئے ہوئے کوئی ایک ہفتہ سے زیادہ ہو چکا تھا۔ ایک ہوٹل میں قیام تھا، لیکن اسے ایک ایسے گھر کی تلاش تھی جہاں رہنے کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کا بھی انتظام ہو۔ حسب معمول دفتر سے آنے کے بعد وہ چائے پینے کے لیے قریب کی چائے کی دکان پر چلا جاتا۔

''ارے رامو ایک کپ چائے لانا۔''

''ابھی لایا صاحب۔'' رامو نے آواز لگائی۔

''یہ لیجیے بابو جی۔''

''بابو جی آج تو کڑا کے کی چائے بنائی ہے۔'' اپنے انگوچھے سے چہرے کا پسینہ پوچھتے ہوئے۔ بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے رامو نے کہا'' آپ کو پسند آئی۔ ارے ہاں میں تو بھول ہی گیا کچھ رہنے کا بندوبست ہوا بابو جی۔''

''نہیں بھئی۔ اب تو لگتا ہے کہیں اور جانا پڑے گا ہم تو چاہتے تھے کہ تمہارے ہاتھ کی چائے پیتے رہیں۔ اسی علاقہ میں کہیں مناسب جگہ مل جاتی، تو بہتر ہوتا۔'' امن نے مایوس ہو کر کہا۔

''ارے ہاں کل تم کوئی موہن بابو کے بارے میں بتا رہے تھے۔ تم نے ان سے کچھ بات چیت کی۔''

''ہاں بابو جی۔''

''تو انہوں نے کیا کہا۔''

''اگر وہ آج آجاتے تو میں ان سے ضرور بات کرتا۔ وہ بہت خاموش اور سیدھے آدمی ہیں۔ وہ بچوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ جب وہ یہاں آتے ہیں محلہ کے بچے ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔''

دوسرے دن امن تھکا ہارا آفس سے آیا اور سیدھے چائے کی دکان پر چلا گیا۔

امن نے جیسے ہی رامو کو آواز لگائی، رامو فوراً حاضر ہو گیا اور کہنے لگا'' بابو جی آج تو دو چائے کا آرڈر دینا پڑے گا۔ آج آپ کا کام بن گیا۔ موہن بابو آئے تھے۔ انہوں نے آپ کو بلایا ہے۔''

اس نے انگوچھے کا کونہ کھول کر اس میں سے مروڑھا ہوا کاغذ نکالا اور امن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''یہ ان کا پتہ ہے۔''

امن کی باچھیں کھل گئیں۔ اچانک خوشی کے مارے بدن لہرانے لگا۔'' اب تو ایک گرما گرم کپ چائے پلا دو۔''

رامو دوڑا دوڑا گیا ایک کپ چائے لے آیا۔

''یہ لو بابو جی۔ بھگوان نے چاہا آج آپ کا کام ہو جائے گا۔''

امن نے دو تین گھونٹ میں گرم گرم چائے ختم کر دی اور جیب سے پیسہ نکال کر رامو کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔

''بابو جی یہ تو زیادہ ہیں۔''

''بس رکھ لو۔''

امن نے پتہ کو پھر سے پڑھا۔ شتر مرغ کی طرح سے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا اور رامو سے کہا۔

''رامو یہ جگہ تو یہاں سے دور نہیں ہے۔''

اور تیز رفتاری سے اسی سمت روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دور چلنے کے بعد موہن بابو کا گھر مل گیا۔ دستک دے کر انتظار کر رہا تھا کہ اس کو دکھا کہ کوئی چلمن کی تیلیوں میں سے اس کا جائزہ لے رہا ہے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور امن نے دیکھا کہ ایک عورت سامنے کھڑی ہے۔

''فرمائیے۔''

امن نے بہت سادگی سے کہا ''مجھے امن کہتے ہیں اور مجھے موہن بابو سے ملنا ہے۔''

''ابھی تو وہ بازار گئے ہیں، آپ اندر آئیے وہ آتے ہی ہوں گے۔''

امن اس عورت کے پیچھے چلنے لگا اور خیال کرنے لگا یہ موہن بابو کی لڑکی ہو گی۔ اس عورت نے امن کو کمرے میں بٹھایا اور پنکھا چلا دیا۔

''آپ آرام سے ستائیے۔ میں ابھی چائے لاتی ہوں۔''

آدھے راستے سے واپس ہوتے ہوئے اس عورت نے پوچھا ''آپ چائے پئیں گے یا ٹھنڈا چلے گا۔''

امن نے پہلے تو تکلف کیا پھر کہنے لگا ''چائے ہو جائے تو بہتر ہے۔''

امن ابھی چائے کی چسکیاں لے ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ موہن بابو آواز دے رہے تھے ''ارچنا ذرا ادھر آنا، دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔''

ارچنا نے وہیں سے آواز دی۔

''ادھر آئیے۔ کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

موہن بابو سیدھے کمرے میں آ گئے۔

امن عمر رسیدہ شخص کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''نمسکار موہن بابو۔''

''موہن بابو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ''نمسکار۔''

''تو آپ ہیں امن جن کو کمرہ کی تلاش ہے۔''

''جی!''

''ہاں مجھے رامو نے بتایا تھا۔''

"آپ بیٹھیں میں ابھی آیا۔"

امن سوچنے لگا، موہن بابو کوئی پچاس کے لگ بھگ کے ہوں گے، اور وہ عورت، موہن بابو کی چند یا تو صاف تھی لیکن بالوں کی جھالریں لٹکیں تھیں۔ آنکھوں کے کونوں پر مکڑی کا جال بننا شروع ہو گیا تھا۔ قد لمبا تھا جس کی وجہ سے توند توازن کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ آواز میں شیرینی تو نہ تھی لیکن ملائمت تھی۔ ارچنا کا قد موہن بابو کی طرح سے لمبا نہیں تھا، مناسبت سے سڈول تھا۔ بال لمبے تھے آنکھیں نشیلی تھیں اور خلوص کی چاہت چھپی ہوئی نہیں تھی، جوبن میں بے چارگی نہ تھی بلکہ، بیدارگی تھی۔ لیکن چہرے پر مسکراہٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ ابھی وہ ان شخصیتوں کے گورکھ دھندے میں پھنسا ہوا تھا کہ موہن بابو کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ "آپ ابھی کہاں رہ رہے ہیں۔"

"فی الحال تو آفس کے ملازم کے ایک کمرے میں رہ رہا ہوں، اس کی بیوی بچہ اپنے پتا کے یہاں گئے ہوئے ہیں۔"

"آپ رہنے والے کہاں کے ہیں۔"

"ویسے تو میں نے مشنری کی چاردیواری میں آنکھ کھولی ہے اور وہیں سے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ ماں اور باپ کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ اگر وہ ہوتے تو ان ہی کے ساتھ رہتا ہوتا۔ بس لوگ کہتے ہیں کہ کسی نے مجھے گرجا گھر کے باہر چھوڑ دیا تھا۔ بس اپنی یہی ایک چھوٹی سی کہانی ہے۔"

موہن بابو نے جب یہ سنا تو کچھ اداس سے ہو گئے اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا "دنیا دکھ بھری کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ آیئے میں آپ کو کمرہ دکھادوں۔"

اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ امن کی کمرہ دیکھتے ہی باچھیں کھل گئیں۔

موہن بابو نے مسکراتے ہوئے امن سے پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو کمرہ پسند ہے۔"

امن نے فوراً جواب دیا "جی مجھے پسند ہے۔"

موہن بابو نے پھر امن سے سوال کیا "کہیں شراب وراب کی لت تو نہیں ہے۔"

امن ہنسی کو روکتے ہوئے "اگر کمرہ نہیں دیا تو شروع کرنا پڑے گی۔"

دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

"اچھا موہن بابو بات پکی ہو گئی اب میں چلا۔ کچھ دفتر کا کام کرنا ہے۔"

اتنے میں ارچنا بھی آ گئی اور اس نے امن سے کہا "آپ جا رہے ہیں؟ میں تو کھانا پروسنے جا رہی ہوں۔"

موہن بابو نے کہا "آپ میری پتنی کی بات مان لیجیے۔"

پتنی کا لفظ سن کر امن کو جیسے دھکا سا لگا اور اس نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا "میں کھانا کھا کر آیا تھا۔ کل سے آپ کا ساتھ دیں گے۔ اچھا نمسکار۔ کل ملاقات ہوگی۔"

امن نے ساری رات خوشی اور فکر میں کاٹ دی۔

امن دوسرے دن دفتر سے جلدی آ گیا تھا۔ سامان لے کر اپنے کمرے پر پہنچ گیا۔ اپنی کتابیں وغیرہ نکال ہی رہا تھا کہ ایک سریلی آواز نے چونکا دیا۔ ''آپ ماس کھاتے ہیں۔''

موہن بابو کی پتنی نے جواب سنے بنا پھر پوچھا ''کھانے میں آپ کو کیا کیا پسند ہے؟''

''جو آپ لوگوں کو پسند ہے وہ ہی مجھے پسند ہے۔''

ابھی موہن بابو کی بیوی جیسے ہی رسوئی کی طرف بڑھی کہ امن فوراً پوچھ بیٹھا۔

''اگر آپ برا نہ مانے تو آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔''

''جی!'' شرماتے ہوئے ''مجھے ارچنا کہتے ہیں۔'' اور ارچنا اپنے منھ میں ساڑی کا آنچل دبائے فوراً رسوئی میں چلی گئی۔

کھانے کی میز پر سب لوگ ایک ساتھ کھانا کھا رہے تھے، ایک سکتہ سا طاری تھا۔

تبھی موہن بابو نے کہا ''امن تمہاری عمر کیا ہے۔''

''یہ ہی کوئی اکیس بائیس سال کے درمیان میں ہوگی۔''

''کیوں؟''

''نہیں تم عمر میں کم لگتے ہو۔''

امن نے جلدی سے کھانا ختم کیا اور نمسکار کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن دفتر جاتے ہوئے جیسے ہی امن کمرے سے باہر نکلا کہ ارچنا سامنے آ گئی۔ دونوں کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کو گھورتے رہے، تبھی ارچنا نے پوچھا ''آج آپ کتنے بجے آئیں گے۔''

امن نے ہاتھ پر گھڑی باندھتے ہوئے کہا ''یہی کوئی چھ بجے۔''

''کیوں!''

ارچنا نے کہا ''آج مرغی کا سالن بنا رہی ہوں، آپ کو پسند ہے نا؟''

امن نے گردن ہلائی اور نمسکار کہہ کر چلا گیا۔

موہن بابو کمرے میں کچھ سامان ٹھیک کر رہے تھے کہ ارچنا نے پوچھا ''اجی سنتے ہیں یہ امن اب تک کیوں نہیں آئے؟''

''ارے بھئی تم خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو، آفس کے کام میں الجھ گئے ہوں گے۔''

تبھی امن داخل ہوا۔

''یہ لو آ گئے، ابھی ابھی ہم لوگ آپ ہی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔''

امن نے کہا ''خیریت۔''

موہن بابو نے کہا ''ہاں بھئی سب کشل منگل ہے۔ آپ ہاتھ منھ دھولیں۔''

امن اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کھانے کی میز پر سب کھانے میں مشغول تھے۔ امن نے خاموشی کو توڑنے کے لیے ارچنا کی طرف

مخاطب ہوتے ہوئے کہا'' آپ کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں۔''

ارچنا نے کہا'' آپ کو پسند ہے۔''

موہن بابو نے فوراً کہا'' بھئی شادی سے پہلے ہماری ایک ہی شرط تھی کہ لڑکی کو کھانا بنانا آنا چاہیے۔''

موہن بابو کھانا ختم کرتے ہی اپنے کمرے میں چلے گئے۔ امن ارچنا کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ پلیٹیں اٹھاتے ہوئے امن نے کہا'' موہن بابو آج بہت خاموش تھے۔''

ارچنا نے پلیٹیں امن کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا'' وہ آج ہی نہیں اکثر بالکل خاموش ہو جاتے ہیں۔''

امن نے تجسسانہ انداز میں سوال کرتے ہوئے دریافت کیا'' آپ کے بچے؟''

ارچنا کے بدن میں اچانک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اپنے کو سنبھالتے ہوئے سوال کا رخ بدل دیا۔

'' کیا تم شادی شدہ ہو؟''

امن نے مسکراتے ہوئے کہا'' ابھی تو میں خود بچہ ہوں۔''

وقت کی سوئی چلتی رہی، دن مہینوں میں تبدیل ہوئے اور ایک سال کے لگ بھگ ختم ہو گیا۔ امن نے اپنے رہن سہن کے رویہ سے دونوں کے درمیان ایک مقام بنالیا۔ دھیرے دھیرے غیریت اپنائیت میں بدلنا شروع ہوئی۔ وہ دونوں امن کو گھر کا ایک فرد تصور کرنے لگے۔

موہن بابو اکثر اپنے دفتر کے کاموں سے شہر کے باہر جاتے تھے اور بعض مرتبہ دو تین دن تک غائب رہتے تھے۔ موہن بابو جب شام کو نہیں آئے تو یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ باہر کے دورے پر چلے گئے ہیں۔ امن اپنے کمرے میں لیٹا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس کو بارش کے قطروں کے ٹپ ٹپ کی آواز سنائی دی۔ ابھی یہ سلسلہ شروع ہوا ہی تھا کہ بادلوں کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ بوندوں کی رم جھم نے تیزی پکڑ لی تھی جس نے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی۔ امن کو بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک نے کچھ بے چین سا کر دیا۔ وہ ناول کو رکھ کر کھڑکی کی طرف لپکا جو آنگن کی طرف کھلتی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا۔ آنگن کا دروازہ کھول کر بارش کی بوندوں کی رم جھم میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک بجلی چمکی۔ اس نے دیکھا کہ ایک کونے میں ارچنا کھمبے سے لگی کھڑی ہوئی تھی اور برسات کا پانی اس کے بدن پر دوڑ رہا تھا۔ اس کے کپڑے بدن سے چپکے ہوئے تھے۔ بجلی کی چمک سے اس کا جوبن بھی نکھر آیا تھا۔ امن محسوس کرنے لگا جو بجلی کی چمک ارچنا کے بدن پر پڑ رہی ہے وہ اس کے بدن میں سرایت کر رہی ہے۔ امن بت بنا یہ منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ ارچنا کی نظر امن پر پڑی وہ سہمی اور شرماتے ہوئے کمرے میں بھاگ گئی۔ امن بجائے اپنے کمرے میں واپس جانے کے آنگن میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ امن کے بدن میں آگ سی لگی ہوئی تھی، وہ کچھ بولنا چاہ رہا تھا مگر اس کے ہونٹ سلے ہوئے تھے، اس کا بدن جل رہا تھا۔ تبھی وہ جا کر بارش میں کھڑا ہو گیا۔ جب اسے محسوس ہوا کہ بدن کی گرمی زائل ہو گئی تب وہ اپنے کمرے میں آکر گیلے کپڑوں سمیت لیٹ گیا اس کو معلوم نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

اس واقعہ کے کچھ دن ہی بعد امن اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ اس کو بونداباندی کی آواز سنائی دی۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ وہ آنگن کا دروازہ کھولے۔ اس کو خیال پیدا ہوا کہ آج تو موہن بابو گھر میں ہیں ان ہی کے کمرے میں چلو۔ جیسے ہی وہ داخل ہوا وہ اچنبھے میں پڑ گیا۔ دیکھا ایک بوتل خالی منہ کھولے فرش پر پڑی ہوئی تھی اور

دوسری بوتل آدھی سے زیادہ ختم تھی اس سے گلاس بھر رہے تھے۔ موہن بابو نے جیسے ہی امن کو دیکھا اچھل پڑے۔

''آؤ آؤ اندر آؤ۔'' موہن بابو نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

''ارے ہاں تم تو پیتے نہیں ہو، ویسے تو میں پی نہیں رہا ہوں لیکن جو آگ ذہن میں سلگ رہی ہے اس کو بجھا رہا ہوں۔''

اتنے میں موہن بابو رونے لگے اور ایک ہارے ہوئے انسان کی طرح کہنے لگے۔ ''میں تم سے کیا چھپاؤں، ارچنا اور ہم میاں بیوی تو ضرور ہیں مگر صرف نام کے۔ ارچنا کو دیکھ کر صرف حسرت انگیز ہو سکتا ہوں، آنسو بہا سکتا ہوں۔ آج تک میں نے اس کو وہ خوشی نہیں دی جو ایک عورت کو دینی چاہیے۔ مگر اس نے آج تک کسی کو بھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ کمی مجھ میں ہے۔ میں تو اب لوگوں کے تانے سن سن کر تنگ آ چکا ہوں۔ اب تو لوگ اسے بانجھ سمجھنے لگے ہیں۔ ہے بھگوان ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔'' تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد موہن بابو امن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔

''امن میں جانتا ہوں کہ جو میں کہنے جا رہا ہوں وہ تم کو یقین نہیں ہوگا۔ میری تم سے ایک بنتی ہے، آج کی رات تم ارچنا کی پیاسی زمین کو سیراب کر دو۔''

امن یہ سنتے ہی چونک گیا۔

اس نے فوراً کہا ''یہ کیا کہہ رہے ہیں، آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔''

''ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

موہن بابو ہاتھ جوڑے کر اور گڑگڑا کر اپنی مجبوری کی بھیک مانگ رہے تھے۔

امن کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، اسے موہن بابو پر غصہ بھی آ رہا تھا مگر ان کی یہ حالت دیکھ کر ترس بھی کھا رہا تھا۔ وہ زندگی کے کئی امتحان سے گزر چکا تھا مگر آج وہ ایک عجیب موڑ پر کھڑا تھا، جہاں وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا۔ امن کو آناً فاناً اپنے کالج کے دن یاد آ گئے جب وہ اپنے پروفیسر کو اپنا نوٹ دکھانے گیا تھا۔ اس وقت وہ نشہ میں دھت تھا۔ جیسے ہی اس نے امن کو دیکھا وہ غصہ میں چلانے لگا۔ پھر قریب آ کر اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ امن جو سہما ہوا سا تھا، وہ اپنے آپ کو ایک ایسے شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا جہاں سے نہ تو وہ بھاگ سکتا تھا اور نہ ہی وہاں ٹھہر سکتا تھا۔ جب اس کے پروفیسر نے رونا بند کیا تو امن سے کہنے لگا۔ ''مجھے معلوم ہے تم یہاں اپنے نوٹ دکھانے آئے ہو، مگر میں تمہیں آج کچھ بتانے جا رہا ہوں۔ کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے بڑھاپے میں شادی کی ہے، لیکن کسی کو اس بات کا یقین نہیں کہ میری عورت بانجھ ہے۔ وہ بچے کی ماں نہیں بن سکتی۔ یہ کہہ کر پھر رونے لگا۔ تم میرا منہ دیکھ رہے ہو اگر تمہیں یقین نہ ہو تو تم خود آزما کر دیکھ لو۔''

یہ الفاظ سنتے ہی امن اپنے نوٹ چھوڑ کر بھاگ آیا ہے۔

امن ابھی ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ اسے موہن بابو کی آواز نے چونکا دیا۔

''کیا سوچنے لگے امن۔''

''میرے اوپر یہ احسان کر دو، میں تمہارا زندگی بھر احسان مند رہوں گا'' اور وہ یہ کہتے ہوئے امن کے

قدموں میں گر گئے۔

امن بس بت بنا کھڑا رہا، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ وہ بھاگنا چاہتا تھا مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پیروں میں کسی نے زنجیر ڈال دی ہے۔ وہی سین اس کے سامنے عود کر آیا اور بجلی کی چمک جو اس کے ذہن کے کسی کونے کدرے میں پڑی ہوئی تھی پھر سے اجاگر ہو گئی۔ جس نے اس کے بدن میں ایک آگ سی لگا دی۔ وہ وہاں سے بھاگنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کو ایک گھر کا سکون نصیب ہو گیا تھا۔ جس کا وہ عادی ہو چکا تھا۔ موہن بابو جو اس پر بہت مہربان تھے، ہر وقت ہر بات کا خیال رکھتے تھے۔ امن ان کی مدد کرنا اپنا فرض محسوس کرنے لگا۔ اتنے میں موہن بابو نے امن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا اور اسے کمرے کی طرف لے جانے لگے۔

موہن بابو نے ارچنا کے کمرے تک پہنچ کر امن کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ارچنا کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا، لائٹ آف تھی لیکن باہر کی روشنی کھڑکیوں کی درازوں سے رینگتی ہوئی آ رہی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا اس کے قدم بھاری ہونے لگے تھے۔ وہ پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا، اس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ ہاتھوں میں کپکپی سی تھی، زبان سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی۔

ارچنا دوسری طرف کروٹ لیے ہوئے لیٹی تھی۔

اس نے تھوڑی دیر انتظار کے بعد کہا ''آپ آ گئے، کتنی دیر سے انتظار کر رہی تھی۔ ایک بات کہنے کو کئی دنوں سے سوچ رہی ہوں لیکن ہمت ہی نہیں پڑ رہی ہے۔''

امن اور کشمکش میں ہو گیا۔ اس کی زبان سے آواز ہی نہیں نکل پائی جیسے تالو میں کسی نے کانٹے بکھیر دئے ہوں۔ آواز میں سکت ہی نہ رہی ہو۔ اتنے میں ارچنا نے کہا ''آپ خاموش کیوں ہیں! خیر اگر آپ خاموش رہیں گے تو آج میں آپ سے امن۔ کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔''

امن یہ سن کر اور بھی سہم گیا، اب اس کے اندر جان بھی باقی نہیں تھی۔

پھر ارچنا نے کہا ''کیوں نہ ہم لوگ امن کو گود لے لیں وہ آپ کو بھی پسند ہے اور مجھے بھی، زندگی کا ایک خلا بھی پورا ہو جائے گا اور ہماری فیملی بھی مکمل ہو جائے گی۔''

امن یہ سنتے ہی کھڑا ہو گیا، اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور وہ تیزی سے کمرہ سے باہر نکل گیا۔

تضاد

رخسانہ نازنین (بہار)

ان دونوں کی ملاقات ایک ریستوران میں ہوئی تھی۔ ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے دو آزاد خیال، نوجوان لڑکا، لڑکی، حسن وشباب کے نشے میں چور پہلی ہی ملاقات میں دوست بن گئے۔ جلد ہی یہ دوستی پیار میں بدل گئی۔ دونوں اکٹھے وقت گزارنے لگے۔ حسن اور عشق کا ملن اپنے پیچھے ایک قیامت خیز داستان ضرور چھوڑتا ہے۔ حسن کی کوکھ میں عشق کے پیار کی نشانی پلنے لگی۔ دونوں پریشان ہوگئے۔ اس مصیبت سے چھٹکارہ پانے کی تدبیر سوچنے لگے۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب کچھ بھی ممکن نہ تھا۔ ناچار وہ آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگے۔ ان کی ملاقاتیں اب بھی ہوتی تھیں اور مستقبل کے منصوبے ترتیب دیئے جاتے تھے۔ دونوں کو اب بھی ایک دوسرے کی طلب تھی لیکن اپنے درمیان آنے والے اس وجود سے بے انتہا نفرت۔ جو ان کی آزادی میں رکاوٹ کا باعث ہوتا اور بدنامی کا سبب۔ اس ناگوار وجود سے ہر صورت نجات پانے کا انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا۔

وقت گزرتا رہا آخر کار وہ گھڑی آ ہی گئی جس کے انتظار میں وہ اپنا سکھ چین کھو بیٹھے تھے۔ ہاسپٹل میں لڑکی درد کے مراحل سے گزر رہی تھی اور لڑکا باہر مضطرب سا ٹہل رہا تھا۔ نرس نے خوشخبری سنائی ''لڑکا ہوا ہے'' اس کے دھڑکتے دل کو قرار آ گیا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ لڑکی کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے۔ لڑکے نے بچے کو ہاتھوں میں اٹھالیا۔ لڑکی کو ہاسپٹل سے ڈسچارج کروایا اور دونوں اس نومولود کے ساتھ انجانی منزل کی طرف چل پڑے۔

دوسری صبح ہاسپٹل سے کچھ ہی دور ایک کوڑے دان میں نوزائیدہ بچے کی نعش ملی جسے کتوں نے پھاڑ ڈالا تھا!

اور وہیں کوڑے دان کے پاس ایک درخت پر بیٹھی چڑیا اپنی نوزائیدہ بچوں کے منہ میں اپنے منہ سے دانے ڈال رہی تھی.....!!!

زود پشیما

نوشابہ خاتون (پٹنہ)

آج پھر کچھ لوگ اسے دیکھنے کے لیے آنے والے تھے۔ آج پھر اسے اپنی انا کو کچل کر چہرے پر مصنوعی بشاشت اور ہونٹوں پر بناوٹی مسکراہٹ سے آنے والوں کا استقبال کرنا تھا۔ ان کے الٹے سیدھے سوالوں کا شائستگی سے جواب دینا تھا۔ اپنی کم مائیگی کو ان کی نظروں سے چھپانا تھا۔ برسوں سے یہ ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا اور وہ اس کا ایک اہم کردار تھی۔ لوگ آتے قورمہ پلاؤ اڑا کر ڈکار لیتے ہوئے چلے جاتے۔ کبھی لڑکی کا سانولا رنگ قابل اعتراض ہوتا، کبھی اس کا لاغر پن تشویش کا باعث ہوتا اور کبھی حسب نسب کا سوال کھڑا ہو جاتا کہ لڑکی کس خاندان کی ہے؟ اس کے ماں باپ بھائی بہن رشتے ناطے والے کون ہیں، کہاں ہیں، سینکڑوں سوالات اٹھتے۔ اس کھیل سے وہ تنگ آگئی تھی جی میں آتا کہہ دے "میں کوئی لنگڑی لولی نہیں ہوں۔ نہیں ہے مجھے کسی سہارے کی ضرورت۔ خدا نے مجھے دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں، دل دماغ اور عقل سمجھ عطا کی ہے۔ پھر میں کیوں تماشا بنوں۔ کیوں رحم طلب نگاہوں سے کسی کی طرف دیکھوں۔ کیوں فقیروں کی طرح جھولی پھیلاؤں؟ عورتوں کی ان ہی کمزوریوں نے مردوں کے حوصلے بلند کر دئے ہیں۔ چاہے وہ خود کسی قابل ہوں یا نہ ہوں، خواہ ساری زندگی بیوی کی کمائی پر عیش کرتے رہے ہوں۔ لیکن احساس برتری کے نشہ میں چور رہتے ہیں۔ ابا نے چاہے مجھے کچھ دیا ہو یا نہیں، اپنا نام، اپنی فرزندی میں قبول نہ کیا ہو لیکن ان کا احسان ہے کہ انہوں نے مجھے اس قابل بنا دیا ہے کہ میں خود اپنا سہارا بن سکتی ہوں۔ لیکن یہ سماج کے ٹھیکے دار چین سے جینے نہیں دیتے اور اوپر والا حرام موت مرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر میں کیا کروں؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ساری ساری رات اس سوچ میں گزر جاتی کہ لوگ کیوں لاوارث بچوں کو اٹھا لاتے ہیں؟ اگر اٹھاتے ہی ہیں تو اپنا نام دینے کا حوصلہ کیوں نہیں رکھتے؟

وہ ریں ریں کرتی بچی ہر وقت اس کے ذہن پر مسلط رہتی جو اپنے خارش زدہ پاؤں کو زمین پر رگڑتی رہتی۔ آنکھوں اور ناک سے بے تحاشہ پانی گرتا رہتا۔ سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے نوچتی کھسوٹتی رہتی جو خارش کے علاوہ جوؤں سے بھرا رہتا۔ ابا جب کام پر سے لوٹتے تو اسے پیار کرتے، منہ ہاتھ صاف کرتے، کپڑے بدلتے۔ پھر انگلی تھام کر بازار لے جاتے۔ ٹافی اور کھلونے دلواتے اس طرح ریں ریں کرتی ہوئی وہ بچی پرائمری اسکول تک پہنچ گئی۔ وہاں جب بچوں کی مائیں کبھی بچوں کو لے جانے یا ان کا رپورٹ کارڈ لینے کے لیے آتیں تو اسے بہت اچھا لگتا۔ اس کے دل میں بھی یہ تمنا جاگتی کہ کاش اس کی بھی کوئی ماں ہوتی۔ کبھی وہ پوچھتی۔

"ابا! میری ماں کہاں ہے؟ ابا اسے پیار کر کے کہتے۔

"جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو خود ہی تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

پھر نہ جانے کیوں ابا نے نوکری چھوڑ دی اور اسے ساتھ لے کر گاؤں آ گئے۔ وہاں اسے دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ گئی جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ اتنے حیرت زدہ کیوں ہیں؟ وہاں امی تھیں، بہن بھائی تھے پھوپھی خالہ تھیں۔ لیکن کسی نے اسے لپٹا کر پیار نہیں کیا۔ بڑا سا کنبہ تھا سب کے گھر آس پاس تھے۔ ہر گھر میں یہ بات گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھی۔

''بھابھی! سنا تم نے؟ نعیم بھائی ایک لڑکی لے کر آئے ہیں۔''

''ارے، ہوگی انہیں کی بیٹی وہاں کسی سے شادی وادی کر لی ہوگی۔ آخر اتنے دن وہاں کیسے گزارا؟''

''وہ کہتے ہیں کسی مسجد سے اٹھا کر لائے ہیں۔''

''چلو اچھا ہے کبھی کام ہی آ جائے گی'' اور سچ مچ وہ ایسی کام آئی کہ سبھوں کی آنکھوں کی پتلی بن گئی۔ سب رشتہ دار اسے پیار کرنے لگے تھے۔ ہر ایک کی خواہش یہی ہوتی کہ وہ ان کے پاس رہے۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری اتنی معصوم، مہذب اور خدمت گزار لیکن کوئی بھی اسے اپنا رشتہ دار کہنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ بات جب اس کے دل میں کانٹوں کی طرح چبھنے لگی تو اس نے پوچھا۔

''ابا سچ سچ بتایئے میں کون ہوں؟ آپ سے میرا کیا رشتہ کیا تعلق ہے۔''

ابا اس غیر متوقع سوال پر گھبرا گئے۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد کہا۔

''تم میری بیٹی ہی جیسی ہو۔''

''بیٹی جیسی ہوں، کیا میں آپ کی بیٹی نہیں؟''

''نہیں جب تم بہت چھوٹی تھی میں نے تمہیں ایک مسجد سے لا کر پالا ہے۔ اس کی اٹھی ہوئی پلکیں جھک گئیں۔ دل سے یہ آواز آئی۔ ابا! کاش آپ کہہ دیتے کہ میں آپ ہی کی بیٹی ہوں۔''

شک تو اسے پہلے ہی سے تھا لیکن اب تو ابا نے سب کچھ واضح طور پر بتا دیا تھا۔ لہٰذا اب شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ اس انکشاف نے اسے اس قدر ہرٹ کیا کہ وہ بالکل خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن ابا سے اسے ایک خاص لگاؤ تھا۔ اپنے یا پرائے آخر سب کچھ وہی تو تھے۔ ابا کوئی ذی حیثیت شخص نہ تھے۔ باپ دادا نے کچھ چھوڑا نہیں تھا۔ بیٹے نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ بیٹی بیاہ کر اپنے گھر بار کی ہوگئی۔ امی جو دائمی مریض تھیں ایک لمبی علالت کے بعد رحلت فرما گئیں۔ ابا بہت ہی کمزور ہو گئے تھے۔ معاشی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ ان نا مساعد حالات میں، ابا کی عنایتوں کا قرض اس نے یوں اتارا کہ انہیں ساتھ لے کر شہر آ گئی۔ وہاں ایک بوتک میں کام پر لگ گئی چند چھوٹے بچوں کو ابتدائی درس بھی دینے لگی۔ اس طرح ابا کا سہارا بن گئی۔ ابا اب بہت چپ چپ اور پریشان سے رہنے لگے تھے۔ شاید اس لیے کہ اب اس کا رشتہ آنا تقریباً بند ہو چکا تھا۔ یہی ان کی پریشانی کا باعث تھا۔ لیکن اس نے تو اپنے ذہن سے یہ بات بالکل نکال دی تھی کہ کاتب تقدیر نے اس کی قسمت میں ازدواجی سکھ لکھا بھی ہے یا نہیں۔

وقت اپنی ڈگر پر چل رہا تھا دیکھتے دیکھتے کئی ماہ و سال گزر گئے۔ وہ لاغر سی سانولی لڑکی اب بہت بدل چکی تھی۔ چہرہ گول اور رنگ سنہرا ہو گیا تھا۔ گردش وقت نے اسے اور بھی سنجیدہ بنا دیا تھا۔ وہ بہت ہی سادگی سے رہتی۔ ہر

وقت دوپٹہ سے اپنا سر ڈھکے رہتی۔ ایک دن اتفاق سے آنچل سر سے سرک گیا تو اچانک ابا کی نظر اس کے بالوں میں جھلملاتے ہوئے بے شمار چاندی کے تاروں پر پڑ گئی۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ اندر پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ احساس جرم سے نظریں جھک گئیں۔ کیا منہ دکھاؤں گا خدا کو؟ کیا جواب دوں گا، جب وہ پوچھے گا تیرے سچ بولنے میں کون سی بات مانع تھی؟ کیا بندوں کا خوف خدا کے خوف پر غالب تھا؟

نام کتاب : آوارہ لمحے

شاعر : پی پی سریواستو رندؔ

صفحات : ۱۱۲ قیمت : ۱۰۰ / روپے

تقسیم کار : نورنگ کتاب گھر، نوئیڈا

پختہ کار اور کہنہ مشق شاعر جناب پی پی سریواستو رندؔ کے نویں شعری مجموعے 'آوارہ لمحے' کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف جنوری تا دسمبر ۲۰۰۶ء کے درمیان کہی گئی ۴۹ غزلوں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ یہ تعداد اگرچہ بسیار گوئی کے زمرے میں نہیں آتی تاہم ان کی مسلسل مشق و مزاولت کی شہادت ضرور دیتی ہے۔

پروفیسر قمر رئیس نے اپنے پیش لفظ ''رندؔ کا انفرادی لہجہ اور شعری آہنگ'' میں ان کی شاعری کے رنگ و آہنگ کا تجزیہ بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ رندؔ کی شاعری میں ''جو امیج بہ تکرار شعری اظہار کا وسیلہ بنتے ہیں وہ شاعر کے شعور و فکر اور باطنی دنیا کے بڑے شفاف منظر دکھاتے ہیں۔ ان بلیغ شعری تمثالوں کے آئینے میں ہمیں شاعر کی ذات کا اور اس کے ماحول کا سارا آشوب صاف نظر آتا ہے۔''

بلاشبہ رندؔ نے اپنے اردگرد کی دنیا کے بنتے بگڑتے سایوں اور ہیولوں کو اشعار کی گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس میں صرف متناسب لفظوں کی صنعت گری ہی نہیں ہے بلکہ غزلیہ شاعری کے متنوع اسالیب اور لہجوں پر ان کی قدرت کا اشاریہ بھی ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے:

ہر طرف خاموش طوفاں تھے غبارِ دشت کے	اور ان کے درمیاں تنہا سفر میں نے کیا
دھول بھری یادوں سے مہکی پروائی	کیسے دیکھیں خواب، چبھے گی بینائی
گل مہر کے پیڑ پر شعلے تو اگ آئے میاں	اب جھلتی رت میں کس کی سربراہی چاہیے
اداسیوں کی امانت تھی رت جگوں کی تھکن	گزر گئی جو مجھے سنگسار کرتے ہوئے
اک رشتہ تھا ٹوٹ گیا	اس سے زیادہ کیا کہنا

رندؔ کی فنِ شاعری میں صرف خیال کا تنوع ہی نہیں بلکہ بحروں کا تنوع بھی قابلِ ذکر ہے۔ بعض متداول بحروں میں انھوں نے کچھ گھٹا بڑھا کر بڑے دلچسپ اور عمدہ اشعار نکالے ہیں:

ہر گھڑی اکھڑی ہوئی سانسیں سنبھالے رہی ہیں	زندگی مدت سے ہے بیمار کروٹ چاہتی ہے
اب نہ خوابوں کی تجارت ہے نہ احساسِ زیاں	کچھ مسائل ہیں جو اپنی دستکاری کر رہے ہیں
کیا ہوا، کیوں خود سے بڑھتی جارہی ہے بے نیازی	زندگی سے کیوں مری دلچسپیاں کم ہوگئی ہیں

اگر بقول رفعت سروش ''شاعری فکر و احساس اور جذبات دروں کو الفاظ کے خوبصورت پیکروں میں

ڈھالنے سے عبارت ہے'' تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ رند کی شاعری میں یہ سب اوصاف بہت نمایاں نظر آتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعری تخلیق کاری میں اپنے اندرونی اور بیرونی زندگی کے حساس تاروں میں ایک خوبصورت توازن قائم رکھنے میں عموماً کامیاب رہتے ہیں، اور شاید اسی لیے ان کی شاعری میں حسن و دلکشی کے عناصر نمایاں ہیں جو قاری کو دیر تک اپنے ساتھ رکھنے کی صلاحیت سے مملو ہیں۔

کتاب کا ظاہری حسن بھی توجہ طلب ہے اور پوری کتاب کمپوزنگ کی غلطیوں سے پاک ہے۔ یہ خوبصورت مجموعۂ غزلیات نورنگ کتاب گھر، ۲۰۴، صبا اپارٹمنٹ، ڈی ۳، سیکٹر ۴۴، نوئیڈا سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

نام کتاب	:	نیپال میں اردو زبان وادب	صنف	:	تحقیق
مصنف	:	ڈاکٹر نسیم احمد نسیم	سن اشاعت	:	۲۰۰۸ء
قیمت	:	۱۱۰ روپئے	ضخامت	:	۲۱۶ صفحات
مبصر	:	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی			

۱۹۸۰ء کے بعد جن نوجوان نقادوں نے اپنی فکر، تنقیدی نظر اور تحقیقی روش سے اردو ادب میں نمایاں شناخت قائم کی ہے ان میں ایک اہم اور مقبول نام ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنی پہلی ہی تنقیدی کتاب ''ایجاب وانحراف'' سے اردو نقد وتحقیق کی دنیا میں نہ صرف جگہ مستحکم کر لی تھی بلکہ اپنی تخلیقی جوت اور تنقیدی قوت کا اعتراف مشاہیر ادب سے بھی کروالیا تھا۔ اس کے علاوہ نسیم احمد اردو دنیا میں کئی کتابوں کے ترجمے، سرسید میگزین کی ادارت اور مختلف کتابوں کی ترتیب وتدوین کے ذریعہ متنوع علمی سرگرمیوں اور ادبی دلچسپیوں کا مظاہرہ بھی کرتے رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب ''نیپال میں اردو زبان وادب'' ڈاکٹر نسیم کی ادبی دلچسپیوں اور علمی مساعی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ موضوع اور ابواب کی تقسیم سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ کتاب موصوف کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہے کیونکہ مصنف نے مقدمہ میں ہی بڑے کرب اور عاجزی کے ساتھ قارئین سے گزارش کی ہے کہ ''براہ کرم اسے پی ایچ ڈی کا مقالہ نہ سمجھا جائے، ورنہ مجھے بے حد صدمہ ہوگا اور شاید میرا معمولی سا اعتبار بھی جاتا رہے گا۔ یہ کتاب میری پندرہ سالہ تحقیق جگر کاوی کا نتیجہ ہے۔'' کسی صلے یا ستائش کی تمنا کیے بغیر، پندرہ سال تک ایک خشک موضوع پر توجہ دینا اور شب وروز اس پر محنت کرنا مصنف کے علمی ذہن اور تحقیقی فکر کا غماز ہے۔ ''نیپال میں اردو زبان'' اپنے موضوع کے اعتبار سے انوکھا مقالہ قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ غیر ممالک میں ایسی جگہوں پہ اردو زبان کے وجود کی امید کی جاتی ہے جہاں حصول زر یا ملازمت کے سلسلے میں ہندو پاک کے افراد بڑی تعداد میں قیام پذیر ہوتے ہیں یا سفر کرتے رہتے ہیں۔ نیپال چونکہ معاشی طور پر غیر ملکیوں کے لیے کبھی چمک دمک والا یا مرغوب ملک نہیں رہا جہاں دوسرے ممالک سے لوگ جاتے اور وہاں رہ کر اردو کے لیے کام کرتے۔ اس لیے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ نیپال میں اردو زبان وادب کی

بھی کوئی تاریخ ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے پندرہ سال شب و روز محنت کے بعد جو مواد حاصل کیا اور ہمارے سامنے تفصیل سے پیش کیا اسے پڑھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ بلکہ ملک نیپال کے لیے کلمات تحسین و آفرین نکلتے ہیں جہاں تارکین وطن اردو کا کام نہیں کرتے بلکہ اہل وطن خود اردو کی ترویج و ترقی میں ہمہ دم مصروف ہیں۔ بقول مصنف نیپال میں مسلمانوں کی اکثریت اپنے بچوں کو نہ صرف اردو کی تعلیم دلواتی ہے بلکہ اس زبان سے انہیں قلبی لگاؤ اور محبت ہے۔

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے اپنے تحقیقی مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب ملک نیپال کے تاریخی، تہذیبی اور سیاسی پس منظر پر مشتمل ہے اور بقیہ ابواب میں نیپالی ادب کی خصوصیات، نیپالی زبان و ادب پر اردو کے اثرات اور نیپال میں اردو زبان و ادب کی صورت حال پر گفتگو کی گئی ہے۔ نیپال میں اردو ادب کا آغاز مغلوں کے دور اول میں ہی ہو گیا تھا لیکن باضابطہ اس کی ترقی و ترویج اودھ کی بیگم حضرت محل کی نیپال آمد کے بعد شروع ہوئی۔ مصنف نے نہ صرف نیپال نژاد اردو شاعروں، افسانہ نگاروں، تنقید نگاروں اور مزاح نگاروں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے بلکہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں شب و روز کام کرنے والے بے لوث افراد اور اداروں کی تفصیلات بھی پیش کی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ آخر میں ایک ضمیمہ شامل ہے جس میں نیپال کے اردو رسائل، کتب اور اخبارات کے سرورق یا ادبی تحریروں کے عکس دیئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب نیپال میں اردو زبان و ادب پر تحقیق کا عمدہ نمونہ ثابت ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا تمام ابواب میں پیش کردہ مواد کی تلاش و جستجو میں مصنف نے نیپال کے شہروں اور دور دراز علاقوں کا سفر کیا اور کاٹھمنڈو، بیرگنج، براٹ نگر، روتہٹ و نیپال گنج کے پچیسیوں چکر لگائے ہیں۔ ان اسفار پر جو صرفہ آیا ہوگا وہ تو ہے ہی، مصنف نے جن صعوبتوں اور دشواریوں کا سامنا کیا اس کا تھوڑا سا اندازہ مصنف کی درج ذیل تحریر سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ''۲۰۰۱ء میں روتہٹ کے ایک پہاڑی قصبہ لوکاہاں کے سفر پر تھا۔ وہاں افسانہ نگار عبدالمجید عرفان، شاعر مظار الحق منظر اور شاعرہ شبانہ نکہت سے ملاقات کا ارادہ تھا۔ یہ دسمبر کی یخ بستہ رات تھی۔ میں لمبا سفر طے کر کے گیارہ بجے رات ہی بیرگنیاں پہنچا۔ بیرگنیاں ایک چھوٹا قصبہ ہے۔ کڑاکے کی سردی میں ایک دو ہوٹل جو تھے وہ بھی بند ہو گئے تھے۔ میں واپس اسٹیشن آ گیا اور پوری رات سنسان اور تاریک پلیٹ فارم پر ٹھنڈک سے مقابلہ کرتا رہا۔ علی الصباح سرحد پار کرنے کے لیے نکل پڑا۔ ایس ایس بی کے نوجوانوں نے للکارا۔ رکو ادھر آؤ۔ میں ان کے قریب گیا۔ نیپال میں داخل ہونے کی وجہ بتائی۔ وہ فوجی نہ ریسرچ سمجھ پائے نہ شودھ، پھر تحقیق سمجھنے کا کیا سوال تھا۔ انہوں نے مجھے بنچ پر بٹھا دیا۔'' (۱۲)

اس اقتباس سے ان مشکلات کا محض اندازہ لگایا جا سکتا ہے جن کا سامنا مصنف نے نیپال کے گوشے گوشے میں پھیلے ادبا، شعرا اور اردو دانوں سے ملاقات کے دوران کیا ہے۔ یہ تحقیق ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چند کتابوں کی مدد سے کبھی سامنے نہیں آ سکتی۔ یہ اصل تحقیق ہے جس کو مکمل کرنے میں مصنف نے خون جگر صرف کیا ہے اور صبر و

استقلال سے پندرہ سالوں تک دن کا چین اور راتوں کی نیند قربان کی ہے۔ آج جب تنقید و تحقیق ''کا تا اور لے دوڑے'' کے مصداق ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم جیسے افراد نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں جو ایسے چیلنج کو نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ تحقیق کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ علمی کساد بازاری کے اس دور میں ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کی زیر نظم کتاب کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کتاب کا مجموعہ مطالعہ مسلسل اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ مصنف نے مواد اکٹھا کرنے میں اور نتائج تک پہنچنے میں کافی عرق ریزی کی ہے اور ہر سطر میں اپنی ژرف نگاہی، تحقیقی محنت، تنقیدی صلاحیت اور پر خلوص علمی محنت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کتاب نیپال میں اردو زبان و ادب کے ضمن میں ایک ناگزیر حوالہ اور دستاویز کے طور پر نہ صرف زندہ رہے گی بلکہ تادیر پڑھی جاتی رہے گی۔

خطوط

رمضان کا مہینہ ہے اسی لیے حرامخوری نہیں کر رہا ہوں۔ کتاب کی قیمت بھیج رہا ہوں، بعد میں ایسا ہی ہوگا یہ مت سوچئے گا۔ رمضان کی وجہ سے قیمت بھیج رہا ہوں ورنہ میرے جیسا بھکوا ادیب شاید ہندوستان میں نہ ملے۔

مرزا کھونچ (بہار)

"تحریک ادب" کا نقشبند قمر نقوی کے گوشے والا شمارہ نمبر ۶، ۷، موصول ہوا۔ یہ قبلہ نقشبند پر وقیع و رفیع اور سیر حاصل گوشہ ہے۔ مضمون نگاروں نے اپنے ممدوح کی شخصیت اور ان کے فنی محاسن کو ابھار کر پیش کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ گوشے کے علی الرغم مضامین، افسانے اور نظمیں، غزلیں بھی جمالیاتی مذاق کو کماحقہ آسودگی فراہم کرتی ہیں۔ یعقوب تصور پر تخلیقات بھی بصارت و بصیرت افروز ہیں۔ رفیق شاہین (علی گڑھ)

بہت خوشی کی بات ہے کہ "تحریک ادب" مجھے برابر وقت پر مل جاتا ہے ورنہ امریکہ آتے آتے آدھے رسالے راستہ میں ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ جس محنت و جانفشانی سے آپ اس کے معیار کو بلند کرتے آرہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ پروفیسر شمیم علیم (امریکا)

"تحریک ادب" کتابی سلسلہ کا شمارہ ۶، ۷ دستیاب ہوا۔ یہ شمارہ بھی سابقہ شماروں کی طرح عمدہ اور معیاری ہے۔ جیسے جیسے ورق گردانی کر رہا ہوں مختلف انواع کے ادبی شہ پارے سامنے آرہے ہیں۔ آپ نہ صرف معتبر ادیبوں اور شاعروں کے گوشے نکال کر ان کی بھرپور نمائندگی کر رہے ہیں بلکہ نئی نسل کے اندر چھپی صلاحیت کو اجاگر کر کے ان کو جہان اردو سے روشناس کرا رہے ہیں اس کار خیر کے لیے آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے۔ آمین ثم آمین! (مسلم شہزاد، ویسٹ چمپارن)

"تحریک ادب" کا شمارہ ۶، ۷ زیر مطالعہ ہے۔ اتنے ضخیم پرچے میں بھی آپ نے بھرتی کا کوئی مضمون شامل نہیں کیا ہے۔ آپ کے حسن انتخاب کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ یعقوب تصور اور نقشبند قمر نقوی دونوں قلم کاروں کے فکر و فن پر سیر حاصل مضامین سپرد قلم کرنے والے تمام فنکار کامیاب ہوئے ہیں۔ غزلوں کا انتخاب بھی بہت خوب ہے۔ محسن اختر محسن اور لیاقت جعفری کی کاوشیں لائق صد تحسین ہیں۔ آصف رضا، کبیر اجمل، انور آفاقی اور نقشبند قمر نقوی پر آپ کی تخلیقات الگ لطف دے گئیں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ کے۔ ایل۔ نارنگ کی خوش گلامیاں قلم کاروں کی، آنند لہر، سید ظہیر غزالی، مشتاق احمد وانی، مسرت ناہید، اشفاق برادر کے افسانے پسند آئے۔ مگر دیپک بدکی کا افسانہ لذت خلوت الگ ہی مزہ دے گیا۔ (مہدی پرتا پگڑھی، پرتا پگڑھ)

"تحریک ادب" (۶، ۷) شمارے کا خوبصورت عطیہ موصول ہو کر فردوس نظر ہوا۔ میں سراپا سپاس ہوں۔ اس سے قبل چند ماہ پہلے شمارہ نمبر ۵ بھی موصول ہوا تھا لیکن میں نادم ہوں کہ نومبر ۲۰۰۹ء میں اہلیہ کی مرگ ناگہاں کے

بعد در آئی پریشانیوں اور بے پناہ مصروفیات کے باعث اس کی رسید تک نہ بھیج پایا تھا۔ کل تازہ شمارہ ملا تو مجھے بے حد شرمندگی کا احساس ہوا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرما دیں گے۔ تازہ شمارے کے مطالعے سے بے حد خوش وقت اور مستفید ہو رہا ہوں۔ اردو زبان و ادب کی بقا اور اس کے فروغ وارتقاء کے لیے آپ کی سچی لگن اور محنت شاقہ لائق صد تحسین و آفرین ہیں۔ میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ (مہندر پرتاپ چاند، امبالہ)

غلطی سے پوسٹ مین نے جناب نظیر احمد نظیر کی ڈاک میرے گھر پر دے دی۔ کتابی سلسلہ ۶، ۷ ''تحریک ادب'' کا شمارہ دیکھ کر دنگ رہ گیا اور پوسٹ مین کو دل سے دعا دی۔ ماشاء اللہ خوب سے خوب تر جریدہ ہے اور اب تک میں اس سے محروم تھا۔ جس کا مجھے بے حد ملال ہے۔ بلند پایہ ادیب و شاعر کی نگارشات یکجا کر کے گویا آپ نے سمندر کو کوزے میں قید کر دیا ہے۔ یہ بھی خوش نصیبی کی بات ہے کہ جناب مَیکش امروہوی صاحب کی سرپرستی حاصل ہے۔ میں موصوف کو ''آئیڈیل گروپ ممبئی'' کے ٹاپ ٹونٹی نیشنل آئیڈیل انڈیا ایوارڈ ۲۰۱۰ء سے نوازے جانے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نازاں جمشید پوری (جمشید پور)

نقشبند قمر نقوی بھوپالی صاحب کے بارے میں جو مضامین آپ نے شامل کیے ہیں، سبھی لائق توجہ ہیں۔ خود قمر صاحب کی تحریریں بہت دلچسپ ہیں۔ قمر نقوی صاحب کے نانا سید ضیاء الدین نقشبندی کا مزار صوفیہ مسجد (احمد آباد پیلس) کے علاقہ میں ہے اور الحمد للہ اکثر و بیشتر مجھے فاتحہ کا موقع مل جاتا ہے۔ پیر یعقوب مجددی (پیر ننھے میاں) اکثر اپنے وعظ میں سید ضیاء الدین صاحب کے حوالے دیا کرتے تھے۔ قمر نقوی صاحب کو میرا سلام پہنچایئے۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا اور ہاں کبیر اجمل صاحب کو بھی سلام کہیے گا۔ (مختار شمیم، بھوپال)

آپ کا موقر جریدہ ''تحریک ادب'' نظر نواز ہوا۔ ایک ہی نشست میں ساری مشمولات کا مطالعہ کر لیا۔ ساری مشمولات نہایت معیاری اور بے حد بامعنی ہیں۔ مضامین میں نسرین نقاش، نور شاہ اور آپ کے مضامین بے حد دلچسپ اور بامعنی ہیں۔ غزلیات میں ایاز رسول نازکی، لیاقت جعفری، ہمدم کاشمیری، ڈاکٹر محبوب راہی، رئیس الدین رئیس کی غزلیں کوب ہیں۔ افسانوں میں آنند لہر، دیپک بدکی اور ڈاکٹر مشتاق وانی کے افسانے نہایت خوب ہیں۔ ''تحریک ادب'' نہایت خامشی کے ساتھ ادبی خدمات میں مصروف کار ہے۔ جو اپنے اندر ایک ہمہ گیر تحریک اور ہمہ جہت ادبی عشق لیے ہوئے ہے۔ اللہ کرے تحریک ادب دن دگنی رات چوگنی ارتقائی منازل طے کرتا رہے۔

(ڈاکٹر صابر مرزا، راجوری)

تحریک ادب کے ادارت کی ذمہ داری آپ بہ طریق احسن ادا کر رہے ہیں۔ اردو ادب کے لیے یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ نظریاتی طور پر ایک مستحکم رسالے کی تمام ضروریات کی آپ تکمیل کر رہے ہیں۔

(خان حسنین عاقب، پوسد)

''تحریک ادب'' شمارہ ۶، ۷ ملا۔ شکریہ! خوبصورت اور بھرپور مواد کے ساتھ آپ اسے شائع کر رہے ہیں۔ رسالے میں مضامین کی کہکشاں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ ان میں اکثر مضامین دل کو چھوتے ہیں۔ مجھے خاص طور پر نور شاہ، ڈاکٹر فرید پربتی، پروفیسر صغیر افراہیم، نسرین نقاش، ڈاکٹر سیما صغیر کے مضامین بے حد پسند آئے۔ نقشبند قمر نقوی بھوپالی کا قلم نہایت تیز رفتار ہے۔ ان کی تخلیقات اردو کے ہر رسالے میں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ آپ نے ان کا

گوشہ شائع کر کے ان سے تفصیلی ملاقات کروادی۔ میں نے ان کی ایک کتاب ''میں مرنے پر مائل نہیں'' پڑھی تھی۔ ان کا انداز تحریر، شکاری حالات، سبک اور دلچسپ محسوس ہوئے تھے۔ پڑھنے میں خوب لطف آیا تھا۔

(نورالحسنین، اورنگ آباد)

''تحریک ادب'' شمارہ ۶، ۷ موصول ہوا۔ یہ ایک ایسا رسالہ ہے جو قاری کو اپنی طرف اس طرح راغب کرتا ہے کہ قاری تمام تر الجھنوں کو سمیٹ لیتا ہے اور ان سے مطالعے کے دوران نجات پاتا ہے۔ دل و دماغ اور نظر کو ہلنے نہیں دیتا۔ ہر قسم کی اصناف ادب اس میں موجود ہیں اور تمام تر معیاری ہیں۔ (او۔ پی۔ شاکر، جموں)

''تحریک ادب'' کتابی سلسلہ ۶، ۷ ہمہ دست ہوا۔ ماشاء اللہ یہ جریدہ جو ۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے معتبر، موثر، عمدہ، دلکش اور خوبصورتی سے مزین ہے۔ شعری اور نثری انمول و نایاب علمی و تہذیبی اور ادبی افادیت سے معمور ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ شاندار اور جاندار ''تحریک ادب'' ہر خاص و عام میں مقبولیت کے منازل کو عبور کرتا رہے! آمین

(ع۔ق۔ صابر ہبلوی، ہبلی)

ادارہ "تحریک ادب" کے زیر اہتمام شائع شدہ کتابیں

انحراف	یعقوب تصور (ابوظہبی، متحدہ عرب امارات)
ڈاکٹر زبیر فاروق شخصیت اور فن	جاوید انور (وارانسی)
کلیاتِ مسعود	حافظ مسعود صدیقی مسعود (امریکا)
مسنون دعائیں	حافظ مسعود صدیقی مسعود (امریکا)
مشراق	رفیق راز (سری نگر)
چاند کی کہانی	نقشبند قمر نقوی بھوپالی (امریکا)
داستانِ سوزشِ غم	عبدالرحمٰن ساز (امریکا)
کویت کی یادیں	محمد کمال اظہر (کویت)
سرد موسم کی دھوپ	ڈاکٹر زبیر فاروق (دبئی، متحدہ عرب امارات)
فرشتے کے آنسو (ہندی، اردو، انگریزی)	ڈاکٹر بلند اقبال (کینیڈا)
کتاب الشعر	نقشبند قمر نقوی بھوپالی (امریکا)
سرکس سے آدم خوری تک	نقشبند قمر نقوی بھوپالی (امریکا)
جیون کے رنگ (ہندی)	پروین شیر (کناڈا)
سرد موسم کی دھوپ (ہندی)	ڈاکٹر زبیر فاروق (دبئی)
مجھ سے کہا ہوتا (ہندی)	آنند لہر (جموں)

اردو ادب کی خدمت کے عظیم مقصد کے تحت بازار سے کم قیمت میں عمدہ طباعت کا واحد ادارہ

تحریک ادب

Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata, Manduadeeh Bazar, Varanasi-03
Cell: 0091-993 595 3770 e-mail: jaweanwar@gmail.com

آل انڈیا انٹلکچول پیس ایوارڈ برائے ۲۰۱۰ء

آل انڈیا انٹلکچول پیس اکیڈمی، بریلی کے زیر اہتمام ۲۰۱۰ء کے آل انڈیا انٹلکچول پیس ایوارڈس مختلف ادبی اور سماجی شخصیات کو پیش کیے گئے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

بیرونی ممالک

۱۔ جناب ڈاکٹر اجساڈ زمیلا زاہرووک (بوسنیہ)

۲۔ جناب ڈاکٹر زبیر فاروق (دبئی، متحدہ عرب امارات)

۳۔ جناب شفیق مراد (جرمنی)

اندرون ملک

۱۔ ڈاکٹر سلطان احمد (ڈپٹی کین کمشنر، بریلی)

۲۔ جناب ارشد خاں (ایم.ای.اے. پورن پور، پیلی بھیت)

۳۔ جناب ڈاکٹر بی.ایس. بسٹ (وائس چانسلر جی. بی. پنت یونیورسٹی، پنت نگر)

۴۔ جناب اے. کے. ماہیشوری (چیف جنرل منیجر افکو آنولا)

۵۔ جناب ڈاکٹر رمیش کمار (انکم ٹیکس کمشنر، مرادآباد)

۶۔ جناب اے. کے. جین (چیف انجینئر پی.ڈبلو.ڈی.، بریلی)

۷۔ جناب ڈاکٹر ایس.ٹی.ایس. حسن (میئر نگر نگم، مرادآباد)

۸۔ جناب ڈاکٹر رام منوہر مشرا (اے.ڈی.ایم.ٹی، بریلی)

۹۔ جناب ڈاکٹر ارن کمار (ایم. بی. بی.ایس.)

۱۰۔ جناب ڈاکٹر وی.کے. شریواستو (ایم. بی. بی.ایس.، ایم.ڈی.)

۱۱۔ جناب ویرپال سنگھ (فارسٹ رینج آفیسر، بریلی)

۱۲۔ جناب امتیاز احمد صدیقی (فارسٹ رینج آفیسر، بریلی)

۱۳۔ جناب ونے کپور غافل (صدر ہندوستانی ادبی کلچر، وارانسی)

۱۴۔ جناب درّے شاہور پرشاد (مرادآباد)

۱۵۔ جناب جاوید انور (مدیر تحریک ادب، وارانسی)

صدر جناب ارشد خاں صاحب اور مہمان خصوصی ڈاکٹر بی.اے. بسٹ صاحب تھے۔ اکیڈمی کے بانی اور سرپرست جناب آصف بریلوی نے بڑے اہتمام سے اس تقریب کا انعقاد کیا۔ اکیڈمی کے صدر جناب ڈاکٹر فروغ

الدین نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض عطا فاطمہ اور سحرش حسین نے انجام دیے۔ اس پر مسرت موقع پر جناب ویندر چورسیا کو صوبائی صدر منتخب کیا گیا۔

لاس انجیلس اردو مرکز انٹرنیشنل کا ۲۰۱۰ء سالانہ ایوارڈ اور بین الاقوامی مشاعرہ

انور مسعود (پاکستان) کو شیلڈ اور پانچ ہزار ڈالر اثر لکھنوی لیونگ لیجینڈ ایوارڈ، پروین شیر (کینیڈا) کو شیلڈ اور پانچ ہزار ڈالر احمد ادایا اردو انٹرنیشنل ایوارڈ، ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا (روس) کو شیلڈ اور دو ہزار ڈالر قاضی شفیع محمد ایوارڈ۔

لاس انجیلس اردو مرکز انٹرنیشنل کے زیر اہتمام سالانہ ایوارڈس اور عظیم الشان بین الاقوامی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس شاندار تقریب میں پاکستان، ہندستان، روس، کینیڈا اور امریکا کی ریاستوں سے دانشوروں اور شعرا نے شرکت فرمائی۔ اردو مرکز انٹرنیشنل، جس کے بانی محترمہ نیر جہاں بیگم اور ان کے شریک حیات جناب ذہانت حسین ہیں، برسوں سے بین الاقوامی سطح پر اردو ادب کی پرورش کر رہا ہے۔ ہر سال عظیم الشان بین الاقوامی مشاعرے اور ۱۹۸۷ سے انٹرنیشنل ایوارڈ دینے کا مثالی پروقار عمل جاری ہے۔ اردو مرکز کی جانب سے تمام مہمانوں کے لیے پر تکلف عشائیے کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب کی نظامت جناب ظفر عباس، معروف شاعر اور اردو ٹائمس لاس انجیلس کے مدیر نے نہایت خوش اسلوبی سے کی جس میں سیکڑوں شائقین نے شرکت کی۔ پہلے دور میں میزبان شعراء نے اپنے عمدہ کلام سے نوازا جس کے بعد ایوارڈ کی تقریب ہوئی۔ سب سے پہلے قاضی شفیع محمد، فخر اردو انٹرنیشنل ایوارڈ ۲۰۱۰ (ایک شیلڈ اور دو ہزار ڈالر نقد) مشہور مستشرق ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا کو جو ماسکو (روس) سے تشریف لائی تھیں اردو ادب میں ان کی اعلیٰ خدمات کے لیے پیش کیا گیا۔ احمد ادایا اردو انٹرنیشنل ایوارڈ ۲۰۱۰ (ایک شیلڈ اور پانچ ہزار ڈالر نقد) نامور شاعرہ اور مصورہ پروین شیر جو ونی پیگ (کینیڈا) سے تشریف لائی تھیں کی شعری تخلیق ''نہال دل پر سحاب جیسے'' کو پیش کیا گیا۔

اثر لکھنوی لونگ لجینڈ اردو انٹرنیشنل ایوارڈ ۲۰۱۰، (ایک شیلڈ اور پانچ ہزار ڈالر نقد) عالمی شہرت یافتہ شاعر جناب انور مسعود کو پیش کیا گیا۔ ایوارڈس کی تقریب کے بعد پھر مشاعرے کا آغاز مہمان شعراء کے کلام سے ہوا۔ جس کی صدارت جناب انور مسعود نے فرمائی۔ ہندستان سے طاہر فراز، کینیڈا سے ذکیہ غزل اور پروین شیر، ماسکو سے لدمیلا وسیلیوا (انھوں نے فیض کا کلام سنایا) پاکستان سے وصی شاہ اور آخر میں صاحب صدر جناب انور مسعود نے اپنے کلام سے محفل کو لالہ زار بنا دیا۔ اردو مرکز انٹرنیشنل کی حسب معمول کامیاب تقریب کے لیے سینکڑوں حاضرین نے پر جوش تالیوں سے خراج عقیدت پیش کیا۔

☆☆☆

''ڈاکٹر پروفیسر عبدالقادر فاروقی ومرحوم غیاث الدین ولد مولوی شریف الحسن فاروقی کا تعلق بیجاپور کے علمی ومذہبی خانوادے سے ہے۔ آپ نے بی۔ اے۔، بی۔ کام کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایم۔ اے اور پی۔ ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی کی حیثیت سے انجمن آرٹس سائنس اینڈ کامرس کالج بیجاپور میں طویل عرصے تک خدمات انجام دیں۔

کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ (انڈیا) میں شعبۂ فارسی اور اردو کے قابل پی۔ ایچ ڈی گائیڈ کے فرائض انجام دیے۔ تقریباً بیس سال قبل ریاست ہائے متحدہ امریکہ منتقل ہوئے اور نیویارک کو وطن ثانی بنالیا۔ اب وہاں کے ماحول کو زبان اردو کی خوشبو سے معطر کر رہے ہیں اور اس کی چاشنی گھول رہے ہیں۔

آپ کی نوک قلم سے تحریر مضامین ہندوستان کے نامور اخبارات میں شائع ہوا کرتے ہیں۔ امریکہ کے کئی اخبارات میں بھی آپ کی تخلیقات مسلسل شائع ہوتی ہیں جن میں ''اردو ٹائمز'' نیویارک قابل ذکر ہے۔

زیر نظر تصنیف، اردو میں اپنی نوعیت کی واحد تحریر ہے۔ یہ تحریر اردو زبان کے لیے گراں قدر تصور کی جائے گی۔ امید کہ قارئین اسے ضرور پسند فرمائیں گے اور مستفید ہوں گے۔''

امریکا میں مقیم اردو کی معتبر ادبی شخصیت

پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی

کی ''اعجاز'' (اسلامیات) ''گوہر ادب'' ''مضامین فارقی'' (مضامین)

''اور خون جلتا رہا'' (افسانے) اور ''امریکا میں انوار اردو ادب'' (تحقیق)

کے بعد نئی کتاب

(تاریخی وتنقیدی جائزہ)

شائع ہوگئی ہے

رابطہ

• Book Ware

#85, 1st Floor, Near Police Station, J.C. Nagar, Bangalore-06

• S.S. Syed Fattah

Beside Kali Masjid, J.M. Road, Bijapur-586104

• Sakafia Educational Trust

C/o S.S. Mukbil Sadaat, Sakaf Roza, Bijapur-586101

• Prof. Abdul Qadir Farooqui

86-35, Queens Blvd. Apt. #4F, Elmhurst, N.Y.-11373-440 U.S.A.

REGISTERED WITH R.N.I. No. UPURD/04426/24/1/2010-TC

Tahreek -e- Adab

Urdu Quarterly

Issue (8)

VOLUME : 2
October - 2010
To
December - 2010

"URDU ASHIANA"
167, Afaq Khan ka Ahata, Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 U.P. INDIA

پروین شیر کو لاس انجیلس (یو.ایس.اے.) اردو مرکز انٹرنیشنل کی جانب سے ۲۰۱۰ء کا احمد ادایا اردو انٹرنیشنل ایوارڈ

پروین شیر (کناڈا) ایوارڈ لیتے ہوئے

ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا (روس)
ایوارڈ لیتے ہوئے

اردو مرکز انٹرنیشنل کی بانی مسز نیر جہاں
حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے